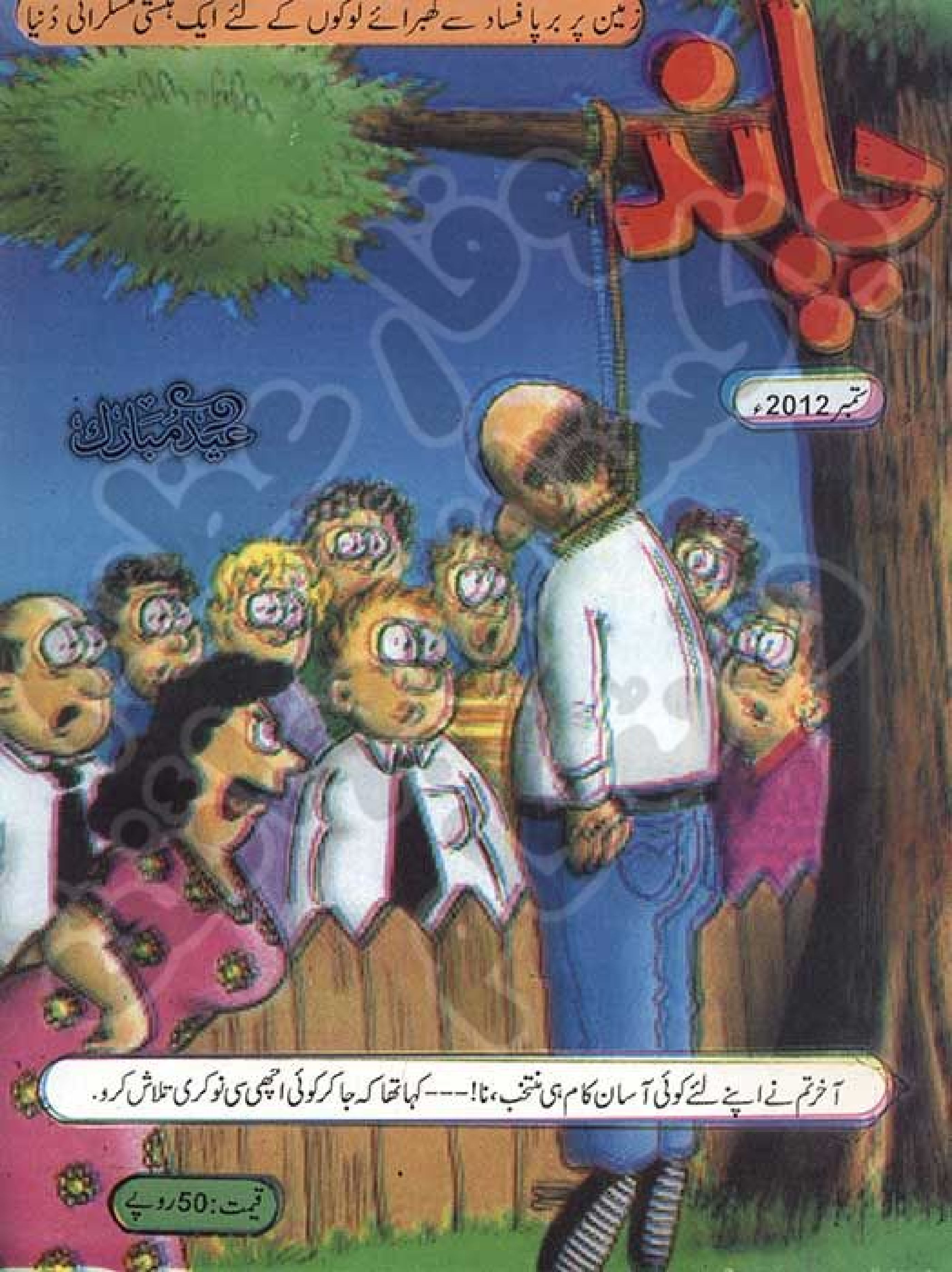

زمین پر برپا فساد سے گھبرائے لوگوں کے لئے ایک ہنستی مسکراتی دنیا
ستمبر 2012ء
عید مبارک
آخر تم نے اپنے لئے کوئی آسان کام ہی منتخب، نا! --- کہا تھا کہ جا کر کوئی اچھی سی نوکری تلاش کرو.
قیمت: 50روپے

بانی وحشی مارہروی

مہینہ بھر کے قہقہوں اور مسکراہٹوں کا راشن

تیس روزہ

چاند

لاہور

جلد نمبر: 65 شمارہ نمبر: 04

رجسٹرڈ نمبر LRL-89

مغز مار خصوصی

ناکتخدائے اعظم، صدر الہام کنوارا کلب، انجمن ریش درازانِ پاکستان، دشمن عقل و عریانی، تاریک العورات، رقیب زن مریدگان و مجروح فیشن زدہ دوشیزگان

ابوالمزاح ہستی خوامخواہ

پیر جنگلی علیہ ما علیہ (افریقہ پلٹ)

مدیر اعلیٰ **خالد بن حامد**

مدیران **صباحت** **زیاد خالد**

ناظم طباعت ○ رانا نذیر احمد ● کمپوزنگ ○ سیف اللہ

کاغذی گھوڑے دوڑانے کا پتہ

"چاند" F-31 شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور

یہ وہاں ہے

کارٹون	ادارہ	5
ہنس بیتیاں	مستقل عنوان	9
پریکٹیکل ٹاک	زاہد حسین زاہد	11
نگاہ انتخاب	سعید خان	13
گنج ایک اچھی چیز ہے	خادم حسین مجاہد	15
یونہی اک بات کہتا ہوں	اکبر بخاری	17
شمالی علاقہ جات	مسٹر پاگل لاہوری	18
ذکر لال میاں کا	شاہد اطہر	19
بندھن سینٹر	اعتبار ساجد	31
دل دریا	سید ابرار بخاری	41
موٹروے اور ہم	ظفر ندیم وہرہ	49
کمال کی چیز	منظور احمد اعوان	61
واہ بھئی، واہ	بابو جان	71
اس طرح تو ہوتا ہے	عبدالقیوم اسد	79
پیار کا اٹوٹ رشتہ	طاہر جاوید مغل	86
مظلوم خاص	مسٹر ڈبکلاں	91
طلاق میلہ	نعیم نیازی	97

چاند نگر

مظلوم لڑکی	امجد علی آرزو	99
اخباری رولا	شمع وقاص	100
ہڈ بیتی	ایس۔ ایف گل	102
یہ کالج	الٹیمیٹ واریئر	103
تجربے	سفارشی	104
خبر	نسیم احمد صدیقی	105
گک	مس بجلی	105
کتابوں پر تبصرہ	عارف کامران تنولی	106
ماڑے میاں	نویدہ ناز	108
بچگانہ نماز	سید شعبان گیلانی	109

☆ ☆

ٹکریں	ماہر ٹکریات	111
سندیسے	رقعہ باز	113

نعیم نیازی، روح اللہ روح، سید فہیم الدین، اکبر بخاری، جاوید پنجابی، مسٹر ڈبکلاں، حکیم خان حکیم، انعام فیض انعامی، کے۔ ایچ مجاہد اور پروفیسر ظریف خان کے خوش رنگ کلام کے علاوہ قہقہہ بارکٹ پیس، کارٹون اور دیگر مسکراہٹیں صفحہ بہ صفحہ!

برائے رابطہ: 0312/0333-4284875

قیمت: 50 روپے

"اب کون باقی ہے، آجائے وہ بھی مقابلے پر---!"

"سرجی! پریشان کیوں ہورہے ہیں؟---وزیراعظم کے مرتبے کی موجیں مارنے کے بعد قربان ہونے کے لئے تو یہاں پوری قوم تیار ہوجائے گی، بس حکومت میں رہنا شرط ہے---"

''میری پیدائش پر میری والدہ نے دائی کو پچاس روپے دے کر رخصت کیا تھا، میڈم! میرے بیٹے کی پیدائش پر ہسپتال والوں نے ڈیڑھ لاکھ کا بل تھما دیا ہے---کیا سارے شہر کی دائیوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں؟''

''مبارک ہو، بیگم! تمہاری والدہ اپنے بیٹے کی طرح لاڈلے سپوت اور اس کی فیملی کے ساتھ تشریف لائی ہیں---''

جیل کے گارڈ موسیقی سے محظوظ ہوتے رہے اور---!

جیل کی کرکٹ---مستعد وکٹ کیپر بھی موجود!

"صاحب! کرنے کو کوئی کام نہیں ہے تو آپ پریشان کیوں ہو رہے ہیں، جب آپ پرائم منسٹر تھے تب آپ کون سا اپنی مرضی سے کوئی کام کرتے تھے---؟"

انجام ایک جل پری سے عشق اور شادی کا---!

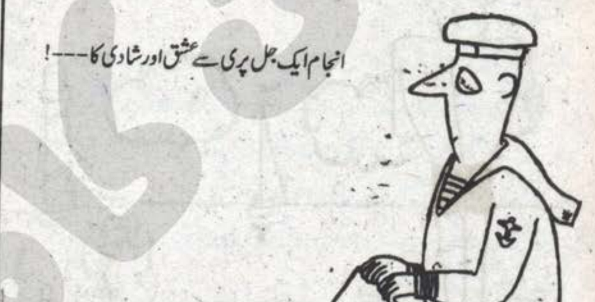

"میں مہذب طریقے سے ڈاکہ مارنا چاہتا ہوں، میڈم! اسی لئے رقم کی وصولی کے لئے درخواست لکھی ہے۔ انکار کر کے مجھے پستول نکالنے پر مجبور نہ کرو، سمجھیں---!"

جہاز کی غرقابی کے بعد خشکی کے جزیرے پر

''سمجھاؤ اس بیوقوف کو، واپس اپنے گھر پاکستان جانے کی کوشش میں پاگل ہوا جارہا ہے حالانکہ یہاں ہم اس سے زیادہ پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔''

''یہ اپن کا سٹائل ہے، جیل سپرنٹنڈنٹ صاحب! اپن جیل میں ایسی ہی پوشاک استعمال کرتا ہے---سمجھا---!''

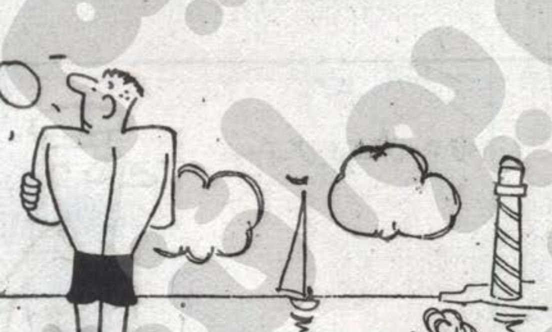

''اے مسٹر لائف گارڈ! ضروری نہیں کوئی سمندر میں ہی ڈوبے تو تم اسے بچانے دوڑو گے۔ کوئی یہاں کنارے پر بھی تمہاری محبت کے سمندر میں ڈوب رہا ہے---''

کبھی کوئی مکالمہ، کسی کی معصومیت یا بدحواسی پر بے ساختہ قہقہے وارد ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی واقعہ پر بے تحاشہ ہنسی آئی ہو تو ایک کاغذ پر ہمیں لکھ بھیجئے۔ ہم اِن صفحات پر اسے آپ کے نام سے جگہ دیں گے اور چاہیں گے کہ آپ کے ساتھ اور لوگ بھی اِس واقعہ سے لطف اُٹھا سکیں، ہنس سکیں۔ کسی لطیفے کو توڑ مروڑ کر واقعہ بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔ واقعہ کاپی سائز کے دو صفحات سے زیادہ نہ ہو، اخلاق سوز نہ ہو۔ سب سے زیادہ قہقہہ آور واقعہ پر سال بھر کے لئے چاند مفت بطور انعام دیا جائے گا۔ واقعہ اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

ہنس بیتیاں

انچارج "ہنس بیتیاں" تمیس روزہ "چاند" F-31 ، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور 54600

ظالم کال

سیّد شعبان گیلانی، راول پنڈی

مَیں حسبِ معمول نمازِ عصر کی ادائیگی کے لیے مسجد میں گیا۔ نماز کا وقت ہوا۔ تکبیر پڑھی گئی اور امام صاحب نے "اللہ اکبر" کہہ کر جماعت شروع کر دی۔ پہلی رکعت معمول کے مطابق ادا کی گئی۔ دوسری رکعت میں جوں ہی کھڑے ہوئے، میرے ساتھ کھڑے نوجوان کا موبائل بج اُٹھا۔

"کتنے ارماں جاگے تیرے واسطے---"

نوجوان نے گھبراتے ہوئے پینٹ کی جیب میں موجود موبائل پر اُنگلیاں ماریں۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد ایک زنانہ آواز آئی۔

"ہیلو جان! کیسے ہو؟ آج شام گارڈن میں آنا اور ہاں---"

نوجوان مسلسل جیب پہ اُنگلیاں ٹٹول رہا تھا اور اِسی لمحے بالآخر کال کٹنے والا بٹن اس سے دب ہی گیا جب آواز آ رہی تھی۔

"سو والا کارڈ بھی---"

نہ پوچھئے، اس دوران مجھ سمیت اکثر کمزور ایمان والوں کا مارے ہنسی کے کیا حال ہوا۔ اوپر سے کھل کے ہنس بھی نہ سکتے تھے لہٰذا "کھس کھس" کی بے شمار آوازیں سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری سمجھوں گا کہ دراصل جب کال آئی تو اِس نوجوان سے ایک تو کال اٹینڈ کرنے والا بٹن پریس ہوگیا اور ستم یہ کہ لاؤڈ سپیکر کا بھی۔ یعنی ایک نہ شد دو شد۔

معصومیت

ظفر ندیم وہرہ، حیدر آباد

مَیں قصاب کے پاس کھڑا قیمہ بنوا رہا تھا کہ آٹھ دس کا ایک بچہ سائیکل پر وہاں آیا اور قصاب کو نوٹ پکڑاتے ہوئے بولا۔

"دادی اماں نے آدھا کلو گوشت منگوایا ہے۔"

قصاب نے حسبِ عادت ہیرا پھیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر سے ٹکڑے جمع کئے اور گوشت تول کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس پر بچہ بولا۔

"انکل! آپ نے آج اچھا گوشت نہیں دیا۔"

"نہیں، بیٹا! مَیں نے آپ کو بہترین گوشت دیا ہے۔ آپ کھاؤ گے تو مزہ آ جائے گا۔"

"آپ نے پرسوں مجھے جو گوشت دیا تھا، وہ بالکل خراب تھا۔ اِسے دیکھ کر دادی اماں نے مجھے ڈانٹ پلائی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ یہ آج کس کمینے قصاب سے گوشت لایا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تو سائیکل دوڑاتا ہوا چلا گیا مگر قصاب کی شکل قابلِ دید تھی۔

ایکسٹرا شوز

مسٹر پاگل لاہوری

احمق بابر کی بھاگ دوڑ آخر کام آئی اور موصوف 23 مئی کو رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ اُن کی دعوتِ ولیمہ کی تقریب ایک مقامی ہال میں کی گئی۔ دعوتِ ولیمہ کے اختتام پر جب سب لوگ دولہا اور دُلہن کو رُخصت کرنے لگے، مَیں بھی احمق صاحب کے بائیں سائیڈ پر اُن کے ساتھ چلنے لگا۔ ہمارے ساتھ ساتھ بابر کے گھر والے اور بھابی کے گھر والے سلو موشن میں گاڑی کی طرف بڑھنے لگے کہ مَیں نے شرارت سے اُونچی آواز میں بابر سے کہا۔

"ایک ایکسٹرا شوز کی جوڑی ساتھ میں لی ہے کیا؟"

"موصوف بڑے اِترا کر کہنے لگا کہ ایک نہیں، چار چار لئے ہیں۔ تو مَیں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"جناب! مَیں نے جوتا چھپائی کے لئے ایکسٹرا شوز کی بات کی ہے، اُن جوتوں کی نہیں جو بعد میں آپ کو مستقل پڑنے ہیں۔"

میرا کہنا تھا کہ سبھی عزیز کلوز اَپ کا اشتہار بنے لیکن میں احمق کی زوردار دھپ سے خود کو نہ بچا سکا۔

اِظہارِ خیال

جیوا بلوچ، ہل سٹیشن

یہ 13 جولائی کی ایک خوشگوار شام تھی ہم (مَیں اور میرا کزن) اپنے دوست خالق الرحمان جو کہ ڈیرہ اسماعیل خان کے ہیں، کے ساتھ

بیٹھے ہوئے تھے۔ ماحول بھی بڑا خوشگوار تھا اور سب رومانٹک موڈ میں تھے (داڑھی والے حضرات سے معذرت) اور اِدھر اُدھر کی مزاحیہ باتیں ہو رہی تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں عبدالخالق گویا ہوئے۔

"یار! آپ لڑکیوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

مَیں بولا۔ "لڑکیاں تو بالکل "لوکل بسوں" کی طرح ہوتیں ہیں۔ ایک چلا جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے، دوسرا جاتا ہے تو تیسرا آتا ہے۔ اِسی طرح ایک کے بعد ایک ---"

"اور لڑکوں کے بارے میں؟"

"ارے، وہ تو بالکل رکشے کی طرح ہیں۔ ایک مانگو تو چار چار آ جاتی ہیں۔"

یہ سننا تھا کہ ہم سب زور زور سے قہقہہ لگانے لگے۔

برجستگی ✿ محمد فاروق نوید، رحیم یار خان

پانچ جون کی شام کو مَیں اپنی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک میرا دوست محمد عارف مجھے ملنے آ گیا۔ کافی دیر ہم نے گپ شپ کی، پھر عارف کہنے لگا کہ چلو فاروق! آج پارک چلتے ہیں۔ مَیں نے گرمی کی وجہ سے بہانا بنایا کہ میری طبیعت خراب ہے لیکن وہ پھر بھی جانے پر اصرار کرتا رہا تو میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پہلے شفیق کے پاس چلتے ہیں، اگر اِس کی طرف سے پیسے مل گئے تو اِسی خوشی میں مَیں تمہارا ٹکٹ بھی لے دوں گا --- عارف یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ پھر ہم شفیق کے گھر گئے (واضح رہے کہ مَیں نے شفیق سے تین سو روپے لینے تھے اور شفیق ہمارے محلے کا ایسا آدمی ہے، جس کے مطلق مشہور ہے کہ وہ اُدھار کے پیسے واپس نہیں کرتا) بہرحال، نجانے کیسے اُس دِن شفیق نے کوئی بات کیے بغیر مجھے تین سو روپے دے دیئے۔ واپس آتے ہوئے عارف کہنے لگا۔

"یار! مجھے تو بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

مَیں نے پوچھا۔ "کس بات کی۔"

تو وہ بولا۔ "پارک جانے کی۔"

تب مَیں نے بھی برجستہ کہا۔ "چلو پھر اِسی خوشی میں آج کا خرچہ تمہارے ذمے۔"

یہ سنتے ہی عارف خاموش ہو گیا۔

آر یا پار ✿ احمد حسیب قیصر

میرے پاؤں میں سخت تکلیف تھی۔ میری چھوٹی بیٹی نے پوچھا۔

"ابو! پاؤں کی تکلیف ٹھیک ہو گئی؟"

مَیں نے کہا۔ "ٹھیک کیوں نہ ہوتی، تم نے دِل سے دُعا کی ہو گی۔"

اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں، ابو! مَیں نے اللہ میاں سے کہا کہ ابو کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی یا اللہ! اُنہیں آر کر یا پار کر۔"

مَیں بے اختیار مسکرا دیا اور کہا کہ چاند کا مزاح تمہاری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔

کمیٹی والے ✿ شاہد اطہر

پہلے تو لوگ اِس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ F-8 اسلام آباد میں طویل عرصہ قیام کے باوجود ہماری دوست سابقہ مالک مکان قمر انکل سے آج تک کیسے قائم ہے اور ہم عمر ہونے کے باوجود ہم اُنہیں انکل اور وہ ہمیں بھتیجے کے نام سے کیوں پکارتے ہیں۔ شاید اِسی رشتے کی وجہ سے وہ مزاحیہ بدتمیزیاں بھی کر جاتے ہیں اور ہم فقط مسکرا کر رہ جاتے ہیں --- ہم نے اُن کے منع کرنے کے باوجود برسات میں گول گپے کھا لیئے اور فوڈ پوائزن کروا بیٹھے۔ اب قمر انکل نے فون پر بے نقط سنانی شروع کر دیں۔ ہم نے عاجز آ کر کہا۔

"قمر انکل! آپ ہمارے پاس تشریف لائیں، پستول بھی ہم دیں گے، بس آپ ہمیں گولی مار دیں۔"

جھٹ سے بولے۔ "یہ میرا کام نہیں ہے۔ آپ پارک میں واک کرتے رہیں، کمیٹی والے خود ہی یہ کام کر دیں گے۔"

خیال رہے، کمیٹی والوں کا کام آوارہ کتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مارنا ہے۔

سینہ زوری ✿ شمس القمر عاکف، اٹک

پچھلے دِنوں مَیں ماموں جان کے ہاں تھا۔ ان کے گھر کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے امرود کے درختوں پر سے محلے کے دو بچے "اپنا حصہ" اُتار رہے تھے۔ ماموں کی نظر اِن پر پڑی تو باہر نکل کر اُنہیں خوب ڈانٹا مگر پھر یہ خیال کر کے کہ جاننے والوں کے بچے ہیں، اُنہیں نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

"دیکھو، بچو! امرود ابھی بہت کچے ہیں، کچے امرود کھاؤ گے تو بیمار پڑ جاؤ گے۔"

ماموں جان کو پگھلتا دیکھ کر اُن میں سے ایک بچہ معصومیت سے بولا۔

"مگر انکل! ہم تو صرف پکے امرود اُتار کر کھاتے ہیں۔"

چور کی اِس سینہ زوری پر ماموں جان کا پارہ چڑھا جبکہ مَیں دیر تک ہنستا رہا۔

☆☆

پریکٹیکل ٹاک

زاہد حسین زاہد

حامد تیر: پریکٹیکل ٹاک کے ساتھ حامد تیر آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ آج میں نے اپنے پروگرام میں ملکہ سکینڈل، ملکہ تنازعات کو مدعو کیا ہے۔ یقیناً آپ پہچان گئے ہوں گے۔ نہیں پہچانا، تو میں بتا دیتا ہوں۔ آج میری مہمان ہیں ڈرامہ ملکہ صاحبہ جو کوئی نہ کوئی ڈرامہ کرتی ہی رہتی ہیں۔ یہ تم نے نقاب کیوں کر رکھا ہے، کیا یہ کوئی نیا ڈرامہ ہے؟ نقاب اتارو تاکہ میں تمہارا انٹرویو شروع کروں، نقاب اتارو ملک سنوارو!

ڈرامہ ملک: حامد تیر صاحب! آپ کو پتہ ہے کہ میں کپڑے اتارنے کے پیسے لیتی ہوں۔ پہلے نوٹ دکھاؤ، میرا موڈ بنے۔

حامد تیر: میں تو کپڑے اتارنے کا نہیں، صرف نقاب اتارنے کا کہہ رہا ہوں۔ میں نے تم سے کوئی آئٹم سونگ نہیں کروانا، صرف تمہارا انٹرویو کرنا ہے--- ویسے تم برقعہ پہن کر کیوں آئی ہو؟

ڈرامہ ملک: جب سے میں نے انڈین میگزین کیلئے نیوڈ فوٹوسیشن کروایا ہے، ہر کوئی مجھے دیکھ کر سیٹی بجاتا ہے۔ الطاف حسین نے مجھے دیکھ کر ہی گانا گایا تھا کہ "برقعے میں رہنے دو برقعہ نہ اٹھاؤ" اسی لئے میں برقعہ نہیں اتارتی۔

حامد تیر: کہیں تم ایم کیو ایم تو جوائن نہیں کر رہی؟

ڈرامہ ملکہ: میں تو سونامی کی ووٹو ہوں۔ میں جب سیاست میں آؤں گی، تحریک انصاف جوائن کروں گی۔

حامد تیر: اچھا، اب نقاب تو اتار دو۔

ڈرامہ ملک: نقاب تو اتار دیتی ہوں، پہلے یہ بتایئے کہ مُنہ دکھائی میں آپ مجھے کیا دیں گے؟

حامد تیر: مُنہ دکھائی جس کو میں نے دینی تھی، دے دی۔ اب مجھے صرف انٹرویو دو۔ تم نے کہا ہے کہ جب تم سیاست میں آؤ گی تو تحریک انصاف کو جوائن کرو گی۔ عمران خان تو بڑا صاف شفاف بندہ ہے، وہ تمہیں اپنی پارٹی میں نہیں لے گا۔

ڈرامہ ملک: عمران خان صاف شفاف بندہ ہے تو میں نے کون سا "ڈرٹی پکچر" میں کام کیا ہے۔ میں بھی صاف شفاف بندی ہوں۔ میں نے تو اپنے خفیہ اثاثے بھی ڈیکلیئر کر دیئے ہیں، اب عمران خان مجھے اپنی پارٹی میں بھلا کیوں نہ لے گا؟

حامد تیر: میں نے نگار میں پڑھا ہے کہ وینا ملک بھارتی فلموں میں سب سے کم معاوضہ لینے والی اداکارہ بن گئی اور تم نے صرف ایک لاکھ میں فلم سائن کی۔

ڈرامہ ملک: بھارتی روپے کی قیمت پاکستانی روپے سے زیادہ ہے۔ میں نے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔

حامد تیر: پیسے کے لئے تم کچھ بھی کر سکتی ہو؟

ڈرامہ ملک: آپ فلم بنائیں، میں آپ کی فلم میں مفت کام کروں گی بشرطیکہ فلم کے ہیرو آپ ہوں۔

حامد تیر: میری اب ہیرو آنے والی عمر نہیں رہی، مجھے تم معاف ہی رکھو۔

ڈرامہ ملک: یہ جو عامر خان، شاہ رُخ خان اور سلمان خان ہیں، تینوں ہی پچاس سال کے ہونے والے ہیں لیکن ابھی تک ہیرو آ رہے ہیں تو آپ ان سے کوئی کم ہیں؟

حامد تیر: تم مجھے کس کام پر لگا رہی ہو؟ میں صحافی ہوں، مجھے صحافی ہی رہنے دو۔ پاکستان میں اب فلمیں بن کہاں رہی ہیں؟

ڈرامہ ملک: شعیب منصور نے دو بڑی اچھی فلمیں بنائی ہیں۔ "بول اور خدا کے لئے"۔

حامد تیر: شعیب منصور کون سا فلمی بندہ ہے؟ وہ تو آج تک فلم اسٹوڈیو نہیں گیا۔ سنگیتا پرویز، رانا مسعود بٹ اگر "بول خدا کیلئے" جیسی فلمیں بنائیں تو میں مانوں۔ سید نور البتہ کچھ بہتر کام کر رہا ہے۔ حسن عسکری بھی ٹھیک ہے۔ شرمین عبید نے ڈاکومنٹری فلم پر آسکر ایوارڈ جیت کر پاکستان کا نام روشن کیا ہے۔

ڈرامہ ملک: پاکستان کا نام تو میں نے بھی بڑا روشن کیا ہے۔ لوڈشیڈنگ کیوجہ سے کسی کو میری روشنی نظر نہیں آئی۔

حامد تیر: تم نے پاکستان کا نام روشن نہیں، بدنام کیا ہے۔ پاکستان کا نام تو شرمین عبید نے آسکر جیت کر روشن کیا ہے۔

ڈرامہ ملک: آسکر میں بھی جیت سکتی تھی مگر مجھے بیرک شاہ اور محمد آصف نے بڑی ٹینشن دی۔ محمد آصف کو تو میں نے کہا تھا کہ میرے دل میں رہو پر اُس نے میری بات نہیں مانی اور اب جیل میں رہ رہا ہے۔ مجھ سے شادی فکسنگ نہیں کی، اسپاٹ فکسنگ کر لی۔ اب سڑ جیل میں۔

حامد تیر: ریما نے شادی کر لی، تم شادی کب کر رہی ہو؟

ڈرامہ ملک: اشمیت پٹیل کے مسلمان ہونے کا انتظار کر رہی ہوں۔

حامد تیر: سنا ہے، بگ باس میں تم اشمیت پٹیل کو مالش کے علاوہ نمازیں بھی پڑھاتی رہی ہو؟

ڈارمہ ملک: میں اُسے نمازیں پڑھاتی رہی، وہ اُسے یوگا سمجھتا رہا۔

حامد تیر: یہ نہ ہو کہ تمہاری اُس سے شادی طے ہو جائے اور نکاح والے دن وہ کلمہ پڑھنے کی بجائے آگ کے گرد پھیرے لگانے کی ضد کرے؟

ڈرامہ ملک: اگر اُس نے آگ کے گرد پھیرے لگانے کی ضد کی تو میں نے اُس کو آگ میں ہی دھکا دے دینا ہے۔

حامد تیر: علی ظفر بھی انڈیا میں کام کر رہا ہے مگر تم میں اور علی ظفر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ڈرامہ ملک: وہ کیسے؟

حامد تیر: علی ظفر نے انڈیا میں "تیرے بن لادن، میرے برادر کی دلہن، لندن پیرس نیویارک" جیسی بڑی فلموں میں کام کیا ہے۔

ڈرامہ ملک: میں نے انڈیا میں کیا، امرتسر، جالندھر، بھٹنڈا میں کام کیا ہے۔

حامد تیر: تم نے انڈیا میں صرف فلم "گلی گلی میں شور ہے" میں صرف آئٹم سانگ کیا ہے۔

ڈرامہ ملک: آئٹم سانگ تو وہاں کترینہ کیف، ملائکہ آروڑہ بھی کرتی ہیں۔ میں نے آئٹم سانگ کر لیا تو کون سی قیامت آ گئی؟ میرا آئٹم سانگ "شیلا کی جوانی" اور "منی بدنام" ہوئی سے زیادہ مقبول ہوا ہے۔

حامد تیر: تمہارا آئٹم سانگ "مُنی بدنام ہوئی" سے زیادہ مقبول تو نہیں ہوا مگر تم پاکستان میں مُنی سے زیادہ بدنام ضرور ہو گئی ہو۔

ڈرامہ ملک: حامد تیر صاحب! میں تو سمجھی تھی کہ آپ صرف سیاستدانوں پر ہی گہری نظر رکھتے ہیں، آپ کی نظر تو شوبز پر بھی بڑی گہری ہے؟---مجھ پر تو آپ کی بڑی گہری نظر ہے۔

حامد تیر: تمہاری حرکتیں ہی ایسی ہیں کہ جس دن تمہارا کوئی سکینڈل نہیں بنتا، تمہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ تمہاری اسی شہرت سے متاثر ہو کر سہیل وڑائچ صاحب نے تمہارے ساتھ پروگرام نہیں کرنا۔ اُنہوں نے تو مجھ سے پہلا سوال ہی یہ کرنا ہے کہ تم انڈیا میں کپڑے اتار رہی ہو اور پاکستان میں نقاب پہن رہی ہو، کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟ تمہارے ساتھ جو سہیل صاحب پروگرام کریں، اُس کا نام ہوگا''ایک رات اشمیت پٹیل کے ساتھ---!''

ڈرامہ ملک: حامد تیر صاحب یہ تو آپ نے مجھے تیر مارا ہے۔ اشمیت پٹیل بڑا اچھا لڑکا ہے، مجھ سے فون پر گانے سنتا ہے۔ وہ مجھے SMS کرتا ہے کہ چھت پر چلی جاؤ۔ میں ماں سے چھپ کر چلی جاتی ہوں۔ پھر وہ مجھے کال کرتا ہے اور مجھ سے گانے سنتا ہے۔

حامد تیر: مجھے بھی کوئی گانا سنا دو۔

ڈرامہ ملک: ہم تم اک پروگرام میں بیٹھے ہوں اور بجلی چلی جائے۔

حامد تیر: تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ ہم نے جنریٹر کا بندوبست کر رکھا ہے---تمہارا پسندیدہ ہیرو کون ہے؟

ڈرامہ ملک: عمران ہاشمی---!

حامد تیر: وہ کیوں---؟

ڈرامہ ملک: حامد تیر صاحب! لگتا ہے، آپ کیبل پر صرف پوگو اور کارٹون نیٹ ورک ہی دیکھتے ہیں؟ آج کل کے تو بچے بھی آپ سے تیز ہیں۔

حامد تیر: میں صرف جیو نیوز یا دُنیا نیوز ہی دیکھتا ہوں۔

ڈرامہ ملک: دُنیا تو میں نے بھی بڑی دیکھی ہے بلکہ دُنیا کو اپنا آپ بڑا دکھایا ہے۔

حامد تیر: میں دُنیا نیوز ٹی وی چینل کی بات کر رہا ہوں، تم پتہ نہیں کیا سمجھ رہی ہو---پاکستانی کون سا ہیرو تم کو پسند ہے؟

ڈرامہ ملک: وحید مراد مجھے بڑا پسند ہے۔ کاش، میں اُس دور میں ہوتی اور فلم ''ارمان'' میں وحید مراد کے ساتھ کام کرتی اور وحید مراد مجھے دیکھ کر یہ گانا گاتا'' میرے خیالوں پے چھائی ہے اک صورت متوالی سی، رہتی ہے وہ دور کہیں لئے پتہ معلوم نہیں، کوکو وینا کوکو وینا---!''

حامد تیر: کوکو وینا نہیں کوکو رینا۔

ڈرامہ ملک: اگر ارمان میں میں ہوتی تو وحید مراد کوکو رینا کی بجائے کوکو وینا ہی کہتا۔ رینا رائے تو ہندوستان میں تھی۔

حامد تیر: محمد علی صاحب تم کو دیکھ کر یہ گانا گاتے'' سو برس کی زندگی میں ایک پل تو کوئی کر لے اچھا عمل''---ندیم تم کو دیکھ کر یہ گانا گاتا'' تیرے ننگے بدن کی خوشبو سے ملکہ شراوت بھی ہوئی شرمندہ سی''---غلام محی الدین تمہیں دیکھ کر یہ گانا گاتا'' تجھے پیار کرتے کرتے میرا بنک بیلنس ختم ہو جائے''---شاہد تمہیں دیکھ کر یہ گانا گاتا'' وینا قلعی کرا لو پرانی نویں بنا لو آ گیا شیدا قلعی گر''---معمر رانا تمہیں دیکھ کر یہ گانا گاتا'' کر ان میں نظارہ جدوں وینا دی تصویر دا، پسند اے ایں پلیکھا مینوں مندا کنی دا تے زینت امان دا''---مندا کنی کی'' رام تیری گنگا میلی'' اور زینت کی فلم'' ستوم شیوم سندرم'' تم نے دیکھی ہیں تو تمہیں معمر رانا کا گانا سمجھ آ جائے گا۔

ڈرامہ ملک: میں نے یہ دونوں فلمیں دیکھی ہیں۔ مندا کنی اور زینت امان عریاں ہو کر'' فن'' کی خدمت گزار بن گئیں۔ اگر میں نے ایک میگزین کیلئے نیوڈ فوٹو سیشن کروا لیا تو مجھے فحاشی کے طعنے مل رہے ہیں؟

حامد تیر: اگر انڈین اداکار تمہاری تصاویر دیکھ لیں تو وہ بھی گانا گانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ راجیش کھنہ تمہاری نیو تصویر ہاتھ میں پکڑ کر یہ گانا گائے گا'' یہ کیا ہوا، کیسے ہوا، کب ہوا، کیوں ہوا''---دیو آنند تمہاری تصویر دیکھ کر یہ گانا گائے گا'' دم مارو دم، کپڑے پہنو کم''---دلیپ کمار یہ گانا گائے گا'' سارے برصغیر آپ سا کوئی نہیں''---منوج کمار یہ گانا گائے گا'' وینا رے وینا، تیرا رنگ کیسا''---راج کپور یہ گانا گائے گا'' دُنیا بنانے والے کیا تیرے من میں سمائی، کاہے کو دنیا بنائی''---امیتابھ بچن یہ گانا گائے گا'' کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے، جیسے تم کو بنایا گیا ہے سکینڈل کیلئے''---سلمان خان یہ گانا گائے گا'' تیری مست مست دو تصاویر، میرے دل کو گئیں چیر''---شاہ رُخ تیری تصویر دیکھ کر یہ گانا گائے گا'' کیا کروں ہائے، کچھ کچھ ہوتا ہے۔''

ڈرامہ ملک: کوئی ایسا گانا بھی ہے جو مجھے دیکھ کر نہ گایا جا سکے؟

حامد تیر: ہاں، ہے۔'' چولی کے پیچھے کیا ہے''---تمہاری نیوڈ تصویر دیکھ کر بھی اگر کوئی یہ گانا گائے تو وہ بیوقوف ہی ہوگا۔

ڈرامہ ملک: اب میں کبھی بھی آپ پروگرام میں نہیں آؤں گی، بہت ہو گئی میرے ساتھ۔

حامد تیر: آفت اقبال کے پروگرام'' خبرناک'' میں جاؤ گی؟

ڈرامہ ملک:'' خبرناک'' میں تو امان اللہ، سخاوت ناز اور ببی البیلا نے مجھے جگتیں لگا لگا کر ہی مار دینا ہے۔

حامد تیر: مبشر چٹان کے پروگرام'' کھری بات'' میں جاؤ گی؟

ڈرامہ ملک: مبشر چٹان تو فلمی بندہ ہے۔ اُس نے ایک فلم بنائی تھی'' پہلا پہلا پیار'' جو فلم انڈسٹری کے ساتھ اُس کا آخری پیار ثابت ہوئی۔ اُس نے تو مجھے کھری کھری سنا دینی ہے۔ نہ، بابا! میں نہیں جاتی اُس کے پروگرام میں۔

حامد تیر: کاشف اداسی کے پروگرام'' آف دی ریکارڈ'' میں جاؤ گی؟

ڈرامہ ملک: میرا تو کچھ بھی'' آف دی ریکارڈ نہیں'' سب آن دی ریکارڈ ہے اس لئے وہاں بھی نہیں جا سکتی۔

حامد تیر: کامران شاہد کے پروگرام'' فرنٹ لائن'' میں جاؤ گی؟

ڈرامہ ملک: اُس کے پروگرام میں میں ایک دفعہ گئی تھی۔ اُس نے تو میرے آنسو نکلوا دیئے تھے۔

حامد تیر: اب سیدھا یہاں سے گھر جانا کیونکہ'' عالم آن لائن'' میں تو میں تمہیں بھیج نہیں سکتا۔

ناظرین! میرے پروگرام کا وقت ختم ہوا۔ مجھے اجازت دیجئے، خدا حافظ---!

☆☆

خوبصورتی اور عقلمندی ایک جگہ نہیں ٹک سکتیں اسی لئے خوبصورت لڑکیاں بے وقوف اور بدصورت---! پرنس کشمیری

کچھ ہوتے ہی سانولے اور سلونے سے
کچھ تلے کی تاروں جیسے ہوتے ہیں
کچھ لڑکے ہوتے ہیں مولا جٹ جیسے
کچھ لڑکے غیاروں جیسے ہوتے ہیں

O

کچھ کڑیاں ہوتی ہیں گائیں بھینسوں سی
کچھ چنچل سی ہرنی جیسی ہوتی ہیں
کچھ ہوتی ہیں کوئل سی اور مینا سی
کچھ دو مونہی سپنی جیسی ہوتی ہیں

O

کچھ خوش پوش بھی ہوتے ہیں، خوش فطرت بھی
کچھ شاعر بدحالوں جیسے ہوتے ہیں
کچھ ہوتے ہیں خوش انداز خوش آواز
کچھ شاعر قوالوں جیسے ہوتے ہیں

O

کچھ کاریں ہوتی ہیں ایف سولہ جیسی
کچھ ستی کے ماروں جیسی ہوتی ہیں
کچھ ہوتی ہیں کارآمد انسانوں سی
کچھ کاریں بے کاروں جیسی ہوتی ہیں

O

کچھ ساتھی ہوتے ہیں کام آنے والے
اور کچھ نانجاروں جیسے ہوتے ہیں
کچھ ہوتے ہیں پروں اور مشینوں سے
کچھ ساتھی اوزاروں جیسے ہوتے ہیں

O

کچھ سڑکیں ہوتی ہیں گلشن کی صورت
اور کچھ سبزی منڈی جیسی ہوتی ہیں
کچھ ہوتی ہیں رن وے جیسی کھلی کھلی
کچھ سڑکیں پگڈنڈی جیسی ہوتی ہیں

O

ٹی وی کے کچھ چینل ہوتے ہیں بے رنگ
کچھ رنگوں سے بھرے کنستر ہوتے ہیں
کچھ ہوتے ہیں تقریباً بیوی جیسے
کچھ چینل بیوی سے بہتر ہوتے ہیں

O

کچھ افسر ہوتے ہیں کرسی کے چپکو
کچھ افسر ہر کاروں جیسے ہوتے ہیں
کچھ افسر ہوتے ہیں میٹھی گولی سے
کچھ افسر بمباروں جیسے ہوتے ہیں

O

کچھ ہوتے ہیں صدر کراچی کی صورت
کچھ ٹاور ، کچھ گلشن جیسے ہوتے ہیں
کچھ محبوب تو ہوتے ہیں کیماڑی سے
کچھ محبوب کلفٹن جیسے ہوتے ہیں

O

کچھ ہوتے ہیں اچھرہ سے یا سانده سے
کچھ اُن میں چوبرجی جیسے ہوتے ہیں
کچھ ہوتے ہیں راوی چھاؤنی جلو سے
کچھ محبوب لوہاری جیسے ہوتے ہیں

O

کچھ کھیلیں تفریحی ہوتی ہیں
کچھ کھیلیں بے زاری جیسی ہوتی ہیں
کچھ کھیلوں سے جسم کو ملتی ہے طاقت
کچھ کھیلیں بیماری جیسی ہوتی ہیں ،راشد

ازسرِ راہے

O ماتحت عدالتوں کے اہلکاروں نے کرپشن کے خاتمہ کے لئے قرآن پاک پر حلف دینے کی پیشکش کرتے ہوئے جوڈیشل الاؤنس کی منظوری کا مطالبہ کردیا۔

O ایک خوشحال سکھ مجرا دیکھنے جا رہا تھا کہ راستے میں ایک گندی جگہ پر گرا بیر اُٹھا کر کھالیا۔ جب وہ کوٹھے پر پہنچا تو طوائف ناچتے ہوئے گا رہی تھی۔ ''دل کی بات بتا دونگی'' ---سردار جی ڈر گئے کہ شاید اس نے مجھے گندی جگہ کے بیر اُٹھاتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اسے خوش کرنے کے لئے اُنہوں نے تمام نوٹ اس پر وار دیئے۔ جب جیب خالی ہوگئی تو سردار جی جھنجھلا کر بولے۔

''جا، جا کے دس دے لوکاں نو، گندی تھاں تو بیر ای چک کے کھادا ای ناں---''

رشوت خوروں نے بھی سردار جی کی طرح بلیک میل ہونے کے بعد بالآخر اقرار کر ہی لیا ہے کہ انہوں نے گند کھایا ہے۔ اب ان کے مطالبات پر حکومت کو ہمدردانہ غور و فکر کرنا چاہئے۔

پرابلم ہی پرابلم

مالٹا چھلیا تو لون کوئی نہیں
گھر بیٹھیاں سکون کوئی نہیں
بھرجائی نوں آکھیا کپڑے دھو دے
جواب ملیا ، صابون کوئی نہیں
لیمو کٹیا تے رس کوئی نہیں
اڈے تے گیا تے بس کوئی نہیں
دل لایا ۔ دل تے وس کوئی نہیں

حکم

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اور اُس کی شاعرہ بیٹی

زیب النساء مخفی ایک باغ میں بیٹھے استراحت فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک خوش الحان پرندے نے چہچہانا شروع کر دیا۔ جب اورنگ زیب کے آرام میں مسلسل خلل پڑا تو اس نے تیر انداز کو بلا بھیجا کہ آئے اور آ کر پرندے کو مار گرائے۔ یہ حکم سن کر بادشاہ کی شاعرہ بیٹی نے فی البدیہہ کہا۔۔۔

اے بلبل آشفتہ! آواز در گلو بند
نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد

("اے خوش الحان اور بے چین پرندے! اپنی خوبصورت آواز کو اپنے گلے میں ہی گھونٹ لے۔ تجھے خبر نہیں کہ بادشاہوں کے مزاج بہت نازک ہوتے ہیں اور ان میں سننے کی تاب نہیں ہوا کرتی)

اورنگ زیب نے بیٹی کی اس برجستہ شعر کی کاٹ سے شرمندہ ہو کر اپنا حکم واپس لے لیا۔

معاہدہ

ایک اداکار نے اپنے بیٹے سے اس کی پراگریس رپورٹ لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! مجھے یقین ہے کہ تم نے امتحان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہوں گی۔"

بیٹے نے جواب دیا۔ "جی ہاں، پاپا! بالکل سکول والوں نے مجھے مزید ایک سال کے لئے سائن کر لیا ہے۔"

وجہ

ایک مسخرے نے دوسرے سے پوچھا۔ "کیا وجہ ہے کہ بھینس اور بکری کے "بول و براز" میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ سائز میں بھی اور شکل میں بھی؟"

دوسرا فوراً بولا۔ "بکری کے جالی لگی ہوتی جبکہ بھینس کے جالی نہیں لگی ہوتی۔"

افسردگی

میرا ایک دوست بڑا افسردہ تھا کہ چور اس کے گھر سے سب کچھ لے گئے لیکن کم بختوں کو اُس کا بستہ نظر نہ آیا۔

مشورہ

ایک ڈاکٹر نے غریب مریض کو دوا کے ساتھ مرغی کا شوربہ لینے کا مشورہ دیا اور اسی دن اس ڈاکٹر کی مرغی غائب ہوگئی۔

ایک غزل (انور شعور)

دن کے دوران ، رات کے دوران
خوب گزری حیات کے دوران
زندہ رہنا پڑا کسی صورت
دل شکن حادثات کے دوران
ہمیں اپنی خبر نہیں ہوتی
آپ کے التفات کے دوران
منہ سے بے ساختہ نکلتی ہے
ہر دُعا خواہشات کے دوران
دل چھینا کس طرح نہیں معلوم
کیا ہوا واردات کے دوران
نام ہم نے سنے گناہوں کے
درس اخلاقیات کے دوران
تم میں شائستگی نہیں ہے شعور
ٹوک دیتے ہو بات کے دوران

O

دیوانگی

شہر کا شہر بھی آئے اگر سمجھانے
اس سے کیا فرق پڑے گا تیرے دیوانے کو

O

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

تہمت

فقیہہ شہر نے تہمت لگائی ساغر پر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے

سحر خیزی

صبح کو جب بے کل چڑیوں نے شور مچایا
ہمیں بھی خوامخواہ میں آن جگایا
نیند کی چادر کو چھوڑو
اُٹھو، جاگو، دوڑو
شام کو بھی جب چڑیاں سوئیں پر پھیلا کر
ہمیں لٹا کر، رات کو محوِ خواب کیا
اس دُنیا میں سب سے پہلے
جس نے بھی سحر بیداری کی سوچی
جو بھی تھا وہ، جو کچھ بھی تھا وہ
اس ظالم نے ہم کو بخت خراب کیا!

دُعا

ایک لڑکی نماز کے بعد دُعا مانگ کر اُٹھی تو ماں نے پوچھا۔

"دُعا میں کیا مانگا؟"

بیٹی نے کہا۔ "اپنے لئے کچھ نہیں مانگا، امی! بس آپ کے لئے بہت اچھے داماد کی دُعا کی ہے۔"

تبسم کی روشنی

اختیار ترنم سے تبسم کی روشنی جلا دینا
جب اس کا مطلب سمجھ آ جائے تو مجھے بھی بتا دینا

انتباہ

ایک شخص بھاگتا ہوا بس کی سیڑھیاں چڑھا اور زور سے چلایا۔

"کوئی بندہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے کیونکہ لطیف قلفیوں والا خود چل کر آپ کے پاس آئے گا۔"

پیشکش

سردار: کل میں واش روم گیا تو وہاں شیر بیٹھا تھا۔

سردارنی: ہائیو، ربا! فیر تسی کی کیتا؟

سردار: کچھ نہیں۔ میں نے شیر سے کہا کہ اوئے پاپے! تو کر لے، میری تو نکل ہی گئی ہے۔

تجویز

ایک خاتون نے پولیس کانسٹیبل سے کہا۔

"میرے شوہر گھر سے آلو لینے نکلے تھے۔ ابھی تک نہیں آئے، میں کیا کروں؟"

کانسٹیبل: تو، بی بی! آپ کوئی سبزی پکا لیں۔

چکر پہ چکر

باپ: میں تمہاری شادی اپنی مرضی سے کروں گا۔

بیٹا: نہیں، پاپا!

باپ: یہ لڑکی راک فیلر کی بیٹی ہے۔

بیٹا: پھر ٹھیک ہے۔

باپ راک فیلر کے پاس گیا۔

باپ: میں تمہاری بیٹی کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں۔

راک فیلر: نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔

باپ: میرا بیٹا ورلڈ بنک کا ای۔ سی او ہے۔

راک فیلر: پھر ٹھیک ہے۔

باپ ورلڈ بنک کے President کے پاس گیا۔

باپ: میرے بیٹے کو بنک کا CEO بنا دو۔

پریذیڈنٹ: نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔

باپ: میرا بیٹا راک فیلر کا داماد ہے۔

پریذیڈنٹ: پھر ٹھیک ہے۔

☆☆

گنج ایک اچھی چیز ہے

خادم حسین مجاہد

(گنج برداروں سے معذرت کے ساتھ)
سر پر بال نامی مخلوق کی غیر موجودگی کو گنج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گنج کے فارسی میں معنی "خزانہ" کے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر گنجے دولت مند ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ پہلی فرصت میں نائی کو شرف ملاقات بخشیں اور سر کو "ایئر کنڈیشنڈ" کرا کے دولت کا انتظار شروع کر دیں کیونکہ اس سے اولے پڑنے کا امکان تو ہو سکتا ہے، دولت کا نہیں۔ دولت و کامیابی کے حصول کے لئے کم از کم اتنی محنت ضروری ہے کہ جس کے بعد گنج بالوں میں سے طلوع ہونا شروع ہو جائے---گنج کا عمل دو افعال کا مرہون منت ہے۔ کرنا، کرایا جانا۔ آیئے، ہم تفصیل سے ان افعال کا جائزہ لیتے ہیں۔

گنج کرنا ہیئر سپیشلسٹ کا کام ہے۔ جب کوئی اس مقصد کے لئے اس کے پاس پھنس جائے تو اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں کیونکہ اس میں سٹائل خراب ہونے کے خطرے سے بے نیاز ہو کر سر کے ایک طرف سے سٹارٹ ہو کر رن وے بنانا شروع کیا جاتا ہے اور میدان صاف ہونے پر استرا روک دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض سٹار پلس بیویاں اپنے شوہروں کی گنج جوتے یا زبان کی مدد سے گھر پر (Indoor) ہی کرتی ہوئی بھی پائی گئی ہیں---گنج کرایا جانا نہایت تکلیف دہ امر ہے جو خطرناک ترین سزاؤں میں شمار ہوتا ہے۔ خصوصاً ان نوجوانوں کے لئے جن کو عین گرلز کالج یا سکول کے سامنے جا کر یاد آئے کہ ان کے بال خراب ہو گئے ہیں۔ پھر جب وہ بال سنوارنے کے فریضے میں مشغول ہوں تو پولیس انہیں پکڑ کر ان کے سر سے ناجائز تجاوزات ہٹانے میں ذرا تاخیر سے کام نہ لے گی---بعض اوقات کچھ والدین اپنی اولاد میں مذکر مونث کی پہچان برقرار رکھنے کے لئے بھی یہ انتہائی قدم اٹھا بیٹھتے ہیں۔ کبھی کسی ٹیچر کو کلاس میں کسی طالب علم کا ہیئر سٹائل اس قدر پسند آ جاتا ہے کہ وہ نمونے کے طور پر اس کے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے جس کے بعد مجبوراً متاثرہ طالب علم کو سر کو بالوں سے پاک کرانا پڑتا ہے---گنج ہونے کا سلسلہ بھی آج کل عروج پر ہے جو لوگ اپنے دماغ کو زیادہ ہوا نہیں لگواتے، قدرت آہستہ آہستہ ان کے سر کو ہوادار بنا دیتی ہے۔ یہ سلسلہ کسی وقت بھی شروع ہو سکتا ہے ختم البتہ اسی وقت ہوتا ہے جب سر مکمل طور پر "پُر فضا" ہو جائے۔ یہ سانحہ عموماً اُن لوگوں کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے جو سر کو ضرورت سے زیادہ ہوا لگوا دیتے ہیں کیونکہ اسی ہوا سے پھر ان کے بال اڑنا شروع ہو جاتے ہیں اور بالوں میں سے اصلی سر نمودار ہونا شروع ہو جاتا ہے---بعض اوقات دماغی کمزوری بھی گنج ہونے کا سبب بنتی ہے جس کے بعد اچھا خاصا نوجوان (بوڑھا نوجوان) ہو جاتا ہے اور اسے اکثر و بیشتر وگ کو زیب سر کرنا پڑتا ہے، خصوصاً جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی کیونکہ اگر وہ سر کو اور یجنل حالت میں رکھے تو اولوں اور دھولوں کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس پر کوئی حسین تھوکنے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔ بقول شاعر، وہ پھر یہی گاتے ہیں---

یہی حسرت ہمیں اے جان! رہی مرگ تلک
اک بار نہ پھیرا تو نے اس گنج پہ ہاتھ

کچھ لوگ قدرت کے اس فیصلے کے خلاف احتجاجاً گنج پر گائے کی زبان پھرانے جیسے ٹوٹکے اور گنج پروف ادویات کا استعمال کرتے ہیں لیکن ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے کہ اتنے جتن کے بعد کچھ لوگ دو چار بال بچانے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن جلد ہی پسماندگان بھی مرحومین کے ساتھ جا ملتے ہیں---گنج کرانے میں سرفہرست پہلوان حضرات ہیں جو گنج کرانے کے بعد اسے تیل دے کر لائٹیں مارتے ہوئے بازار سے گزرتے ہیں تاکہ دوست دشمن سب دیکھ لیں کہ شوقین مزاج ایڈونچر کے طور پر گنج کراتے ہیں۔

اقسام گنج: گنج کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں۔ قدرتی اور مصنوعی گنج۔ آگے ان کی مزید قسمیں درج ذیل ہیں۔

مکمل گنج: یہ گنج ہر لحاظ سے مکمل ہوتا ہے، یعنی خوردبین سے مشاہدہ کرنے پر بال تو کیا، بال کا بچہ بھی نظر نہیں آتا۔ یہ عموماً قدرتی ہوتا ہے

اور عمدہ حالت میں شفاف ہوتا ہے اور روشنی منعکس کرنے کے علاوہ آئینے کا کام بھی دے سکتا ہے۔ یہ بعض اوقات اندر سے خالی ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں کسی شاعر کا کہنا ہے کہ جو گنج خالی ہے، صدا دیتا ہے اس لئے لوگ اسے دھولیں مار مار کر چیک کرتے رہتے ہیں۔۔۔ مکمل گنج اگر گول ہو تو بوقتِ ضرورت طبلے اور ڈھولکی کا کام بھی دے سکتا ہے جبکہ اگر لمبوترا ہو تو پھسلنے میں لاجواب ہوتا ہے۔

نعیم گنج: جیسے نیم ملا اور نیم حکیم ہوتے ہیں، اسی طرح نیم گنج بھی ہوتا ہے۔ عموماً شوہر حضرات اس کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کے اسباب عموماً بیویوں کی فرمائشیں، طعنے، شاپنگ یا جوتے ہوتے ہیں۔ پھر بھی کچھ بال رہ جاتے ہیں جو دل کی تسلی کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

جھالردار گنج: یہ وہ گنج ہے جس میں سر پر کانوں کے اوپر دونوں طرف بالوں کی عظمت رفتہ کے کچھ آثار جھالر کی شکل میں پائے جاتے ہیں جو سر کی باؤنڈری بناتے ہیں۔ یہ عموماً فلسفی، دانشور، پروفیسر حضرات اور بینکروں اور سائنسدانوں پر نظر آتا ہے۔

مخفی گنج: اسے وسطی گنج بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً سر کے اوپر عین درمیان میں ایک چاند کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور سورج کی شکل اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ شروع میں اسے ادھر ادھر کے بالوں کی مدد سے کیموفلاج کیا جاسکتا ہے لیکن جلد ہی یہ لاوا ہو کر جھالردار یا مکمل گنج کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی بالآخر گنج کا سورج طلوع ہو کر رہتا ہے۔

بلال گنج: گنج کی یہ خطرناک قسم لاہور میں پائی جاتی ہے لیکن اس کی تفصیل بتا کر ہم اپنی گاڑی پرزوں کی شکل میں سیل نہیں کرانا چاہتے۔۔۔ اس کے علاوہ گنج کی دو اور قسمیں بھی مشہور ہیں۔ داتا گنج اور شکر گنج۔

فوائد: ''نہیں ہے نکمی کوئی چیز زمانے میں'' کے مصداق گنج کے کچھ فوائد بھی ہیں جو کہ درج ہیں۔

☆ گنجے آدمی کے ماتھے کی چوڑائی لامحدود ہوتی ہے اس لئے اس کی ذہانت بھی لامحدود سمجھی جاتی ہے۔

☆ گنجا آدمی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو یہ دیکھ کر اس کا گنج فخر سے بلند ہو جاتا ہے کہ مشاہیر عالم اکثر گنجے تھے۔

☆ گنج سے بوقت ضرورت آرائش گیسو اور آلاتِ موسیقی کا کام لیا جاسکتا ہے۔

☆ گنجے آدمی کے سر کے بال انتہائی خوف کی حالت میں بھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔

☆ گنجے آدمی کو جوؤں، سکری خشکی اور بالوں کی دیگر بیماریوں کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

☆ گنجے آدمی کا شیمپو، ڈرائی اور حجامت کا خرچ بچتا ہے۔

☆ لوڈشیڈنگ کے دوران گنج کو چمکا کر بلب کا کام لیا جاسکتا ہے۔

☆ کوئی کسی گنجے کو بال بال مقروض ہونے کا طعنہ نہیں دے سکتا۔

☆ گنجا آدمی پریشانیوں کے باوجود فارغ البال ہی کہلاتا ہے۔

☆ گنجا آدمی عوام کا ذریعہ تفریح بن کر ثواب دارین حاصل کرتا ہے۔

☆ عشق کے جراثیم گنجے آدمی سے میلوں دور رہتے ہیں۔

☆ موسمی اثرات فوری طور پر گنج کی مدد سے براہ راست دماغ پر منتقل ہوتے ہیں جس سے موسم کی تبدیلی کا علم سب سے پہلے گنجے کو ہوتا ہے۔

☆ اگر کوئی مجرم گنج کرالے تو فوری طور پر ناقابل شناخت ہو جاتا ہے اور پکڑے جانے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

☆ لڑائی میں گنجا آدمی بالوں سے نہیں پکڑا جاسکتا۔

☆ گنج پر ہر قسم کی پینٹنگ کرا کے بالوں کے بغیر بھی سٹائل بنائے جاسکتے ہیں اور ہیلمٹ بنوا کر بھی خرچہ بچایا جاسکتا ہے۔ نقصانات اور فوائد کے ساتھ ساتھ ہر چیز کی طرح گنج کے کچھ نقصانات بھی ہیں مثلاً۔

☆ گنجے کو سردی اور گرمی زیادہ لگتی ہے۔

☆ گنجے کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ منہ دھوتے ہوئے ماتھا کہاں تک دھوئے کیونکہ ماتھے اور سر میں کوئی سرحد نہیں ہوتی۔

☆ شرارتی لوگ گنجے کی دھولیں مار مار کر اس کا سر پلپلا کر دیتے ہیں۔

مجموعی طور پر نقصانات فوائد کی نسبت کم ہیں اس لئے گنج ایک اچھی چیز ہے۔

☆☆

یونہی اک بات کہتا ہوں

اکبر بخاری

موبائل فون نے زندگی اجیرن کردی ہے۔ یہ جس کی بھی ایجاد ہے، وہ بہت ختتم مزاج ہوگا۔ ایسا ختتم مزاج کہ آج ہر انسان کی زندگی اس موبائل فون کے ہاتھوں بیزاری کا شکار ہے۔ ہر سرکاری و نجی ملازم کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اب فون کی گھنٹی بجے گی اور کوئی اچانک افتاد آپڑے گی۔ یہ بھی کیا غضب ہے کہ دن ہے تو گھنٹی بج رہی ہے، رات ہے تو گھنٹی بج رہی ہے۔ بعض ستم ظریفوں نے تو بڑے غضب کے گانے ٹیون کے طور پر سیٹ کیے ہوئے ہیں اور بعض اوقات تو بڑی ہی دلچسپ صورت حال دیکھنے اور سننے میں آتی ہے۔ آپ نماز میں ہیں، جماعت ہو رہی ہے کہ اچانک کسی موبائل کی گھنٹی بج اٹھتی ہے اور گھنٹی کے طور پر ٹیون کیا ہوا گانا ”اک طرف اس کا گھر، اک طرف سے میکدہ“ بج اٹھتا ہے۔ سب نمازی نماز میں ڈبل لطف لے رہے ہیں۔ نماز کی نماز، گانے کا گانا---آپ جنازہ کی نماز میں ہیں کہ اچانک موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھتی ہے اور پوری جنازہ گاہ ”چٹھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دے، حال میرے دل کا تمام لکھ دے“ گانے کی پرشوز آواز سے گونج اٹھتی ہے---موبائل فون نے تو زندگی عذاب بنا کر رکھ دی ہے۔ باتھ روم میں ہیں تو گھنٹی بج رہی ہے اور فون سُنا جارہا ہے۔ کھانا کھایا جارہا ہے، اُدھر فون سُنا جارہا ہے۔ اور تو اور ادھر ایک سے لوسٹوری کا منظر جاری ہے تو دوسری طرف فون دوسری لوسٹوری سے ختم ہی ہوگیا ہے---ادھر کال کی، اُدھر محبوب آپ کے قدموں میں۔ کبھی ہیرو پوری فلم میں آہیں، سسکیاں اور آنسو ہی بہاتا رہتا تھا۔ اب تو اس کی کوئی ضرورت اور فکر نہیں۔ ادھر فون ہوا، اُدھر انارکلی کپڑوں کی خریداری کے بہانے محبوبہ آموجود ہوئی۔ آج اگر پارکوں کی رونقوں میں بے تحاشہ اضافہ ہوگیا ہے تو اس کی ایک وجہ موبائل فون بھی ہے۔ موبائل فون کی ایجاد نے کمیونیکشن گیپ (Communication Gap) کو تو بالکل ہی مٹا دیا ہے۔ اور تو اور، اب فون کرنے اور کال کا خرچہ کرنے کی بجائے میسج کا ایسا پیکیج ہاتھ آیا کہ صرف 4 روپے میں آپ پوری 1200 محبوباؤں کو کم از کم ایک ایک میسج تو کرہی سکتے ہیں۔

ہمارے نوجوان آج موبائل میں اتنے طاق ہو گئے ہیں کہ بیک وقت کئی سو محبوباؤں سے رانجھے، مجنوں، پنوں اور مہینوال بن کر عشق پیچے لڑا رہے ہوتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ ایک ایک ہیر، لیلیٰ، سسی، سوہنی بھی بیک وقت کئی سو رانجھوں، پنوؤں اور مہینوالوں کو لائن میں لگا کر بیوقوف بنا رہی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات تو بڑی اچھی صورتحال بنتی ہے۔ جب ایک پارک میں ایک ہیر کے کئی رانجھے ایک ہی وقت میں ہیر سے ملنے آپہنچتے ہیں اور ایک فلمی سین ترتیب پاجاتا ہے۔

موبائل فون رحمت کم بلکہ زحمت زیادہ ہے بلکہ یہ تو بڑی زحمت ہی زحمت ہے مگر اس زحمت کو اپنے پلے سے خرچ کر کے پالنا ہی پڑتا ہے کہ اس کے بغیر اب زندگی ناممکن ہو کر رہ گئی ہے۔ بعض لوگ تو موبائل فون ہی پر اپنی تمام کاروباری سرگرمیاں سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ سیاسی لوگ موبائل سے بہت فائدے اُٹھاتے ہیں۔ ایویں نمبر ڈائل کیا کوئی بھی اور افسر سے سفارش کردی۔ خرچ بھی بچ گیا، ووٹر بھی خوش، افسر بھی خوش۔ ”فیس“ بھی پکی اور احسان بھی پکا---بعض سیاستدانوں نے تو پولیس کے اعلیٰ افسران، انتظامیہ کے اعلیٰ افسران، پٹواری وغیرہ سے پہلے ہی طے کیا ہوا ہوتا ہے کہ ہمارا فون آئے نہ آئے، ہمارے ووٹر کے سامنے ہمارے نمبر ضرور بنادیتے ہیں۔ یاد رہے بیوروکریسی میں سب سے بڑا افسر پٹواری اور پولیس ہیں۔ سب سے بڑا افسر تھانیدار ہے۔ چاہے چھوٹا ہو یا وڈا اگر اللہ نہ کرے کہ کسی کو ماسٹر جی سے کام پڑے۔ ماسٹر جی کو منشی کے نام سے ہمارے ملک کا سیاستدان مانتے ہیں۔ منشی جی تمام سیاستدانوں کا مشترکہ دشمن ہے۔ لوگوں کو علم کی روشنی کے ذریعے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا باغی جو بنارہا ہے اسی لئے تو کبھی اُسے سرعام چھتروں سے نوازا جاتا ہے، کبھی لتر ول سے تواضع کی جاتی ہے مگر پھر بھی سیاستدانوں کی دشمنی اس سے کم نہیں ہوتی، نہ ہوگی کیونکہ جب تک ہم امریکہ نہیں پہنچ جاتے اور امریکہ چاند پر نہیں پہنچ جاتا تمہاری سوچ کبھی نہیں بدلے گی۔ اگر سوچ بدلنی ہے تو موبائل بدل لیجئے، سوچ خود بخود بدل جائے گی۔ کمپنی بدلنے سے انسان بدل جاتا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے اور آج انسان کو سب سے زیادہ موبائل کی صحبت حاصل ہے۔---سفر میں، سوتے وقت، اُٹھتے وقت، دوڑتے وقت، کھاتے وقت یہاں تک کے لو کرتے وقت بھی موبائل کی کمپنی آپ کو حاصل ہے اس لئے اس کمپنی بدل لیجئے، آپ کی سوچ خود بخود بدل جائے گی---کیا کبھی آپ نے اس زاویہ نظر سے سوچا ہے؟ مجھے قطعی امید ہے کہ آپ نے ایسا کبھی نہیں سوچا ہوگا۔ بھلا چائینہ موبائل رکھنے والے غریب لوگ، بلیک بیری رکھنے والے لوگوں کی کمپنی میں کیسے ایڈجسٹ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اگر کمپنی بدلتی ہے تو موبائل بدل لیجئے۔ آپ کا سٹیٹس بدل جائے گا۔ اگر زیادہ قیمتی موبائل اگر رکھنا ہے تو ساتھ ہی وزارت داخلہ کو توپ کے لائسنس کی درخواست بھی دے ہی دیجئے، موبائل اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے جو کہ موبائل سے ہرگز زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ جب توپ کے لائسنس کی درخواست گزاریں گے تو لازماً آپ کو چھری ساتھ رکھنے کا لائسنس ضرور مل جائے گا اور آپ چھری سے آلو ضرور کاٹ سکیں گے---آج کل پٹھان جو کہ گلی کوچوں میں سائیکل پر سوار ہو کر چھری چاقوؤں کو دھار لگانے آجایا کرتے تھے، ناپید ہو گئے ہیں۔ وہ افغانستان میں افغانیوں کے چھری چاقوؤں کو تیز کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں تو وہ کبھی کبھار عید، بقرعید پر ہی نظر آتے ہیں اس لئے آپ کو چھری سے ہی گزارا کرنا ہوگا۔ چاہے اپنی گردن کاٹیں یا کسی اور کی---یہاں جیب کاٹنے کا لائسنس تو ہر ایک نے حاصل کر رکھا ہے۔ دکاندار سرعام جیب کاٹ رہے ہیں۔ پٹواری، پولیس، ایکسائز، ماسٹر، کون ہے جو جیب نہیں کاٹ رہا۔ حیرت ہے، جن لوگوں کی گردن کاٹنے سے ایک قطرہ لہو نہ نکلے، لوگ ان کی بھی جیبیں کاٹ لیتے ہیں اور کچھ نہ کچھ برآمد ضرور کر لیتے ہیں---ارے، یار! بات تو موبائل کی چل رہی تھی۔ موبائل آج کی صدی کی اہم ترین ایجاد ہے جس نے انسان سے انسان تک کا فاصلہ زیرو کر دیا ہے اور یہ کم ہوتا ہوا فاصلہ بالکل بٹ کر رہ گیا ہے۔ نہ لڑکی کا پتہ چلتا ہے اور نہ لڑکے کا بلکہ آج کل تو نیٹ کیفے پر لڑکیاں زیادہ اور لڑکے کم ملنے لگے ہیں۔ یہ دہائی کس کو دی جائے، یہ فریاد کہاں درج کرائی جائے؟ یہاں عام عدالت سے لیکر سپریم کورٹ تک سیاسی مقدمات کی زد میں ہیں اور کیوں نہ ہوں، ایسے مقدمات کی سماعت سے ہی تو شہرت کشید کی جاسکتی ہے۔ عام لوگوں کے مسائل، پریشانیاں، مہنگائی، خودکشی، معاشرتی حالت سے کسی کو کیا سروکار؟ چاہے ساری دُنیا قتل ہو جائے، پر وہ یسی پر کیس سیاست کے بادشاہوں کے ہی چلیں گے---نہ جانے مجھے کیا ہوتا جارہا ہے۔ میں موبائل فون سے گزرتے گزرتے کہاں پہنچ گیا ہوں حالانکہ یہاں سے مکمل طور پر گزر جانے کے بعد بھی حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی بلکہ دوست وضو کرتے ہی مرجائیں گے اور نماز جنازہ غیر نے آکر پڑھنی ہے پر غیروں سے ہماری شناسائی اب کہاں رہی ہے۔ جب سے محبوبہ انصاف سے ہم سے آنکھ بدلی ہے، ہم بھی مکمل بدل گئے ہیں اور پھر ہماری بات بھی یونہی اک بات کتابوں کی سی بات ہے مگر یہ بات خود کلامی سے بڑھ کر اب خود بیانی ضرور بنتی جارہی ہے۔ بس رہے نام سائیں کا!

☆☆

شمالی علاقہ جات

مسٹر پاگل لاہوری

ہم کالم کے آغاز میں ہی آپ کو بتا دیتے ہیں کہ شمالی علاقہ جات سے ہماری مراد ہرگز وادی کاغان، ناران وغیرہ نہیں بلکہ ہم لاہور کے شمالی علاقہ جات مصری شاہ، وسن پورہ، شادباغ اور بھگت پورہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں صحیح معنوں میں یہی پوش علاقے ہیں کیونکہ یہاں سفید پوش لوگ کثیر تعداد میں رہائش پذیر ہیں۔ جو لوگ اِک موریہ، دو موریہ پل صراط سے نہیں گزرے وہ اگر لاہور کے شمالی علاقے شادباغ منزلِ مراد کی طرف آنا چاہیں تو اپنے ہمراہ وقت اور صبر جیسی دو قیمتی چیزیں ضرور لائیں کیونکہ جتنا وقت کوٹ لکھپت سے اِک موریہ پل تک آنے میں صرف ہوگا، اِس سے تگنا وقت اِن شاءاللہ اِک موریہ پل سے شادباغ پہنچنے کے لیے درکار ہوگا۔ ہم قبل از وقت اس لیے یہ بات آپ کے گوش گزار کررہے ہیں کہ کل کو آپ یہ کہتے نہ پھریں کہ ہم نے وقت ہی کم دیا تھا۔

ایک موریہ پل آپ ضرور رُکیں گے اور آپ کو پتہ چلے گا کہ یہاں تانگوں، ریڑھوں کے آگے کیسے کیسے ضدی گھوڑے اور گدھے جتے ہوئے ہیں۔ ہم دور کیوں جائیں، ہم شمالی علاقوں کے رہنے والے لوگوں کو متعدد بار خود پر حیوان ہونے کا گمان گزرا ہے اور یہی نہیں، آتے جاتے ہم گھوڑوں کا منہ چومتے بھی ہیں اور چھواتے بھی ہیں۔ ابھی ہم کل ہی اپنے دوستوں کے ساتھ جارہے تھے کہ سڑک پر بیل گاڑی، گدھا گاڑی اور خچر گاڑی نظر آئی۔ یہ گاڑیاں اِس طرح جارہی تھیں کہ اِن گاڑیوں کے جانور کی ناکیں بھی برابر کی سطح پر محو سفر تھیں۔ جب ہم نے اپنی کے ڈبلیو ایم اِن جانوروں کے برابر کیں تو ہمیں واقعتاً خود پر ہنسی آگئی۔ ہم نے فوراً اپنے دوستوں سے کہا کہ ہمارا چہرہ، خچر کے چہرہ اور کسی اور جانور کا چہرہ جسے ہم جان بوجھ کر نظرانداز کررہے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کو یقین آجائے گا کہ ہم اشرف المخلوقات ہے۔

شمالی علاقے کی ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ جو شخص اِک موریہ پل یا دو موریہ پل سے لے کر شادباغ تک موٹرسائیکل یا کار بخیرو عافیت چلا کر لے جائے اُسے ایف سولہ کا لائسنس بھی باآسانی مل سکتا ہے۔ ہم موٹرسائیکل چلا رہے ہوں تو پیدل حضرات ہم سے آگے نکل جاتے ہیں کیونکہ ہم موٹرسائیکل پر بیٹھے بیٹھے بریکیں لگاتے رہتے ہیں۔ شمالی علاقوں میں موٹرسائیکل چلانے کے بہت سے آداب ہیں مثلاً آپ کی موٹرسائیکل کا اگلا پہیہ تانگے یا ریڑھے کے پہیے کے ساتھ یوں حرکت کرے جیسے وہ تانگے کے ساتھ ہی بندھا ہو، تانگے کے پیچھے موٹرسائیکل جارہی ہو تو موٹرسائیکل کا پہیہ تانگے کے پہیے کا بچہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں راستہ لینے کے لیے کسی قسم کے ہارن، باجے، تالے کی ضرورت نہیں۔ اِس کے لیے بعض لوگ راستہ لینے کے لیے نازیبا کلمات اور مہمل الفاظ استعمال کرتے ہوئے ہاتھاپائی پر اُتر آتے ہیں جس سے راستہ مزید بند ہوجاتا ہے۔

ہمارے ہاں صرف موٹرسائیکل سواروں اور اہلکاروں ہی کو مشکل پیش نہیں آتی، پیدل حضرات کو بھی مشکلات کا سامنا ہے۔ مثلاً وہ کھل کر بازو نہیں ہلا سکتے۔ شاید یہاں ساکن بازو والے لوگوں کی ضرورت ہے یا لوگ اپنے بازو پیچھے باندھ کر چلا کریں۔

شمالی علاقوں کے موٹرسائیکل اور سائیکل سواروں کو اپنی موٹرسائیکلیں اور سائیکلیں صاف کرنے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی کیونکہ یہ سڑک پر ہی اِک دوسروں کی پتلونوں اور شلواروں سے صاف ہوتی رہتی ہیں۔ زیادہ رش ہو تو یہ لوگ اپنی سائیکلوں کو دونوں ہاتھ سے اُٹھا کر دوڑ لگا دیتے ہیں، بعض اوقات تو موٹرسائیکل کو بھی اُٹھا کر چل پڑتے ہیں۔ پیدل خواتین تانگوں کے اوپر سے اور رکشے کے بیچ سے سڑک عبور کرلیتی ہیں اور حضرات گھوڑوں، گدھوں اور خچروں کی ٹانگوں کے درمیان سے سڑک عبور کرلیتے ہیں۔ آپ نہ صرف اپنے سامنے والی سواریوں پر نظر رکھیں بلکہ آپ کو غیب کا علم بھی ہونا چاہیے کہ آپ کے تعاقب میں کون کون سی ہستیاں آرہی ہیں کیونکہ پیچھے آنے والے لوگ آپ کی گاڑی کی نمبر پلیٹ توڑ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ آپ آگے ہی دیکھتے رہتے ہیں پیچھے دیکھ کر ہی نہیں چلتے---- چلتی گاڑیوں کے دروازے کھولنا، سٹیرنگ پر بیٹھ کر پیسے گننا، اخبار پڑھنا، سیب کھانا اور موبائل فون سننا معمول کی باتیں ہیں۔ آپ سے آگے جانے والا کسی بھی وقت کسی بھی طرف مڑ کر آپ کا رُخ کسی بھی طرف موڑ سکتا ہے، آپ کسی تانگے کو اوورٹیک کررہے ہیں تو کوئی معزز خاتون آپ کی ٹینکی پر لینڈ ہوسکتی ہے۔ شمالی علاقے کے لوگ صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھروں سے کام پر روانہ ہوتے ہیں لیکن کئی مرتبہ راستے ہی سے دوبارہ کپڑے پہننے گھر لوٹ آتے ہیں اِس لیے اَب ضروری ہوگیا ہے کہ یہ لوگ دو تین سوٹ اپنے ساتھ فالتو رکھ لیا کریں۔

اِن دِنوں شمالی علاقوں میں ایک ٹرینڈ دیکھنے میں آرہا ہے کہ بندہ اچھا بھلا اپنی بائیکل پر جارہا ہے۔ اچانک اُس پر کھلتا ہے کہ اس کے چہرے پر ایک گول سی متحرک شے آرہی ہے، غور کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ سامنے سے آنے والے صاحب اپنی بائیک یا سائیکل کیا اگلے پہیہ کو اُٹھا پچھلے پہیے پہ آرہے ہیں۔ آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزہ پایا؟ ہمارے ذہن میں یہ بات آرہی ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوسکے، شاید اَب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے ٹائروں پر کھڑا ہونا سیکھ رہے ہیں یہ کم خرچ اور بالانشین طریقہ ہے کیونکہ موٹرسائیکل اور سائیکل کا صرف ایک ہی ٹائر گھسا کرے گا۔

ہماری شمالی علاقوں کی اور بھی بے شمار خوبیاں ہیں جنہیں ہم کسی مناسب وقت کے لیے اپنے سر پر اُٹھائے رکھتے ہیں۔

☆☆

ذکر لال میاں کا

☆ شاہد اطہر

جیسے ہی ہم گھر میں وارد ہوتے ہیں، سکون کی تلاش میں ہمارا پہلا عمل جرابیں اتارنا ہوتا ہے۔ پھر جیب ہلکی کر کے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود ہلکے ہو گئے ہیں۔ اگر چہ ہم بٹوا رکھنے کے مرض میں نوعمری سے ہی مبتلا ہیں، پھر بھی ہماری عادت ہے کہ خاصے پیسے پتلون کی جیب میں رکھتے ہیں تا کہ بار بار پرس نہ نکالنا پڑے سو اس شام بھی حسب معمول ہم نے جیب ہلکی کی اور رقم بیڈ سائیڈ کی ٹیبل پر رکھ کر کپڑے تبدیل کرنے باتھ روم گئے۔ واپسی پر ہمیں نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ سو روپے کا ایک نوٹ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ ہم نے سر جھٹک کر اخبار کا آخری مرتبہ مطالعہ شروع کر دیا مبادا کوئی خوشخبری رہ نہ گئی ہو اور تب ہی ہمیں ہلکی سی آواز آئی۔

''ہیلو---''

ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سمجھ نہ سکے کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ ٹی وی بند تھا، فون آن تھا، بے غم نے دنیا کی سب سے عظیم ایجاد تھرمامیٹر سے اپنا منہ بند کر رکھا تھا۔ ابھی انہیں سوچوں میں غرق تھے کہ پھر وہی ہلکی سی سریلی آواز سنائی دی۔

ہیلو---''

ہم پھر چونکے کیونکہ آواز ہمارے قریب سے ہی آئی تھی۔ اگر چہ ہم جن بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے (پریوں کی بات علیحدہ ہے) پھر بھی اس آواز کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ بے خیالی میں ہماری نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑے نوٹوں پر گئی تو ہمارے دیدے کھلے کے کھلے رہ گئے کیونکہ اوپر پڑا ہوا سو کا نوٹ با قاعدہ مسکرا کر ہمیں دیکھ رہا تھا بلکہ بول بھی وہی رہا تھا۔

''پریشان کیوں ہو رہے ہیں، جناب! یہ میں ہی آپ کو ''ہیلو، ہائے'' کر رہا ہوں۔''

پہلے تو ہم گھبرا کر بھاگنے لگے، پھر خیال آیا کہ بیٹا کیا سوچے گا۔ وہ تو ہمیں اپنے اسکول میں کسی شیر سے کم پیش نہیں کرتا جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہم لال بیگ سے ڈرتے ہیں، شیر سے نہیں اور یہ کہ شیر سے جب بھی ملاقات ہوئی، اس بزدل نے ہمیشہ ہمارے اور اپنے درمیان آہنی جنگلا حائل کیے رکھا تھا--- بہر کیف، ہمت کو یکجا کر کے ہم نے دوبارہ نوٹ کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

''بھئی، آپ اتنے گھبرا کیوں رہے ہیں---؟''

''نہیں، ہم تو نہیں گھبرا رہے---لیکن تم بول کیسے سکتے ہو؟'' ہم نے بدحواسی کے عالم میں پوچھا۔

''ہم بھی منہ میں زباں رکھتے ہیں
کاش، پوچھو کہ مدعا کیا ہے''

گمان سے نکل آئے تو انسان نارمل ہو ہی جاتا ہے سو ہم بھی ہو گئے۔

''کیا تم واقعی بول سکتے ہو---؟''

''لگتا ہے، آپ کو کان سے میل نکالنے کی ضرورت ہے--- ارے جناب! یہ آپ کو وہم نہیں ہو رہا، میں واقعی بول سکتا ہوں۔ لوگ تو مجھے سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں جہاں پر میرا دم ہی گھٹ جاتا ہے۔ آپ نے کھلی ہوا لگوائی تو میں ہوش میں آیا اور دل چاہا کہ بات چیت کی جائے---''

''حیرت کی بات ہے، ہم نے کسی بے جان چیز کو پہلی مرتبہ بولتے ہوئے سنا ہے---''

''بے جان---اونہہ، نوٹ سے زیادہ جاندار چیز بھی بھلا ہوتی ہے؟''

''اچھا، یار! فلسفہ نہ بولو---اگر یہ میرا وہم نہیں ہے تو پھر میں بھی تم سے بات کرنا چاہوں گا۔''

''شوق سے کریں، شاہد صاحب ---!''

''ارے، تم میرا نام بھی جانتے ہو---؟''

''لو، صبح سے ساتھ ہوں اور یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں تو لوگوں کا وہ کچھ جان لیتا ہوں جو آپ نہیں جان سکتے ---''

''اچھا، پہلے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ---؟''

''کیا بتاؤں---؟''

''یہی کہ تم وجود میں کیسے آئے---؟''

''اچھا، تو پھر سنیں---میری پیدائش سیکورٹی پرنٹنگ پریس میں ہوئی۔ ایک بھاری بھرکم چھاپہ مشین کا رولر میرے وجود سے گزرا اور میں سفید سے سرخ ہوگیا، ظالموں نے ایک تار بھی میرے وجود میں ڈال دیا تاکہ میرے اصل ہونے کا پتہ چل سکے۔ یوں مجھ پر 100 روپے کا ٹھپہ لگ گیا---آپ کی دلچسپی دیکھ کر میں مختصراً ماں کے پیٹ کا کچھ احوال بھی سناتا ہوں۔ پہلے پہل میں لکڑی تھا۔ زندگی بڑی خوشگوار تھی لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ مجھے کیسا سفر کرنا پڑے گا۔ پھر وہ درخت کٹا اور کٹ کر فیکٹری پہنچ گیا۔ پھر مجھ پر جتنے ستم ہو سکتے تھے، کئے گئے ۔ میرے چیتھڑے کر دیئے گئے، کیمیکلز میں ڈالا گیا اور بالآخر مجھے کاغذ بنا دیا۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں ایمپورٹڈ ہوں۔ بہرحال، یہ کاغذ کی قسمت ہے کہ کوئی ڈالر بن جاتا ہے تو کوئی---میں پاکستان بھیج دیا گیا اور پھر اسٹیٹ بنک کی ہدایت کے مطابق مجھے ''پیدا'' کردیا گیا۔ وہاں سے میں کمرشل بنک گیا جنہوں نے نیا ہونے کی وجہ سے مجھے ATM میں ڈال دیا۔ پھر لاکھوں ہاتھوں سے ہوتا ہوا آپ تک پہنچ گیا ہوں، بس یہ ہے میری کہانی---''

''بھئی، بہت خوب---لیکن مجھ تک آنے میں کروڑوں واقعات بھی تو ہوئے ہوں گے؟''

''واقعات ہی واقعات ہیں لیکن آپ مزاح کے دلدادہ ہیں اور یہاں دکھ کی زیادہ داستانیں ہیں۔''

''دکھی تو سارا سنسار ہے---تم ہمیں اپنے واقعات سناؤ۔'' ہم نے اصرار کیا۔

''ٹھیک ہے مگر پہلے AC کم کریں، مجھے سردی لگ رہی ہے۔ دیکھیں نا! لوگ تو مجھے سانس بھی نہیں لینے دیتے جس کی وجہ سے مجھے سانس کی بیماری ہو چکی ہے اور میری آنکھیں روشنی بہت کم دیکھتی ہیں۔ مجھے تو فوراً نہ جانے کہاں کہاں چھپا کے رکھا جاتا ہے کہ کہیں مجھے ہوا نہ لگ جائے۔ آپ نے ذرا آزادی دی ہے تو جان میں جان آئی ہے۔''

''چلو، اب اپنے واقعات سناؤ، کیسا گزر رہا ہے تمہارا سفر---؟''

''اچھا، تو سنیں---سب سے پہلے نئے نوٹوں کے کاروبار کرنے والے مجھے لے اڑے جنہوں نے میرے چند چھوٹے بھائی بنک اہلکار کی نذر کئے اور یوں میرا سفر ''حرام'' کام سے شروع ہوا۔ وہاں سے میں نوٹوں کے ہار بنانے والوں کے ہتھے چڑھ گیا---ذرا رکیں، پہلے میں نئے نوٹوں کے کاروبار کرنے والے کی ایک بات بتادوں۔ وہ شخص پانچ وقت کا نمازی تھا اور نئے نوٹ دیتے ہوئے، یعنی فروخت کرتے ہوئے اس نے اپنے ضمیر کو سلانے کے لئے بڑا آسان طریقہ اپنا رکھا تھا۔ وہ نئے نوٹوں کے ساتھ ایک روپے والی ایک ٹافی دیتا تھا، وہ بھی پچاس روپے میں جسے لینا لازمی تھا۔ منہ سے کہتا تھا کہ نوٹ کا کاروبار حلال نہیں لیکن ٹافی فروخت کرنا حلال ہے---آپ سمجھ رہے ہیں، نا؟''

''ہاں بھئی، سمجھ رہے ہیں---ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے---''

''پھر ظالم نوٹوں کے ہار بنانے والوں نے مجھے ہار پر ٹانک دیا۔ اسٹیپل کرتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ مجھے پن چبھ جائے گی تو درد بھی ہوگا اور سرعام دھوپ میں لٹکا دیا۔ نہ گرمی کا خیال کیا، نہ پلوشن کا---وہاں سے ایک دلہن کا بھائی مجھے خرید کرلے گیا اور پورے گھر میں نمائش کرتا رہا۔ شادی کے موقع پر میں دولہا کی گردن میں لٹکا دیا گیا اور اس بدبخت نے مجھے ایسے گلے سے لگایا کہ جب تک حجلہ عروسی میں داخل نہ ہو گیا ایک منٹ کو بھی مجھے علیحدہ نہ کیا۔ حجلہ عروسی میں جاتے ہوئے اپنی ماں کے حوالے کرگیا جس نے سب سے پہلے مجھے ہی نوچا ہمراہ میرے بھائیوں کے اور پھر ولیمہ کے روز اسی دلہن کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ دلہن بھی سیانی تھی، مجھے پار کر کے اپنے بھائی کو پارسل کردیا اور یوں میں جہاں سے چلا تھا، وہیں واپس پہنچ گیا۔ اس مختصر سفر میں ایک بات ضرور تھی کہ مجھے ہوا ضرور لگی ورنہ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نصیب ہوتا ہے۔ ہر کسی کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے حالانکہ میں ہوں ہی دکھاوے کی چیز---ادھیڑ عمر کی عورتیں تو مجھے باقاعدہ اپنے سینے سے چمٹا لیتی ہیں لہٰذا کہیں پاؤڈر کی خوشبو اور کہیں پسینہ کی بدبو کا سامنا ہوتا ہے لیکن کیا کروں، میں بے بس ہوں۔ جس کا جی جہاں چاہے، مجھے رکھ لے حالانکہ مجھے کھلی آب و ہوا ہی پسند ہے؟''

''اچھا، بھائی نوٹ! ہار کے علاوہ تمہیں کھلی ہوا کہاں نصیب ہوتی ہے؟''

''سچ بتاؤں تو مجھے واہیات مت سمجھ لیجئے گا---طوائف کے کوٹھے پر، وہاں تماش بین مجھے چلتے پنکھے کے ساتھ مارتے ہیں اور میں

چلتے پنکھے کے پروں سے ٹکرا کر بکھر جاتا ہوں۔''

''یار، نوٹ صاحب! تم واہیات ہو ہی گئے ہو تو ایک آدھ واقعہ کوٹھے کے حوالے سے بھی سنا دو؟''

''ایک ملک صاحب ہوا کرتے تھے بلکہ اب بھی ہیں۔ وہ اسٹیل ملز میں ملازم تھے اور دبا کر رشوت لیتے تھے۔ میں ان کے ہاتھ رشوت میں ہی لگا تھا لیکن جب میں ان کے گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے بڑے بھائی نیلے میاں اور ہرے میاں کے ڈھیر لگے ہیں۔ شام کو میں ان کے ہمراہ کوٹھے پر تھا جہاں ان کا استقبال ایسے کیا گیا جیسے غریب ملک IMF والوں کا کرتے ہیں۔ وہاں ان کا ایک ہم پلہ اور بھی آیا ہوا تھا کہ ایک نیا ''پروڈکٹ'' پیش کیا جا رہا تھا۔ ان دونوں نے خار بازی میں اسٹارٹ ہی ہرے میاں سے لیا اور تھوڑی دیر میں بات نیلے میاں تک جا پہنچی۔ نئی حرافہ اتنی ٹرینڈ کر کے میدان میں اتاری گئی تھی کہ مواقع پاتے ہی ملک صاحب سے کہتی، یہ سامنے والا تو میرا بھائی ہے، یہی جملہ وہ سامنے والے سے بھی کہتی تھی۔ دونوں عقل کے اندھوں نے سب کچھ لٹا دیا تو اپنے گھروں کی راہ لی۔ میں اس بڑی لڑائی میں میں کام نہ آیا اور بال بال بچ گیا۔ رات تین بجے ملک صاحب افسردہ سے گھر پہنچے تو ان کی بے چاری بیوی نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا کہ آج پھر اتنی دیر سے آئے ہیں، کہاں رہ گئے تھے؟--- ملک صاحب نے جواب دیا کہ ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، سارا وقت ہسپتال میں تھا--- ان کے منہ سے یہ جواب سنتے ہی بیگم نے جلبلا کر پوچھا کہ کیا ہسپتال والے اب موتیئے کے گجرے بھی دینے لگے ہیں؟--- ملک صاحب اس سوال پر تھوڑا سا سٹپٹائے مگر پھر فوراً ہی بولے کہ بیگم! تم تو خوامخواہ شک کرتی ہو۔ ارے بھئی، ہسپتال میں دوائیوں کی بو سے دماغ خراب ہو رہا تھا سو گجرے خرید لئے--- اب بیوی نے پینترا بدلا اور مطالبہ داغ دیا کہ مجھے کچھ پیسے دے دیں، منے کا دودھ ختم ہو گیا ہے۔ ملک صاحب نے کہہ کر جان چھڑانا چاہی کہ ادھار کر لینا، جیب میں روپیہ بھی نہیں۔ کیا کروں، مہنگائی کا دور ہے۔ بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے اور وہ جو الماری میں لاکھوں پڑے ہیں، وہ میرے نہیں کسی کی امانت ہیں۔ کل کسی سے ادھار پکڑ لوں گا--- بس اس قسم کے سینکڑوں قصے روزانہ دیکھتا ہوں۔ جو شرابی زمیندار ایک رات میں 2200 کی ''بلیک اینڈ وائٹ'' پی جاتا ہے وہ مزارعے کو سو روپے دینے کا بھی روادار نہیں ہے۔''

''پہلے ملک صاحب کا واقعہ تو پورا سناؤ---؟''

''ہاں--- اتفاق کی بات ہے کہ میں ان کے ساتھ کافی دن رہا۔ وہ رشوت کے پیسے عجیب عجیب جگہوں پر چھپایا کرتے تھے لہٰذا مجھے بھی چھپا کر بھول گئے--- آج کل وہ حاجی ہیں اور پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔''

''ہائیں، یہ کایہ پلٹ کیسے ہو گئی؟''

''جیل کی وجہ سے--- آخر کو پکڑے گئے۔ بالا خانے پہ سب کچھ لٹا بیٹھے لہٰذا وہ رشوت دے کر چھوٹنے کے قابل نہ رہے تھے۔ جیل میں جو مچھروں نے کاٹا، پسوؤں (دونوں قسم کے) نے خون چوسا، ماریں پڑیں تو اللہ یاد آ گیا۔ جیل سے نکلتے ہی حج کیا، توبہ کی اور پکے نمازی ہو گئے۔ مجھے سب کچھ یوں پتہ ہے کہ میں امام ضامن میں بندھا تھا۔''

''یار، لال میاں! کیوں یہ نام ٹھیک ہے، نا---؟''

نظر آتا ہے

جس کے ہاں کیش کا فقدان نظر آتا ہے
وہی بندہ اُسے نادان نظر آتا ہے
سبزی والی ملی دال نہ چینی، چاول
بھوکا ہی جائے گا مہمان، نظر آتا ہے
جانے کیوں کہتا ہے بندر کو وہ دادا ابو
ڈارون ویسے تو اِنسان نظر آتا ہے
پیٹ خالی ہو تو اشکال بدل جاتی ہیں
چاند بھی قیمے بھرا نان نظر آتا ہے
آج آئی نہیں شاپنگ کے لئے گھر سے وہ
سارا بازار ہی سنسان نظر آتا ہے
دھندا مندا نہ کہیں کر دے ''کلوننگ'' اِس کا
پارلر والا پریشان نظر آتا ہے
منتقلی اَب کے ''ٹریفک'' کو نہ پہنچا پائے
آج ہو جائے گا چالان، نظر آتا ہے
جیولری کی کوئی آفر، نہ کبھی کی اُس کو
کیونکہ تنخواہ کا نقصان نظر آتا ہے
جعلی ایجنٹ کے چکمے کا کرشمہ ہے، نعیم!
ویزہ مغرب کا جو آسان نظر آتا ہے

نعیم نیازی
C/O نیازی ٹریڈرز۔ اڈہ ڈمے والا تحصیل کلور کوٹ ضلع بھکر

"بالکل---میرا اصل نام ہی یہ ہے کیونکہ میں لال رنگ کا ہی ہوں۔"

"تمہیں الجھن کس وقت ہوتی ہے؟"

"اس وقت جب میرا استعمال غلط ہو رہا ہو---مثلاً رکشے والوں کے ساتھ مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ جب بھی کرایہ ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو رکشے والا حجت پر اتر آتا ہے۔ چاہے کرایہ طے ہو یا نہ ہو، رکشے والا کبھی خوش نہیں ہوتا اور ہر مسافر کے ساتھ اس کی بحث، حجت سے میرا موڈ بہت خراب ہوتا ہے۔ خدا کی مار! روزی کما رہے ہو اور جن سے روزی حاصل ہو رہی ہے، ان کی دل آزاری لازمی ہے کیا؟--- پھر یہ جو سائیلنسر نکال دیتے ہیں، اس کے شور سے میں بڑا تنگ ہوں، نری نوائس پلوشن ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں اور کوئی روکتا بھی ہے تو صرف دس بیس روپوں کے لئے۔ اس کے بعد پھر یہ رواں دواں ہو جاتے ہیں اور پہلے ہی مسافر سے لڑ جھگڑ کر ادا شدہ رشوت بلکہ آئندہ دینے والی رشوت بھی وصول کر لیتے ہیں--- دوسرے یہ ریلوے اسٹیشنوں کے قلی! توبہ ہے، یہ کسی حال میں خوش نہیں۔ آپ انہیں پورا لال میاں ہی کیوں نہ دے دیں، آپ کی جانب ایسے دیکھیں گے جیسے آپ نے ان کے ساتھ بڑی زیادتی کر دی ہو--- ویسے آپ کو ایک راز کی بات بھی بتا دوں، قلی کو بھی "اوپر والوں" کو 20 فیصد لگانا پڑتا ہے ورنہ بیچارہ روزگار سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے البتہ چند قلی زیادہ اسمارٹ ہوتے ہیں، وہ بوجھ نہیں اٹھاتے۔ وہ سیٹ، برتھ بلیک کرتے ہیں اور یہ وی آئی پی قلی ہوتے ہیں۔ کچھ کے پاس تو ذاتی کار بھی ہے البتہ اب ذرا ریلوے کے حالات بہتر ہوئے ہیں، خاص طور پر جب سے لاہور اور پنڈی میں ٹکٹ کی فروخت وغیرہ پرائیویٹ پارٹی کے پاس گئی ہے۔ میرے خیال میں تو پورا پاکستان پرائیویٹ پارٹیوں کو ٹھیکے پر دے دینا چاہئے۔ اس طریقہ کار میں بظاہر صرف تین فیصد ملتا ہے جو موجودہ آمدنی سے پھر بھی بہت زیادہ ہے--- مجھے ایک بات بتائیں کہ جس کے پاس ایک بس تھی، آج وہ پچاس بسوں کا مالک بن چکا ہے اور ریلوے خسارے میں ہی ہوتا ہے۔ افسران کو صرف لال میاں سے نیلے میاں تک ہی دلچسپی ہے، پھر مجھے دکھ تو ہوگا ہی، نا---؟"

"یار، لال میاں! تم تو خاصے سمجھدار ہو---؟"

"چھوڑیں جی، سمجھدار ہوتا تو چالیس ہزار کا بانڈ بن کر "محفوظ" ہاتھوں میں ہوتا۔ اب تو "چل چل" کر تھک گیا ہوں۔"

"تم کسی شرابی زمیندار کی بات کر رہے تھے---؟"

"کیا بات کروں جی، بس کچھ نہ پوچھیں---خود پر ہزاروں لال میاں دن میں خرچ کر دینے والے یہ لوگ غریب مزارعوں کو ہماری ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ پھتو مزارعے کی بیوی سارا دن گدھی کی طرح حویلی میں کام کرتی ہے اور اسے آج کل کے دور میں چھ سو روپے ماہوار ملتے ہیں جبکہ ظالم دل بہلانے کے لئے لائی گئی لڑکی کو اگلی صبح چھ ہزار روپے ہنس کر دے دیتا ہے۔ ان ہی باتوں کی وجہ سے خدا کا قہر ٹوٹ رہا ہے اور اس مرتبہ اس کی ساری فصل امریکن سنڈی تباہ کر گئی، بچا کھچا لاہوری سنڈی لے گئی۔ اب غریب مزارعوں سے کہہ رہا ہے کہ فصل تباہ ہو گئی ہے لہٰذا تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

"لال میاں! کبھی جواریوں کے بھی ہتھے لگے؟"

"ہزاروں مرتبہ---ایک فلم ایڈیٹر تھا، اسے جوئے کا بڑا شوق تھا لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ میں ہر مرتبہ پھر اسی کے ہاتھ میں واپس آجاتا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ "شارپر" تھا۔ شارپر تاش کے پتے لگانے والے کو کہتے ہیں جو اپنی مرضی سے تقسیم کر سکتا ہے۔ وہ شیطان اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر جاتا اور اس مہارت سے کام دکھاتا کہ خود ہارتا رہتا اور دوست کو جتوا دیتا۔ ایک مرتبہ اسی دوست سے جیتے ہوئے پیسوں کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا اور دوست نے اسے چاقو مار دیا۔ اب جہنم میں بیٹھا دوسرے جواریوں کے ساتھ شارپنگ کر رہا ہوگا۔"

"سنا ہے، جوا کسی کا نہ ہوا---"

"پولیس کا تو ہوتا ہے---اب میں پولیس کے بارے میں زیادہ نہیں کہوں گا، مجھے بھی اپنی عزت پیاری ہے۔"

"پولیس تمہیں تو نہیں مارتی بلکہ پیار ہی کرتی ہے---چلو، ٹریفک پولیس کے بارے میں ہی کچھ بتا دو؟"

"کیا بتاؤں، سب کو ہی پتہ ہے۔ جب سے نیا سسٹم چلا ہے، ٹریفک کا نظام اور بہتر ہو گیا ہے۔ اب ٹریفک پولیس چالان کے ساتھ جرمانہ بھی خود کرتی ہے اور بینک دوپہر کو بند ہو جاتے ہیں---بس اب میرا منہ نہ کھلوائیں۔"

"چلو، اتنا بتا دو کہ ٹریفک پولیس کی جیب سے تم کہاں جاتے ہو؟"

"مرغ بالٹی والوں کے گلے میں---یار! آپ کسی اور کے بارے میں نہیں پوچھ سکتے، پولیس کے بارے میں کون نہیں جانتا؟ ویسے ایک بات ضرور بتانا چاہتا ہوں۔ ان کو لال میاں اتنے کم تنخواہ میں ملتے ہیں کہ آپ سن کر پریشان ہو جائیں۔"

"اچھا، یار! پولیس کو چھوڑتے ہیں، ان سے تو مجرم کے علاوہ سب

ہی ڈرتے ہیں۔"

"شاباش، یہ کی ہے عقل کی بات---ویسے تو سارے سرکاری اداروں کا یہی حال ہے اور یہ باتیں سب ہی جانتے ہیں لہٰذا آپ مجھ سے ذرا "ہٹ کر" کے سوالات کریں۔"

"ٹھیک ہے---یہ بتاؤ کہ تمہیں ہاتھ کا میل کیوں کہتے ہیں؟"

"مجھ سے پیار کی وجہ سے، جو مجھے اپنے خون سے زیادہ چاہتے ہیں، وہی یہ جملہ بولتے ہیں---اب کیسے سمجھاؤں کہ لوگوں کو الٹ بات کہنے کی عادت ہوتی ہے جیسے "جنگ" کے مشہور کالم نگار حسن "غیر سیاسی باتیں" لکھتے ہیں جبکہ وہ ساری باتیں سیاسی ہی ہوتی ہیں---کیا ہونقوں جیسا منہ بنا کر مجھے دیکھ رہے ہو، لگتا ہے کہ بات سمجھ نہیں آئی۔اچھا، ایک مثال بھی دے دیتا ہوں۔کپڑوں کے دو کانداروں کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔یہ سب بھائی ہوتے ہیں اور اپنی بہنوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ایک مرتبہ میں ایک درمیانے طبقہ کی خاتون کے ہاتھ اس طرح لگا کہ وہ روزانہ خرچے میں سے کچھ نہ کچھ بچاتی اور جب اس کے پاس مجھ سمیت چار لال میاں جمع ہو گئے تو وہ ایک کپڑے کی دوکان میں سوٹ خریدنے چلی گئی۔بھائی نے اس کو خوش آمدید کہا، بہن نے اسے بتایا کہ وہ غریب عورت ہے لہٰذا ہاتھ ذرا "ہولا" رکھے---بھائی جھٹ سے بولا کہ بہن! فکر نہ کریں۔پیسہ ہاتھ کی میل ہے، ہم نے اس کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ہم تو صرف گاہک بناتے ہیں---پھر اس بھائی نے دو سو والا سوٹ اسے چار سو میں بھیڑ دیا۔جب وہ مجھے لے کر اپنے گھر گیا تو اس کی بیوی نے اپنی ضرورت بتاتے ہوئے لال میاں طلب کیے۔اس ڈھیٹ نے بڑے پیار سے اپنی بیوی سے کہا کہ دیکھو، پیسہ ہاتھ کی میل ہوتا ہے اور میں نہیں چاہتا تم اپنے ہاتھ گندے کرو---بہت سے سرکاری اہلکار بھی ہماری اس خصوصیت کی وجہ سے ہمیں رشوت کے طور پر لیتے وقت ہاتھ نہیں لگاتے بلکہ دراز کھول دیتے ہیں۔ویسے ہاتھ کی میل سے تشبیہ ہمیں موٹر سائیکل اور کار مکینکوں نے دی ہے۔ان کے ہاتھوں پر جتنی میل چڑھتی ہے، اتنے ہی ہم ان کے پاس آتے ہیں۔اب تو آپ کی ناقص عقل میں آ گیا ہوگا کہ پیسے کو ہاتھ کا میل کیوں کہتے ہیں؟"

"آ گیا، لال میاں! آ گیا---اچھا، اب اپنے سفر کا احوال بیان کرو؟"

"ہائے، کیا بیان کروں۔میں تو ایک دن سفر بتاؤں تو آپ کتاب لکھ دیں گے۔نمونے کے طور پر اختصار سے ایک دن کی روداد سناتا ہوں---صبح نیند سے بیدار ہوا تو بیگم صاحبہ مجھے نوکر کے حوالے کرتے

پوسٹ مارٹم

✿ جرمنی کی آدھی عورتیں طلاق یافتہ ہیں۔
☆ باقی نصف غیر شادی شدہ ہیں۔
✿ بن مانس نے جرمن سیاح کے کپڑے اُتار لیے۔
☆ ڈارون کا نظریہ پڑھ لیا ہوگا۔
✿ اٹلی میں جنگلی ہرن نے توڑ پھوڑ کر کے تباہی مچا دی۔
☆ واپڈا والوں کا ستایا ہوگا۔
✿ شیخ رشید نے عوامی مسلم لیگ قائم کر لی۔
☆ مگر اس میں عوام ڈالنا بھول گئے۔
✿ الزبتھ ٹیلر نویں شادی پر تیار۔
☆ کیا شادیوں کی سلور جوبلی کرنے کا ارادہ ہے؟
✿ لوڈشیڈنگ جلد ختم ہو جائے گی۔
☆ کبھی ختم نہیں ہوگی کیونکہ تاروں کو لوڈشیڈنگ کی عادت پڑ چکی ہے۔
✿ دس سال کی عمر میں میٹرک پاس کر لیا۔
☆ تو گویا آگے چل کر یہ دُنیا کا سب سے کم عمر گریجوایٹ ہوگا جو بیروزگار ہوگا۔
✿ ممبئی کو دہشت گردوں سے پاک کر دیا گیا۔
☆ کیا ممبئی اتنی غیر محفوظ ہو گئی ہے کہ دہشت گرد بھی وہاں رہنا پسند نہیں کرتے؟
✿ چار بیویوں کا شوہر حادثے میں ہلاک۔
☆ گویا بیک وقت چار عورتیں بیوہ ہو گئیں۔
✿ ٹیلی فون کنکشن کے بغیر بل کا اجراء۔
☆ زائد اور غلط بلنگ کی مشق ہو رہی ہے۔
✿ بھارت میں دو بھائیوں نے ایک ہی خاتون سے شادی کر لی۔
☆ مہنگائی کا شاخسانہ---!
✿ چار ماہ قبل اغواء ہونے والا شاعر بازیاب۔
☆ آفرین ہے اُن ڈاکوؤں پر جنہوں نے ایک شاعر کو چار ماہ تک برداشت کیا۔
✿ ساٹھ سالہ شخص پرانی دُشمنی کی نذر ہو گیا۔
☆ کوئی بات نہیں، بندہ بھی تو پرانا تھا۔
✿ شاہ رُخ سے شادی کے لیے اُس کی بیوی کو قتل کر سکتی ہوں۔
☆ بی بی! یہ کون سی فلم کا ڈائیلاگ ہے؟
✿ ٹرین کے آگے لیٹ کر خودکشی کر لی۔
☆ گویا بغیر ٹکٹ اگلے جہان پہنچ گیا۔
✿ سفید فام جرمن جوڑے کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش۔ایک گورا، دوسرا کالا ہے۔
☆ کالوں اور گوروں کے اتحاد کا بے مثال مظاہرہ۔
✿ بھارت میں پوسٹ مارٹم سے پہلے مردہ زندہ ہو گیا۔
☆ ڈاکٹروں کی دہشت کا اثر!
✿ بڑی مچھلیوں پر ہاتھ ڈالے بغیر اَمن قائم نہیں ہو سکتا۔
☆ بڑی مچھلیاں کانٹا اور شکاری دونوں نگل جاتی ہیں اُن سے کون پنگا لے سکتا ہے؟
✿ کراچی سٹی کورٹ میں کوّا سپاہی کی ٹوپی لے اُڑا۔
☆ تو گویا چوروں کو پڑ گئے مور۔
✿ بھارت میں گائے اور بیل کی دھوم دھام سے شادی۔
☆ اِنسانوں سے تو بیل ہی اچھے رہے کہ شادی بھی ہوئی اور جشن بھی ہوا۔
✿ ملک میں اِنسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی۔
☆ حقوق ہیں ہی کہاں کہ جن کی خلاف ورزی ہوگی۔

ظفر ندیم وہرہ، حیدر آباد

ہوئے ڈبل روٹی انڈے لانے کو کہہ رہی تھیں۔ نوکر نے مجھے بیکری میں دھکا دیا اور چھٹے میں سے پانچ روپے پار کر دیئے۔ بیکری میں ایک صاحب ہرے میاں سے خریداری کو آئے اور بقایا کی صورت میں ان کی جیب میں چلا گیا۔ ان صاحب نے دفتر جاتے ہوئے مجھے پٹرول پمپ کے سپرد کر دیا، وہاں سے میں خفیہ طور پر کسی کو نذرانہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ وہ کوئی انسپکٹر تھا، وہ مجھے لے کر کئی دوسرے پٹرول پمپوں پر گیا اور میرے بھائیوں کو میرے ساتھ جمع کرتا گیا۔ لنچ کے لئے اس نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا انتخاب کیا اور وہاں جو عورت آئی، وہ ہرگز اس کی بیوی نہیں تھی۔ اس بات کا یقین مجھے یوں ہے کہ مجھے اپنی بیوی پر لوگ ضائع نہیں کرتے--- ہوٹل میں انہوں نے اپنی ضروریات سے بڑھ کر کھانے منگوائے، عورت کھاتی جاتی اور ساتھ ہی کہتی جاتی کہ میں ڈائٹنگ پر ہوں۔ ان کی مزید گفتگو میں اس لئے نہیں بتاؤں گا کیونکہ سب سنسر ہو جائے گی۔ بہر حال، بل آیا تو اس نواب کے بچے نے بس عورت کو متاثر کرنے کے لئے مجھے پورے کا پورا ٹپ میں دے دیا۔ ہوٹلوں کا دستور ہے کہ تمام ویٹروں کی ٹپ جمع کر کے بعد میں برابر تقسیم کر دی جاتی ہے لیکن اس بدبخت ویٹر نے مجھے راستے میں ہی جیب میں ڈال لیا اور کاؤنٹر پر جا کر بولا کہ بڑا ہی کمینہ شخص ہے، عورت پر ہزاروں روپے خرچ کر دیئے اور ہمیں بیس روپے بھی نہ دیئے--- اس ویٹر کی شفٹ جلد ہی ختم ہوئی تو تھوڑی دیر بعد میں ویگن میں محو سفر تھا جہاں اس کی جیب سے دوسرے کمینے کی جیب میں جاتے ہوئے میرے موڈ پر کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا۔ جیب کترے نے مجھے ایک پان سگریٹ کی دوکان پر دے مارا اور سگریٹ لے کر چلتا بنا۔ وہیں ایک ٹیکسی رکی، صاحب نے پان سگریٹ خریدے اور نیلے میاں کے بدلے کھلے میں میں ان کی جیب میں چلا گیا۔ وہ ایک پرنٹنگ پریس جا کر لڑنے لگا کہ تین چکر لگوا کر بھی ابھی تک اس کا کام نہیں ہوا۔ ٹیکسی والا اسے اس کے حال پر چھوڑ کر مجھے لے کر چلتا بنا۔ پھر ٹیکسی والے نے مجھے ٹیکسی میں بیٹھنے والی دو خواتین میں سے ایک کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ مجھے لے کر گھنٹوں بازار میں گھومتی رہی لیکن مجھے کسی کے حوالے نہ کیا، وہ شاید کسی کی گاہک بننا نہیں چاہ رہی تھی بلکہ بنانا چاہ رہی تھی۔ بالآخر اس نے مجھے چاٹ والے کے حوالے کر کے تیز مرچوں والے دہی بھلے مزے لے لے کر کھانے شروع کر دیئے۔ وہاں سے میں ایک نمازی کی شلوار کی جیب میں منتقل ہو گیا۔ وہ مجھے لے کر ظہر کی نماز پڑھنے مسجد میں چلا گیا۔ واپسی پر نمازی بھائی کی چپل ہی چوری ہو چکی تھی، بیچارے نے مجبوراً مجھے دے کر دوسری چپل خریدی۔ چپل کی دوکان میں بھی عجیب تماشے دیکھے۔ ''سیل'' لگا کر عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا تھا۔ ہائے، کیا کریں کہ عوام کو تو ہر جگہ بے وقوف بنایا جاتا ہے--- وہاں سے میں پھر ایک خاتون کے پرس میں چلا گیا۔ اس کے ساتھ اس کی جوان بیٹی تھی۔ بیٹی چاہتی تھی کہ پورا بازار ہی خرید لے اور ماں چاہتی تھی کہ اسے سیر وغیرہ تک ہی محدود رکھے۔ پھر بھی بیٹی نے آرٹیفیشل جیولری کے عوض مجھے ضائع کر ہی دیا۔ یہ جیولری تھائی لینڈ سے آتی ہے اور پچیس روپے میں پڑنے والی جیولری دوکاندار آرام سے لڑکیوں کو سو روپے میں بیچ دیتے ہیں۔ آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی جبکہ میرا تجربہ کہتا ہے کہ ہر ''سونا'' چمکنے والا نہیں ہوتا۔ سمجھا کریں، بہت سے سونے اندھیرے میں ہوتے ہیں--- وہاں سے میں ایک بڑی بی کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ ویگن میں سوار ہو گئیں اور جس اسٹاپ پر اتریں، وہاں سے گندہ مینگو ملک شیک پیا۔ مجھے افسوس بھی ہوا کہ آخر لوگ بس اسٹاپ پر ''مٹی'' شیک کیوں پیتے ہیں۔ خیر، وہاں مجھے خرچ کرنے کی نوبت نہ آئی اور ہرے منے سے ہی کام چل گیا۔ وہ جیسے ہی گھر پہنچیں، ان کا بیٹا میری طلب میں کھڑا تھا اور بہانہ یہ تھا کہ موٹر سائیکل خراب ہے لہٰذا میری ضرورت ہے۔ ماں سے لڑ جھگڑ کر اس نے مجھے لیا اور اسی خراب موٹر سائیکل پر اپنے دوست کو لے کر ''جوا'' کھیلنے چلا گیا جہاں مجھے ہار کر واپس آیا۔ وہیں میں کسی دوسرے جواری کے ہاتھ لگ گیا جو مجھے لے کر سیدھا بھنگیوں کی بستی میں چلا گیا اور میرے ساتھ ہرے میاں کو جوڑ کر ''واٹ ون'' کی بوتل لے کر چلتا بنا۔ بھنگی مجھے لے کر بھاگتا ہوا ایک فائیو اسٹار ہوٹل گیا اور پرمٹ پر مجھے اور میرے بھائیوں کو دے کر دو بوتلیں لے کر مزید گاہکوں کو بلیک کرنے چلا گیا۔ وہاں سے میں ایکسائز انسپکٹر کی جیب میں منتقل ہو گیا جس نے کچھ ہی دیر بعد مجھے بھیجے پائے والے کی نذر کر دیا۔ اب میں ایک ایسے شخص کے ہاتھ لگا جس نے گھر جا کر بیوی سے کہا کہ آج کھانے کا موڈ نہیں۔ طبیعت بوجھل ہے، ٹینڈے تم ہی کھا لو۔ اس نے بیوی سے اس رات بہت ہی زیادہ جھوٹ بولے۔ بہر حال، وہ کم بخت تو نہ سویا لیکن میں سو گیا--- بس اختصار کے ساتھ یہ ایک دن کی داستان ہے اور اس طرح کی سینکڑوں داستانیں ہیں--- کیا آپ کو نیند آ رہی ہے؟''

''ہاں بھئی، اب سونا چاہئے لیکن کل تم سے مزید باتیں ہوں گی۔ اب یہ بتاؤ کہ تم اے۔ سی میں سونا پسند کرو گے یا دراز میں---؟''

''دراز میں--- میں اپنی عادتیں زیادہ خراب نہیں کرنا چاہتا، ہر قسم کے موسم کو برداشت کرنا چاہئے--- کیا آپ بجلی چوری کرتے ہیں؟''

''نہیں، بھئی---''

''آپ اسمگلر ہیں---؟''

''نہیں---''

''راشی افسر ہیں---؟''

''بالکل نہیں---''

''پھر بھی آپ اے۔ سی چلا لیتے ہیں؟---مجھے پتہ ہے کہ اب آپ لاجواب ہو جائیں گے لہٰذا میں ہی چپ کر جاتا ہوں---اچھا، گڈ نائٹ---!''

''گڈ نائٹ---!''

لال میاں کو دراز میں بند کیا، خاصی دیر اس کی باتوں پر غور کرتے رہے اور پھر نیند کی دیوی ہم پر مہربان ہو گئی۔

دوسرے دن لال میاں نے ہم سے وعدہ لیا کہ ہم انہیں خرچ نہیں کریں گے اور ہم نے اسے بتایا کہ ہم اسے لاکھ روپے کے بدلے بھی کسی کو نہ دیں گے۔ ہم نے اسے علیحدہ سے فولڈ کر کے بٹوے میں رکھ لیا اور طے یہ ہوا کہ شام کو کہیں آرام سے بیٹھ کر اس کا انٹرویو لیا جائے گا، ابھی ہم اس سے بہت کچھ جاننا چاہ رہے تھے۔ فرصت پھر رات کو ہی ملی اور لال میاں کو بٹوے سے نکالا تو وہ کچھ خفا خفا سے تھے۔

''کیوں، لال میاں! کچھ خفا خفا سے دکھ رہے ہو؟''

''میں تو بور ہو گیا---میری تو آپ نے آزادی ہی سلب کر لی، اس سے بہتر تو تھا کہ میں ''چلتا'' رہتا۔''

''یار! ناراض نہ ہو---دراصل تم سے آرام سے باتیں کرنے میں مزا آتا ہے---''

''تو پھر کریں نا! باتیں---میں بھی یہی چاہ رہا ہوں۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کہ تمہیں رنگ کون سا اچھا لگتا ہے؟''

''ہرا---''

''وہ کیوں---؟''

''اس لئے نہیں کہ یہ میرے بڑے بھائی 500 کے نوٹ کا رنگ ہے بلکہ اس لئے کہ یہ میرے باپ کا رنگ ہے۔''

''یعنی کون---؟''

''ڈالر، جناب! ڈالر---ہماری تو قدر و قیمت بھی اس سے ہی منسلک ہے جو روز بہ روز کم ہوتی جا رہی ہے۔''

''اگر تم لال میاں، یعنی 100 کا نوٹ نہ ہوتے تو کیا بننا پسند کرتے؟''

''آپ کو کیا ہو گیا ہے---ظاہر ہے کہ ڈالر اور کیا؟''

''آخر ڈالر ہی کیوں---؟''

''جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا بلکہ آپ بھی پیدا نہیں ہوئے تھے، اس وقت بھی ایک ڈالر میں ایک ہی ڈالر آتا تھا، آیا کچھ عقل شریف میں؟---فرنچ فرانک بدل گیا، جرمن مارک بدل گیا، اسپین کا پیسو بدل گیا، اٹلی کا لیرا بدل گیا لیکن کیا کبھی ڈالر بدلا---؟''

''یار! تم تو خاصے سمجھدار ہو---''

''محترم! میں تو جس کے پاس پہنچ جاؤں وہ عقلمند ہو جاتا ہے، میں بے وقوف کیسے ہو سکتا ہوں۔''

''کوئی ایسا بھی ہے کہ جس کے پاس تم جاؤ اور وہ پھر بھی خوش نہ ہو؟''

''ایک نہیں، سو ہیں۔ ایک رکشے والا، دوسرا قلی---ایسے کسی بھی مزدور سے مزدوری طے کئے بغیر کام کروا کر پھر چاہے جتنے لال میاں دے دیں، وہ خوشی کا اظہار نہیں کرے گا---اور ہاں، بڑے افسران بھی مجھے پا کر خوش نہیں ہوتے۔ انہیں صرف نیلے میاں ہی بھاتے ہیں

عید کے تکے

تین جوڑے

عید کے بعد شادیاں ہوں گی
دن ہیں کپڑے بھی بنانے کے
مائیوں' مہندی اور پھر شادی
تین جوڑے تو ہوں ٹھکانے کے

صبح عید

سویاں کھیر کھا کر جائیں گے سب عید گاہوں کو
نئے کپڑے پہن کر لوگ جو بن ٹھن کے بیٹھے ہیں
ہماری اہلیہ نے دے دیئے اس کو سب جوڑے
کہ صبحِ عید عاصی در پہ ہم دھوبن کے بیٹھے ہیں

بھول جاتے ہیں

ہے دونوں بیویوں کا مرتبہ یکساں نگاہوں میں
غلط الزام ہے ہم پر کہ شوہر بھول جاتے ہیں
مگر جب عید آ جاتی ہے تو شاپنگ کے ڈر سے
پرانی والی کو میکے میں اکثر بھول جاتے ہیں

✿ مرزا عاصی اختر' میرپور خاص

اور انہیں کو وہ چاہتے ہیں۔"

"تمہیں دکھ کب ہوتا ہے؟"

"جب افراطِ زر، یعنی میری قدر کم ہوتی ہے یا مجھے دے کر گھوڑوں کو مربے کھلائے جائیں، اس وقت بھی مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"تمہیں خوشی کب ہوتی ہے؟"

"جب میں کسی کے پاس رزق حلال بن کر جاؤں، اس وقت---"

"تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے---؟"

"مجھے ہوا پسند ہے۔"

"تمہیں غصہ کب آتا ہے؟"

"جب مجھے کوئی رشوت میں کسی کو دے اور راشی آگے سے بولے کہ اسے اپنے پاس ہی رکھو، میں کوئی بھکاری نہیں ہوں حالانکہ سالا بھکاری سے بدتر ہوتا ہے---ہاں، بھکاری سے یاد آیا کہ میں نے ایسے بھی بھکاری دیکھے ہیں جن کے پاس لاکھوں ہوتے ہیں لیکن مرتے فٹ پاتھ پر ہی ہیں۔ میرے خیال میں تو بھکاری پر بھی انکم ٹیکس لگ جانا چاہئے۔"

"چھوڑو، یار! کیا باتیں لے بیٹھے ہو---"

"یہی تو مسئلہ ہے، سچی باتیں کڑوی ہوتی ہیں اور کڑوی بات کوئی پسند نہیں کرتا۔"

"تمہیں سفر پسند ہے---؟"

"کون سا---انگلش کا یا اردو کا---؟"

"بھئی اردو کا، وہ بھی لمبا سفر---؟"

"بہت زیادہ پسند ہے، خوب انجوائے کرتا ہوں۔ لاہور سے جب لوگ گرمیوں میں مجھے مری لے کر جاتے ہیں تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہوتا۔"

"تمہیں عورتیں کیسی پسند ہیں---؟"

"انتہائی کنجوس عورتیں پسند ہیں کیونکہ مجھے ان کی قربت زیادہ دیر کے لئے ملتی ہے۔"

"ویسے تمہیں عام لوگوں میں کون زیادہ پسند ہے، مرد یا عورت---؟"

"بچے---ان میں طمع نہیں ہوتی۔"

"کس کرنسی کو دیکھ کر تمہیں خوشی ہوتی ہے؟"

افغانی---آج بھی ایک لال میاں کے بدلے گیارہ سو ملتے ہیں۔"

"کبھی افغانستان تو گئے ہو گے---؟"

"ہاں، ہزاروں بار گیا ہوں۔ وہاں تو میں ایسے ہی چلتا ہوں جیسے پاکستان میں ہوں۔"

"پھر واپس کیوں آجاتے ہو؟"

"مجبوری ہے---دراصل جن افغان مہاجروں کو زبردستی بھیجا جاتا ہے، انہیں ڈالر دیئے جاتے ہیں۔ وہ ایک دن کے لئے افغانستان جاتے ہیں، ڈالر تبدیل کرتے ہیں اور اگلے ہی دن مجھے لے کر پھر پاکستان آجاتے ہیں۔"

"لال میاں! تم فلمی دنیا میں بھی گھومے پھرے ہو گے، ان کی کچھ باتیں تو بتاؤ؟"

"توبہ کریں، وہاں تو ماں بچوں کو بھی میری وجہ سے ہی اہمیت دیتی ہے۔ "باپ بڑا نہ بھیا، سب سے بڑا روپیہ" کی مثل سب سے زیادہ وہیں صادق آتی ہے۔ وہاں تو منہ لال کرنے کے لئے بھی لال میاں کی ہر دم ضرورت رہتی ہے---ویسے اس لال رنگ میں بڑا دم ہوتا ہے۔ خون تو خیر اب سفید ہو چکا ہے مگر ہونٹوں کی لالی سے لے کر میری لالی تک اب لال رنگ ہی چھا گیا ہے۔ اب وہ مثال بھی تبدیل ہو گئی کہ ساون کے اندھے کو ہرا ہی سوجھتا ہے۔ اب مثال ہو گی کہ عقل کے اندھوں کو لال ہی لال سوجھتا ہے---اگرچہ میں لال ہوں لیکن فلمی دنیا میں زیادہ بلیک ہی ہوتا ہوں۔ خام فلم بلیک میں، ہیروئن کی ماں کو بلیک دینا پڑتا ہے، ہیرو بلیک کرتے ہیں، الغرض ہر طرف بلیک ہی بلیک ہے۔ فلم پروسیسنگ میٹریل سے لے کر سینما کے ٹکٹ تک بلیک ہوتے ہیں۔"

"یار، لال میاں! اکثر لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری ہیروئن کتنے پیسے لیتی ہے؟"

"کس بات کے---؟"

"بھئی، فلم میں کام کرنے کے، اور کس بات کے---؟"

"آپ تو بڑے بھولے ہیں---بہرحال، فلم انڈسٹری میں لڑکی اس وقت تک داؤ پر لگی رہتی ہے جب تک وہ ہیروئن نہ بن جائے اور جب وہ ہیروئن بن جائے تو پھر وہ داؤ لگاتی ہے اور راتوں رات اسے بنگلہ اور کار بھی مل سکتی ہے---آپ ہیروئن کیوں نہیں بن جاتے؟"

"لال میاں! لگتا ہے، اب تم بہکنے لگے ہو---شاید نیند کا غلبہ ہے؟"

"نہیں، جناب! سائنسی دور ہے اور کوئی کام مشکل نہیں۔ سنگاپور کی بوگی اسٹریٹ چلے جائیں اور جس پیدائش کی ہیروئن بننا چاہیں، بن

جائیں۔"

"ارے، کیا تم کبھی سنگاپور بھی گئے ہو---؟"

"اتفاقاً ایک عیاش پاکستانی کی جیب میں چلا گیا تھا۔ ویسے سنگاپور سے آئے ہوئے کسی بھائی سے پوچھ دیکھیں کہ کیا وہ بوگی اسٹریٹ گیا تھا، پھر اس کے چہرے پر شرمندگی دیکھیں۔ اکثر لوگ وہاں سے بڑے "دھوکے" کھا کر آتے ہیں۔"

"یار، لالو---"

"زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"اچھا، محترم لال میاں! کبھی بحری جہاز کا سفر کیا ہے؟"

"نہیں، سفر نہیں کیا بلکہ سیر بہت کی ہے۔ جب کیماڑی کراچی پر غیر ملکی جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں تو وہاں بارٹر سسٹم چلتا ہے، یعنی مال کے بدلے مال۔ انہیں چکروں میں بہت مرتبہ جہاز کی سیر کی۔ یہ ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے---کیا آپ نے بحری جہاز کا سفر کیا ہے؟"

"لال میاں! ہم بفضل خدا ہر وہ کام کر چکے ہیں جس کی لوگ حسرت رکھتے ہیں۔"

"اوہ، تو آپ خودکشی بھی کر چکے ہیں؟"

"تم اکثر لکھاریوں کے پاس بھی رہے ہو گے؟"

"اگر لکھاریوں سے مراد لفافے ہیں تو ان کے پاس تو بہت رہا ہوں اور اگر مراد ڈائجسٹوں اور رسالوں میں لکھنے والوں سے ہے تو ان کے پاس میرا کم از کم ہی آنا جانا ہے، اگر کبھی گیا بھی تو قرضے کی صورت میں---"

"قرضے سے یاد آیا، تم بنکوں میں قرضے کی صورت بھی تو چلتے ہو؟"

"صرف امیروں کے لئے جو مجھے ہی دے کر مجھے لے لیتے ہیں۔ مزے کی ایک بات بتاؤں، باقی اندازہ آپ خود لگا لیجئے گا---ایک زمیندار اپنی ایک ہی زمین پر پانچ مرتبہ قرض لے چکا تھا بلکہ تین مرتبہ تو معاف بھی کروا چکا تھا۔ احتسابیوں کے ہاتھ چڑھا تو جانتے ہیں، کیا معلوم پڑا؟---وہ زمین جس پر وہ قرضے لئے جا رہا تھا، بیس سال پہلے وہ اسے فروخت کر چکا تھا۔"

"پہلے سفر کی بات ہو رہی تھی---تمہیں ٹرین کا سفر کیسا لگتا ہے؟"

"اے۔سی کلاس ہو تو سفر بلکہ عمدہ سفر، اکانومی کلاس ہو تو نرا "Suffer"---اس پر زیادہ نہ بولوں گا، مجھے علم ہے کہ آپ ٹرین پر پورا مضمون لکھ چکے ہیں۔"

"چلو، ویگن یا سوزوکی پک اپ کے سفر کے بارے میں بتا دو؟"

"میں سوزوکی میں سفر کر کے تو بہت خوش ہوتا ہوں کہ ہم کتنے ماڈرن ہو گئے ہیں۔ تنگ سی جگہ میں مرد عورتوں کو سوار کیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے سے بدن ہزاروں مرتبہ ٹکراتے ہیں، اعتراض عورتوں کو بھی نہیں ہوتا پھر مجھے کیوں ہو۔"

"سیر گاہوں کی سناؤ---؟"

"ہمارے ہاں صحت کے لئے سیر کم ہی ہوتی ہے، نظر بازی کے لئے زیادہ ہوتی ہے اور اکا دکا جوڑا کسی درخت کے نیچے بیٹھا بھی ہو تو پولیس کو فحش حرکات کرتا نظر آتا ہے۔ ان سے نکاح نامہ طلب کیا جاتا

شغل + مغل

✿ مرد کا دِل ایک پنجرہ ہے جس میں جتنی بھی لڑکیاں قید ہوں' پھر بھی کافی گنجائش ہوتی ہے---نازیہ ناز نازی

☆ گنجائش پیدا کرنے والیاں جو جا بجا مل جاتی ہیں۔

✿ پاکستانیوں کو اِن شاء اللہ جنت ملے گی' اپنے حصے کا جہنم تو اِنہوں نے یہیں کاٹ لیا ہے---شاہد اطہر

☆ بھائی جی! پاکستانی کے بجائے شوہر کہیں۔

✿ ڈاکٹری مشورہ---خوش رہا کریں لیکن اِس کی کوئی دوا بھی تو دو---شاہد اطہر

☆ خوش رہنے کی دوا' صرف کنوارہ پن میں ہی ہے۔

✿ بیویو! اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے شوہر راہِ راست پر آ جائیں تو اپنی زبان بند اور آنکھیں کھلی رکھو---انشرہ برجیس

☆ بیویاں اور زبان بند رکھیں' ناممکن!

✿ سارے مرد بے وقوف نہیں ہوتے' بس چند شادی کر لیتے ہیں---مسٹر ڈبلاس

☆ ہماری طرف سے بھی آپ کو شادی مبارک ہو۔

✿ حیرت انگیز بات---مرد اپنی بے وقوفی کو بھی "مردانگی" کا نام دیتا ہے---نازیہ ناز نازی

☆ یہاں بے وقوفی سے مراد شادی ہی ہے' نا!

✿ بیوی---ٹینشن کا دوسرا نام---محمد عباس

☆ اور پہلا بھی۔

✿ دُنیا کے چالیس فیصد مرد آدھے پاگل ہوتے جبکہ ساٹھ فیصد پورے پاگل ہوتے ہیں---گلشن فاطمہ

☆ ساٹھ فیصد شادی جو کر لیتے ہیں۔

✿ اگر لڑکوں کا بس چلے تو یہ لڑکیوں کو کالج سے گھر کے باہر کے بجائے گھر کے اندر تک چھوڑ آئیں---نایاب چوہدری

☆ لڑکوں میں جذبہ اِنسانی کا اِک اور منہ بولتا ثبوت!

✿ ایک شیمپو بنانے والی کمپنی نے اشتہار کے لیے لڑکی کے بجائے لڑکے کو پسند کر لیا---نازیہ ناز نازی

☆ اَب تو مان لیجئے کہ لڑکیوں کی نسبت لڑکے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔

✿ مرد شادی سے پہلے مہربان اور بعد میں پورا شیطان---نازیہ ناز نازی

☆ شادی کے بعد گھر میں جو شیطان کی خالہ آ جاتی ہے' صحبت کا اثر ہو جاتا ہے' نا!

محمد صابر مغل عبدوپوری

ہے، لال میاں پاس ہو تو جان خلاصی ہوتی ہے اور اگر نہ ہو تو سیر کرنے والوں کی سیریں ہوتی ہیں۔"

"آج کل تو تم صرف کھانے پینے کے کاروبار میں ملوث نظر آتے ہو؟"

"جب دوسرے کاروبار ٹھنڈے ہوں گے تو میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟---میری ضرورت دو کاموں بلکہ کاروباروں میں ہی رہ گئی ہے۔ کھاؤ پیو، بیمار ہو اور پھر دوائیں کھاؤ۔ نوے فیصد بیماریاں بازاری یا خراب کھانوں سے ہوتی ہیں۔ آج کل میں یا تو بھیجے کے پائے جیسی جگہوں پر پایا جاتا ہوں یا پھر ڈاکٹروں کے دراز میں، دونوں ہی جگہ ملاوٹ ہی ملاوٹ ہے۔"

"لال میاں! تم تو بہت گھومتے پھرتے ہو، ہمارے ملک میں صحت کا معیار کیسا ہے؟"

"خدا کی پناہ! میں نے ایک گھر---جی ہاں، ایک بھی گھر ایسا نہیں دیکھا جہاں کوئی نہ کوئی بیماری نہ ہو۔ ہر گھر میں ایک بیمار ضرور ہے یا ایک "بیماری"---پہلے چالیس سالہ جوان اکٹھے بیٹھتے تھے تو گفتگو ہوتی تھی کہ فلاں بہت حسین ہے، فلاں کے کیا کہنے، اس کا فگر تو بس قیامت ہے۔ آج کل یہی چالیس سالہ بوڑھے گفتگو کریں گے تو یہی کہ میری کمر میں درد رہتا ہے، مجھے شوگر ہو گئی ہے، بلڈ پریشر نے تنگ کر رکھا ہے، یورک ایسڈ کی وجہ سے گوشت منع ہو گیا ہے---اب آپ ہی سوچیں کہ اس بیمار قوم کا مستقبل بھی بیمار ہو گا یا نہیں؟---لڑکیوں کے قد دیکھ کر ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا مستقبل کتنا "چھوٹا" ہو گا۔"

"تم مستقبل کی بات کر رہے ہو، ہم تو حال سے بے حال ہو رہے ہیں---ویسے صحت کسی بھی قوم کے لئے سب سے ضروری ہے۔"

"بالکل---اب دیکھیں کہ ایک حکومت نے IMF سے کراچی زیر زمین ریلوے کے لئے کھربوں روپے قرض مانگا تو پتہ ہے، انہوں نے کیا جواب دیا؟ انہوں نے کہا کہ پہلے عوام کے لئے پینے کا صاف پانی تو فراہم کر لو، زیر زمین ریل گاڑیاں بعد میں چلانا۔"

"یار! اس ملک میں شعور ہے ہی کہاں، بس ذاتی پسند اور نہ پسند پر فیصلے ہوتے ہیں یا پھر تمہارے عمل دخل سے فیصلے ہوتے ہیں---سیاست دانوں کے پاس رہنے کا بھی تجربہ ہوا ہو گا؟"

"لو، یہ کیا بات ہوئی، میں سب سے زیادہ رہتا ہی ان کے پاس ہوں۔ لوٹے بنتے ہی میری وجہ سے ہیں، ضمیر فروخت میری وجہ سے ہوتے ہیں، انسانیت نیلام میری وجہ سے ہوتی ہے۔"

"یار! تم تو بڑی ثقیل باتیں کرنے لگے ہو---میرا خیال ہے، اب ہمیں سو جانا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے---آپ کی "بے غم" بھی ڈسٹرب ہو رہی ہیں۔ بس ایک گزارش ہے کہ مجھے سنبھال کر رکھئے گا، آپ سے باتیں کر کے مجھے بھی مزہ آ رہا ہے۔"

"ارے، تم تو ایسی چیز ہو جسے کھونے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا---اچھا اب سو جاؤ، گڈ نائٹ!"

"گڈ نائٹ---سنیں، اس "گڈ نائٹ" کو اردو میں کیا کہتے ہیں؟"

"شب بخیر---"

"پھر شب بخیر بولا کریں، نا---!"

"ارے، یار! ایک ہی بات ہے---مادری زبان میں نہ بولا تو فادری زبان میں بول دیا۔"

اگلے دن لال میاں کو اپنے دراز میں ہی چھوڑا مبادا بٹوے میں ان کا موڈ خراب نہ ہو جائے۔ دن بھر کی مصروفیات سے فارغ ہو کر گھر پہنچے تو لال میاں آرام سے سو رہے تھے۔

"ہیلو---ہیلو، لال میاں---!" ہم نے انہیں اٹھانا چاہا۔

"اونہہ---کیا بات ہے؟"

"بھئی، ہم آ گئے ہیں، اٹھو تا کہ گپ بازی کریں۔"

"مجھے تو آپ نے آرام طلب بنا دیا ہے، دل چاہتا ہے کہ آرام سے سوتا رہوں۔"

"زیادہ آرام طلبی کی تو تمہیں شوگر ہو جائے گی، ذرا حرکت میں رہا کرو۔"

"یہ سامنے اخبار میں ڈاکوؤں کی کیا خبر ہے؟"

"کون سی---یہ سرکاری اہلکار والی، ڈاکٹر والی یا پولیس والی---؟"

"وہ سامنے، ڈاکوؤں والی---"

"ارے بھئی، کوئی خاص نہیں---اندرون سندھ میں کوئی بس لوٹی ہے۔"

"کیا اس میں سید نہیں تھے---؟"

"کیا مطلب، سید سے ڈاکوؤں کا کیا تعلق---؟"

"ایک تو آپ کی معلومات بہت کم ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ مضامین کیسے لکھ لیتے ہیں۔ لگتا ہے، لکھاری آپ کی "بے غم" ہیں جو آپ کے نام سے بھی لکھتی رہتی ہیں۔"

"یار! پردہ پڑا ہے تو پڑا رہنے دو، گھر کا بھیدی کیوں لنکا ڈھا رہا

ہے---تم کسی سیّد اور ڈاکو کی بات کر رہے تھے؟"

"سندھ میں جب بھی ڈاکو کسی بس پر حملہ کرتے تو وہ ہمیشہ عورتوں، بچوں اور سیّدوں کو چھوڑ دیتے۔ ان ڈاکوؤں کے لئے اتنا ہی بہت تھا کہ کوئی زبان سے بول دے، میں سیّد ہوں۔ آہستہ آہستہ زبانی سیّدوں کی تعداد بڑھنے لگی تو انہوں نے شناختی کارڈ چیک کرنے شروع کر دیئے۔ یار لوگوں نے شناختی کارڈوں پر بھی سیّد لکھوانا شروع کر دیا، حد تو یہ ہوگئی 80% سیّد ہی بسوں میں سفر کرتے ہوئے پائے گئے۔ پھر کسی سیانے ڈاکو کی عقل شریف میں کچھ آیا تو اس نے شناختی کارڈ والے سیّدوں کو لوٹنا شروع کر دیا، باقیوں کو چھوڑ دیا کرے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم اپنے باپ دادا کی روایات کے خلاف کیوں کر رہے ہو تو اس نے صاف سا جواب دیا کہ جعلی سیّد مجھ سے بڑے ڈاکو ہیں، انہیں ہرگز معاف نہیں کیا جاسکتا۔"

"تم کسی ڈاکو کے گھر بھی کبھی گئے ہو---؟"

"ہاں، اس کے گھر کی حالت عجیب ہوتی ہے۔ مٹی کے بنے ہوئے گھر میں زروجواہر کے باوجود ٹوٹی چارپائی ہوتی ہے۔ گھڑیوں کا انبار ہوتا ہے لیکن اس کی اپنی اوقات نہیں ہوتی۔ گھر سے جب ڈاکہ مارنے جاتا ہے تو بیوی کہتی ہے کہ بچے کے کھلونے ٹوٹ گئے ہیں، دو چار موبائل فون چھین لانا اور ہاں، کئی دنوں سے اچھا زیور نہیں لائے، بیٹی نے گڑیا کی شادی کرنی ہے۔ منرل واٹر کی بوتلیں بھی لیتے آنا، میں کئی دن سے نہائی نہیں اور کنوئیں کے پانی سے تو جلد ہی خراب ہو جاتی ہے اور ٹیشو پیپر سے تو چھوٹا ناک بھی صاف نہیں کرواتا---بس اس قسم کی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔"

"تمہیں تو مولویوں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقعہ بھی ملا ہو گا؟"

"دیکھیں، جناب! ڈاکو تو ڈاکو ہی ہوتے ہیں لیکن مولوی تو کئی قسم کے ہوتے ہیں، آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟"

"لال میاں! کیا تفرقہ پھیلا رہے ہو؟"

"میں پھیلا رہا ہوں---حد کرتے ہیں آپ؟"

"اچھا، کسی اور کے بارے میں بات کرتے ہیں---"

"یہ بہتر رہے گا---"

"تمہیں خوشبو کون سی اچھی لگتی ہے---؟"

"اپنی ہی---جب میں نیا ہوتا ہوں، اس وقت میری مہک کے کیا کہنے---اپنے علاوہ مجھے جو خوشبوئیں پسند ہیں، ان میں پٹرول، سونا اور نوزائیدہ بچوں کے بدن کی خوشبو شامل ہے۔"

"تمہیں جانور کون سے پسند ہیں؟"

"دیمک کے علاوہ سب ہی---دیمک کم بخت تو مجھے کھا جاتی ہے۔"

"تمہیں بدبو کون سی زیادہ ناگوار گزرتی ہے؟"

"انسانی جسم و پسینے کی---انسان بہت گندے ہیں۔ اگر آرٹی فیشل اشیاء ان سے دور کر دی جائیں تو ان میں اتنی بدبو پھیل جائے کہ عام جانور ان کے پاس پھٹکیں بھی نہیں اور اگر صابن ایجاد نہ ہوا ہوتا تو دنیا کی آبادی آدھی بھی نہ ہوتی۔"

"کوئی ایک واقعہ سناؤ جو تمہاری وجہ سے پیش آیا ہو اور باعث عبرت بھی ہو؟"

"ہزاروں بلکہ لاکھوں واقعات ہیں لیکن آپ کے فرمان پر ایک سنا دیتا ہوں---ان دنوں میں کراچی میں ہوا کرتا تھا، ایک مشہور دماغی سرجن، یعنی نیوروسرجن ہوا کرتے تھے اور وہ مجھ سے بہت بلکہ بہت ہی زیادہ پیار کرتے تھے۔ اگر کوئی روڈ ایکسیڈنٹ کا واقعہ بھی ایمرجنسی میں آجائے تو وہ پہلے نوٹ مانگتے اور مریض کو اس وقت تک ہاتھ نہ لگاتے جب تک میرے کئی بڑے نوٹ ان کی جیب میں نہ آجائیں۔ ایک مرتبہ اسی طرح کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ ان کے پاس لایا گیا۔ اس کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب عادت پہلے نوٹ طلب کئے، لوگوں نے بتایا کہ وہ تو مضروب کو انسانی ہمدردی کے تحت اٹھا لائے ہیں لہٰذا مہربانی کی جائے، بعد میں اس کے لواحقین کو تلاش کر کے ان کا ایک ایک روپیہ ادا کر دیا جائے گا۔ سرجن صاحب نے تو نہ ماننا تھا، نہ مانے اور اس طرح وہ مضروب درد سے تڑپتا ہوا خالق حقیقی سے جا ملا۔ انہیں لوگوں نے مضروب کے والدین کو تلاش کرنا شروع کیا اور جلد ہی پتہ چل گیا کہ وہ بے چارہ مضروب جواب مرحوم ہو چکا تھا، اسی سرجن کا اکلوتا بیٹا تھا۔"

شب بیداری اور خاندانی منصوبہ بندی

ایک شاعر کہہ رہے تھے رات بھر جاگا کرو
اور لمبی تان کر ہر روز تم سویا کرو
کیسے ہو منصوبہ بندی' بولیں بیگم شیخ کی
کہہ رہے ہیں شیخ جی' پیدا کرو' پیدا کرو

تنویر پھول' نیویارک
tanwirphool@gmail.com

اللہ معاف کرے، تمہاری وجہ سے کیا کیا ہوتا ہے، لال میاں! تم نے تو دکھی کر دیا---اچھا یہ بتاؤ کہ اس تیزی سے مہنگائی بڑھ رہی ہے، پھر لوگ گزارا کیسے کر رہے ہیں؟"

"یہ ایک سائیکل ہے---وہ سائیکل نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ حالات و واقعات کا چکر ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کے ہتھے جو مریض چڑھا، وہ الیکٹریشن تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ٹیکہ لگا دیا۔ پھر ڈاکٹر ایک موٹر مکینک کے پاس گیا، وہاں مکینک نے اس سے رقم جھاڑ کر اپنا حساب برابر کیا۔ اسی لمحے وکیل صاحب کی کار آ گئی اور انہوں نے قانون کو رام کرنے کی بات کر کے مکینک کو لوٹ لیا۔ پھر وکیل کو دوکاندار نے گاہک بنا کر لوٹا۔ اس دوکاندار کو ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا اور یوں اسی ڈاکٹر نے اپنی رقم واپس حاصل کر لی۔ بس یہ سائیکل ہے اور اسی طرح لوگ گزارا کر رہے ہیں۔"

"لال میاں! تم نے خواتین کے ساتھ بھی بہت وقت گزارا ہو گا، کچھ ان کے بارے میں بھی بتاؤ؟"

"محترم! ہمارا معاشرہ جس قسم کا ہے اس میں 97% خواتین مردوں کی کمائی پر ہی انحصار کرتی ہیں۔ نیلے میاں، ہرے میاں اور لال میاں ان کے ہاتھوں میں گھر کا خرچ چلانے کے لئے آتے ہیں اور ساتھ میں لاتے ہیں ٹینشن---بہر حال، عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ سمجھداری سے ہمیں خرچ کرتی ہیں۔ ان کے ذاتی خرچے مردوں کی طرح باہر کے کھانے یا پان سگریٹ نہیں ہوتے بلکہ کپڑا، زیور، میک اپ ہوتے ہیں۔ چند عورتیں جو خود کماتی ہیں، ان میں میری وجہ سے بہت کانفیڈنس آ جاتا ہے۔ وہ خواتین جو کسی مجبوری کی وجہ سے مجھے حاصل کرنے نکلتی ہیں، ان کے پاس عظمت ہوتی ہی نہیں لہٰذا میں سلام بھی نہیں کر سکتا---ویسے خواتین کم لالچی ہوتی ہیں، رشوت بھی لاکھ میں سے چند ہی لیتی ہوں گی البتہ لیڈی ڈاکٹر مردوں کی طرح ہی لوٹتی ہیں۔"

"لال میاں! تمہیں سیاست دان بنا دیا جائے تو کیا کرو گے؟"

"وہی جو دوسرے سیاست دان کرتے ہیں---اپنے ہم جنسوں کے انبار لگا دوں گا۔"

"تمہیں بُرا کیا لگتا ہے؟"

"جب کوئی مجھ پر لکھ دے---افسوس کی بات تو یہ ہے کہ مجھ پر زیادہ تر پڑھے لکھے بینک والے ہی لکھتے ہیں اور انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں---یہاں بھی ڈالر ہمیں مار دے گیا۔ کبھی ڈالر پر ایک لفظ بھی لکھ دیں، ساری دنیا میں قبول نہیں کیا جاتا لہٰذا اسے گندا کرنے کی ہمت ہی کسی میں نہیں۔ ہمارے اوپر تو اشعار تک لکھ دیئے جاتے ہیں---یہ قوم کب سدھرے گی؟"

"کبھی نہیں---یار، لال میاں! نیند آ رہی ہے۔ اب سونا چاہئے۔ چلو آج کی آخری بات، تمہاری خواہش کیا ہے؟"

"یہی کہ میری قدر بڑھ جائے، میرے بدلے کم از کم دو چار ڈالر تو ہوں۔ لوگ مجھے رشتوں ناتوں سے بڑھ کر نہ چاہیں، مجھے خدا نہ مانیں۔ میں لوگوں کی ضروریات پوری کروں، ان کی ضرورت ہی نہ بن جاؤں۔ مجھے خون سے بڑھ کر نہ سمجھا جائے، میری پرستش نہ کی جائے۔ میرے لئے ضمیر نیلام نہ ہوں، جسم نیلام نہ ہوں---"

"بہت خوب، لال میاں! چلو اب سوئیں، گڈ نائٹ---میرا مطلب ہے، شب بخیر!"

"شب بخیر---کل میں آپ کو بہت سے دلچسپ واقعات سناؤں گا، ایسی ایسی باتیں بتاؤں گا جو آپ نے پہلے کبھی نہ سنی ہوں گی بلکہ کچھ رازوں سے پردے بھی اٹھاؤں گا۔"

"بہت خوب---پھر تو میں کل جلد گھر آ جاؤں گا---اچھا، شب بخیر!"

"شب بخیر---!"

اگلے دن تجسس نے کام میں جی بھی نہ لگنے دیا۔ بھاگم بھاگ گھر پہنچے اور جلد ہی ڈنر وغیرہ سے فراغت پائی تاکہ لال میاں سے فائنل راؤنڈ ہو جائے۔ پھر اسے لاکر میں رکھ دیں گے تاکہ وہ محفوظ رہ سکے، ایسا نایاب نوٹ تو کسی قیمت پر نہیں مل سکتا، نا!---سب تیاری کر کے دراز کھولا تو لال میاں غائب تھے۔ پریشان ہو گئے، پورا دراز الٹ دیا لیکن ان کا نام و نشان نہ تھا۔ "بے غم" کو آواز دی۔

کیا ہو گیا، کیوں چلا رہے ہیں---؟"

"یہ لال میاں کہاں گئے---؟"

"کیا لال میاں---کون لال میاں؟"

"ارے، یہ جو میری ذاتی دراز میں سو کا نوٹ پڑا تھا؟"

"میرے پاس چینج نہیں تھا، آٹا ختم ہو گیا تو وہ منگوا لیا ہے---"

"غضب ہو گیا---ارے، وہ بولنے والا نوٹ تھا---"

"زیادہ جاگنے سے آپ کے ذہن پر اثر ہو گیا ہے۔"

"تم نہیں سمجھو گی---کہاں سے آٹا منگوایا تھا؟"

پھر ہم نے جان توڑ کوشش کی کہ وہ ہمیں کسی طرح مل جائے لیکن وہ نہ ملا، حسرت ہی رہی۔ وہ اب جو کچھ بتانے والا تھا، وہ کچھ خاص تھا۔ بہر حال، کیا کر سکتے تھے سوائے صبر کے سو کر رہے ہیں۔

☆☆

☆ اعتبار ساجد

بندھن سینٹر

''ایک لرزہ خیز خبر---!'' جندوڈے نے پرجوش انداز میں اخبار میرے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''چین کے شہزادے، عظیم دانشور، میرے دوست پروفیسر بی کے بٹالہ! تمہارے لیے ایک نیا پروجیکٹ!''

میں نے بے صبری سے اخبار جھپٹ لیا۔ ''ضرورت ہے'' کے کالموں میں چند سطروں کے ایک اشتہار پر جندوڈے نے بڑا سا دائرہ لگا رکھا تھا۔ ایک شادی دفتر کو کسی خریدار یا پارٹنر کی ضرورت تھی۔ اشتہار مس گل بنفشہ بی اے کی طرف سے دیا گیا تھا اور ایڈریس کے ساتھ اس کا فون نمبر درج تھا۔

''مس گل بنفشہ بی اے---!'' جندوڈا اشتہار پر انگلی رکھ کر بولا۔ ''ایک بلبل ہزار داستان، پریوں کی ملکہ، جذبات کی رانی--- میں اس سے فون پر ابتدائی معاملات طے کر چکا ہوں۔''

''ابتدائی معاملات؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''تقریباً نصف معاملات---!'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''طے پایا ہے کہ اگر اس سے شادی کا وعدہ کرلوں تو وہ مجھے بغیر کسی سرمائے کی شمولیت کے اپنا پارٹنر بنانے پر تیار ہے۔''

''لائف پارٹنر کہ بزنس پارٹنر؟'' میں نے بھوئیں اچکا کر پوچھا۔

''دونوں---''

''یہ کس طرح ممکن ہو---؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا تم مس گل بنفشہ سے مل چکے ہو، کیا وہ تمہارے بارے میں کچھ جانتی ہے۔''

''ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے---'' جندوڈا مطمئن انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''ٹیلی فون پر لچھے دار گفتگو کے بعد اس نے مجھ پر ہزار جان سے فریفتہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ کل کے اخبار کے لیے اس نے دوسرا اشتہار بھی فون پر پڑھ کر سنا دیا ہے کہ ادارے کو مطلوبہ پارٹنر دستیاب ہو گیا ہے لہٰذا پارٹیاں زحمت نہ فرمائیں۔''

''کمال ہے---'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''ایسا صرف ایک ٹیلی فونک گفتگو پر ہوا۔ مجھے یقین نہیں آتا، جندوڈے میری جان!''

''ایسا ہو چکا ہے---'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ''مگر ایک نہیں دو ٹیلی فونک رابطوں کے بعد۔ ہر بار ہم نے تیس تیس منٹ تک اطمینان سے گفتگو کی۔''

''تیس تیس منٹ تک---'' میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ''کہاں ہے وہ پی سی او جو اپنے کرم فرماؤں کو اتنے لمبے ٹیلی فون ٹاک کی سہولتیں دیتا ہے؟''

''خیر دین پرچون فروش اینڈ کریانہ مرچنٹ!'' جندوڈے نے انکشاف کیا۔ ''ایک گداز دل، عاشق مزاج، بھینگا دانشور دوکاندار! وہ دالیں چاول اور پرچون کے دیگر لوازمات بیچنے میں لگا رہا اور میں اطمینان سے گڑ کی بوری پر بیٹھ کر فون پر لمبی گفتگو کرتا رہا۔'' پھر اس نے اخبار لپیٹ کر احتیاط سے جیب میں ڈال لیا۔

''شام چار بجے چائے پر تم میرے ساتھ مس گل بنفشہ کی مہمانی کا شرف حاصل کر رہے ہو۔ اس کا وسیع وعریض کشادہ بنگلہ اور خوبصورت پھولوں سے مہکتا ہوا لان ہمارا منتظر ہوگا۔

مگر گل بنفشہ کی اقامت گاہ کشادہ بنگلے اور پھولوں سے بھرے ہوئے لان کی بجائے ایک تنگ و تاریک، سیلن زدہ، قدیم اور خستہ گلی میں نکلی، جہاں ملاقاتیوں کو برقی گھنٹی کا بٹن دبانے کے بعد ایک شدید جھٹکا لگتا ہے اور وہ دھڑام سے قریبی گڑھے میں جا پڑتے ہیں۔ خاصی دیر بعد دوسری یا تیسری منزل کی خستہ کھڑکی کھلتی ہے اور کوئی ڈانٹ کر پوچھتا ہے۔

''اوہ کون ہے اوئے؟''

گھنٹی کا بٹن دبانے اور برقی رو کا جھٹکا کھا کر گڑھے میں گرنے کے فرائض میں نے انجام دیے۔ لیکن اوپر سے ''کون ہے اوئے'' کی بجائے ایک مترنم نسوانی آواز نے پوچھا۔

''کون صاحب ہیں؟''

جندوڈا اس وقت بھورے سفاری سوٹ میں ملبوس تھا اور لاشعوری طور پر بار بار اس کے ہاتھ گلے کی طرف بڑھ کر ٹائی کی ناٹ ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ آواز سن کر ہڑ بڑا کر پیچھے ہٹا اور اوپر دیکھنے کی دھن میں چھپ سے اس گڑھے میں جا پڑا۔ جس کا طواف مکمل کرنے کے بعد اب میں اپنے لباس سے کیچڑ اور پانی صاف کر رہا تھا۔

''جج---جج---جے ڈ ڈ---ڈبلیو!''

جندوڈے نے اونچی آواز میں اپنی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے جھک کر ناگہانی حادثے پر گڑھے اور اس کو غلط جگہ بنانے والوں کے بارے میں کچکچاتے ہوئے آتش خیز جذبات کا اظہار کیا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔

''اوپر تشریف لے آئیے---'' مترنم آواز نے کہا۔ ''زینہ دائیں طرف ہے۔''

ہم گھٹا ٹوپ اندھیری سیڑھیوں پر چڑھے تو اچانک زینوں میں لگا ہوا ایک بے حد مدھم پیلا اور گرد آلود بلب روشن ہوا۔ جس نے ماحول کی وحشت خستگی اور ویرانی کو مزید گہرا کر دیا' بقول جندوڈا چار چند لگا دیے۔ جندوڈا آگے تھا' گیارہویں سیڑھی پر پاؤں رکھتے ہی غڑاپ سے اس کی پنڈلی خلا میں جا پڑی اور ماتھا اگلی سیڑھی سے ناک سمیت ٹکرایا۔

''یا اللہ! رحم۔''

جندوڈے نے دلدوز چنگھاڑ ماری۔

''بے حد تباہ کن مورچہ بنایا گیا ہے' چین کے شہزادے! ہوشیاری سے آنا' اس سیڑھی کی اینٹیں اور شہتیر غائب ہیں۔ غالباً چوروں کو چھپنے کی سہولت دینے کے لیے۔''

اچانک دھچکے اور رگڑ سے اس کی پھولی ہوئی ناک متاثر ہو گئی تھی اور متاثرہ علاقہ سرخ ہو کر چہرے پر سب سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ ہم پھونک پھونک کر ایک دوسرے کو ٹٹولتے' دھکیلتے اور گھسٹتے ہوئے زینوں کے اختتام پر ایک نسبتاً چوڑی سی جگہ تک پہنچے۔ یہاں دو قدیم دروازے تھے' ایک سامنے اور ایک دائیں جانب۔ سامنے والا دروازہ غالباً مرکزی دروازہ تھا کیونکہ اس پر ایک پرانی تختی جھول رہی تھی۔

''مس گل بنفشہ بی اے---گل بنفشہ میرج سینٹر (چیئر پرسن)--- (نائب صدر)--- انجمن تحفظ حقوق مویشیاں واسیاں---(سیکرٹری جنرل)

آل ورلڈ ویمن سولائزیشن اینڈ ریز رویشن آف رائٹس۔

ہم کچھ دیر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے اور اکھڑی ہوئی سانسیں ہموار کرتے رہے۔ غالباً ہمارا یہ عمل کسی اندرونی جھری سے بغور ملاحظہ کیا جا رہا تھا کیونکہ جب جندوڈا دوسری مرتبہ اپنے بالوں میں کنگھی کر کے انہیں مزید وحشت ناک بنا چکا تو آواز آئی۔

''دائیں طرف کے دروازے سے اندر داخل ہو کر تشریف رکھیں۔''

پھر دس گیارہ سال کی ایک کالی کلوٹی چوڑے نتھنوں اور لمبے منہ والی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ چند لمحوں تک دونوں کو تجسس' شرارت اور لاتعلقی سے گھورتی رہی' پھر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک قدیم اور خستہ حال بیٹھک تھی جس کی دیواروں کا پلستر اکھڑ چکا تھا اور اسے چھپانے کے لیے جگہ جگہ وال پیپر اور اخبارات کے رنگین صفحے باریک کیلوں سے ٹھونک کر چپکا دیے گئے تھے۔ ایک میز پر چند رسالے پڑے تھے اور صوفوں کی بدنمائی اور ہیئت کذائی چھپانے کے لیے ان پر جو کپڑا منڈھا گیا تھا' اس کی خستگی اور بدرنگی دید کے قابل تھی۔ سامنے دیوار پر ایک چٹخے ہوئے گرد آلود فریم میں ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر آویزاں تھی۔ پہلی نظر میں میں اسے مدھوبالا کا کوئی فلمی پوز سمجھا۔

''یہ کس فلم سے ہے؟'' میں نے کہنی مار کر جندوڈے سے پوچھا۔

جندوڈا تصویر میں کھویا ہوا تھا' بولا۔ ''شاید یہ میرے ابا جی کے بچپن میں بنی ہوئی کوئی فلم ہے---کونسی ایکٹرس ہے یہ؟''

فریم کے نیچے ایک چٹ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ غالباً فلم کا نام وغیرہ میں نے اٹھ کر پوچھا۔

''مس گل بنفشہ بی اے۔''

''مبارک ہو---'' میں نے جندوڈے کو تھپکی دی۔ ''خود مس گل بنفشہ ہیں۔''

''خیر مبارک۔'' جندوڈے نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''میں تو آواز سے ہی تاڑ گیا تھا کہ---''

اتنے میں لڑکی چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ پلیٹوں میں رکھی ہوئی چیزوں کی ترتیب یہ بتاتی تھی کہ میزبان کو ہمارا خاصی دیر سے انتظار تھا' خاص طور پر سموسے اور پکوڑے اس شبہے کو تقویت دیتے تھے کہ ہمارا انتظار کل صبح سے ہو رہا تھا۔ لڑکی ٹرے رکھ کر خاموشی سے چلی گئی' جاتے جاتے اس نے بیٹھک کے دروازے کا پردہ بطور خاص برابر کیا۔

''یہ انتظار---'' جندوڈا کلبلا کر بولا۔ ''چین کے شہزادے! علامہ

صاحب اس موقعہ پر کیا فرماتے ہیں؟''

میں نے کہا۔'' علام صاحب نے اندرون شہر کی ایسی کسی خوفناک گلی میں جا کر کبھی پارٹنر نہیں ڈھونڈے ہوں گے لہٰذا ان کی طرف سے خاموشی ہے۔''

جندوڈے نے ایک بار پھر کنگھا نکالا چاہتا تھا کہ اسے بالوں تک لے جائے کہ پردہ لہرایا اور اس کا ہاتھ قوس کی شکل میں جہاں تھا' وہیں رہ گیا۔

مس گل بنفشہ بی اے اندر داخل ہو چکی تھی۔ بے حد شوخ اور بھڑکدار رنگوں والے سستے سے لباس میں ملبوس میک اپ کی کاک ٹیل میں شرابور پینتالیس سے اوپر جاتی ہوئی عمر' گہرا سانولا رنگ' چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن پر موٹے گول شیشوں کی عینک' چوڑے نتھنے' چہرے پر چیچک کے داغ جو کوشش کے باوجود میک اپ کے رقیق اور ان گنت سیالوں سے بھی نہ چھپ سکیں--- جندوڈا اسے میری طرح گل بنفشہ کی ماں سمجھا لیکن میری طرح چپ نہ رکا سکا۔ تعظیماً اپنی جگہ سے اٹھ کر سر پر ہاتھ پھروانے والے انداز میں سر جھکائے آگے بڑھا اور بولا۔

''خالہ جان! سلام عرض کرتا ہوں۔''

خاتون نے اس سلام کا کوئی تسلی جواب نہیں دیا۔ ایک کرسی کھینچ کر دھپ سے اس پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''جے ڈبلیو خان صاحب کون ہیں؟''

جندوڈے نے مودب ہو کر سینے پر ہاتھ رکھا اور قدرے جھکتا بولا۔

''میں ہوں خالہ جان! آپ کا فرزند۔''

خاتون اچانک چھتیس میٹر توپ کے گولے کی طرح پھٹ پڑی بولی۔

''یہ آپ نے کیا رٹ لگا رکھی ہے'' خالہ جان' خالہ جان؟'' میں مس گل بنفشہ بی اے بقلم خود ہوں۔''

جندوڈا ڈگمگا گیا ہکلا کر بولا۔'' پپ--- پپ--- آپ--- آپ؟''

''جی ہاں میں---'' خاتون نے بڑی سریلی آواز میں کہا۔'' کوئی شک؟''

''کک---کوئی نہیں۔'' جندوڈے نے بوکھلا کر کہا۔'' کک--- کوئی نہیں۔''

خاتون بڑے اطمینان سے بولی۔'' جب کوئی شک نہیں تو پھر نروس بریک ڈاؤن کس لیے؟ کھائیں پیئیں' صبح سے چیزیں منگا کر رکھی ہیں۔ آپ کے لیے۔'' پھر اس نے ایک پلیٹ جندوڈے کی طرف بڑھائی اور دوسری پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔'' آپ سے میرا متعارف نہیں ہے۔''

جندوڈا خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔'' عظیم دانشور' پروفیسر بی کے بٹالہ! میرے مشیر امور خصوصی اور معاون برائے امور عمومی!''

''ان کا ذکر آپ نے فون پر تو نہیں کیا تھا؟'' مس گل بنفشہ نے کہا۔

میں نے گھور کر جندوڈے کو دیکھا اور انتقاماً دو گلاب جامنیں اپنی پلیٹ میں ڈالیں۔ وہ ان عاشقوں میں سے ہے جو مہم کے آغاز سے پہلے ہر شخص پر شبے کی نظر رکھتے ہیں اور اختتام پر ہر شخص سے ہمدردی کی امید۔

''بہر حال---'' گل بنفشہ نے پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔'' آپ نے مجھے اور میں نے آپ کو دیکھ کر پاس کر دیا ہے۔ اب بتائیں' اگلا پروگرام کیا ہے؟''

جندوڈے نے امداد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

''یہ تو اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ کیا چاہتی ہیں۔؟''

گل بنفشہ نے بے دھڑک کہا۔''شرعی نکاح' حق مہر ایک لاکھ سے کم نہیں رکھواؤں گی۔''

جندوڈے کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے بچی' بولا۔'' لاکھ روپے کس چیز کے؟''

''حق مہر---!'' گل بنفشہ میز پر مکہ مار کر بولی۔'' لاکھ سے ایک پائی کم نہیں ہوگی' یہ ہماری خاندانی روایت ہے۔''

جندوڈے کے چہرے پر زلزلہ آ گیا' نتھنے پھلا کر بولا۔'' ہماری بھی خاندانی روایت ہے۔ ہم پانچ لاکھ سے کم پر نہیں مانتے۔''

گل بنفشہ خوشی سے اچھل پڑی' بولی۔'' یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ چلو طے ہو گیا' مہر پانچ لاکھ۔''

''مگر---'' جندوڈا ہاتھ اٹھا کر بولا۔'' سات لاکھ آپ مجھے نقد دیں گی' یہ ہماری خاندانی روایت ہے۔''

''سات لاکھ روپے نقد؟'' گل بنفشہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

''پورے---'' جندوڈے نے ایک ہاتھ کا پنجہ اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔'' نکالیں سات لاکھ روپے' میں ابھی مولوی صاحب کو بلا کر پانچ لاکھ روپے کے حق مہر پر دستخط کرتا ہوں۔''

''مگر---'' گل بنفشہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔'' یہ کس قسم کا نکاح ہے؟ نکاح نہ ہوا' یہ تو کاروبار ہو گیا کہ پانچ کے بدلے سات۔''

''مجبوری ہے---'' جندوڈے نے آہ بھر کر کہا۔'' خاندانی روایت پر آنچ آ جائے گی۔ میں کوئی معمولی ٹٹ پونجیا نہیں' صاحب جائیداد

شخصیت ہوں۔ کھیت ہیں' حویلی ہے' مکانات ہیں' دکانیں ہیں' اور دس لاکھ روپے کی انشورنس پالیسی ہے۔ کیوں پروفیسر بی کے بٹالہ' عظیم دانشور! بولتے کیوں نہیں؟"

جندوڈا اپنی رو میں اب نکلا تھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا' بولا۔

"میرا خیال ہے کہ ایک آئٹم پر بات ہو چکی ہے' اب دوسرے آئٹم پر بات ہونی چاہیے۔ میرا مطلب ہے کہ بزنس پارٹنر شپ پر۔"

گل بنفشہ خرخراہٹ آمیز سانسیں لے رہی تھی' ہانپتے ہوئے بولی۔

"میرا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے' دل ڈوب رہا ہے--- پانی۔"

جندوڈے نے فوراً سے پانی کا گلاس پیش کیا۔ چند گھونٹ پینے کے بعد وہ کرسی پر ڈھیر ہوگئی' بولی۔

"پارٹنر شپ کے لیے میری وہی شرط ہے کہ پہلے نکاح۔"

"نکاح بھی ہو جائے گا' حوصلہ کریں۔" جندوڈے نے اسے پانی کا دوسرا گلاس بھر کر دیتے ہوئے کہا۔

"پانی نہیں' نکاح!" بڑی بی گلاس پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہو جائے گا---" جندوڈا ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "آپ کا نکاح انشاء اللہ آپ کی زندگی ہی میں پڑھوایا جائے گا' فی الحال میرج سینٹر کا معاملہ طے کریں۔"

گل بنفشہ تھوڑی دیر تک خراٹوں سے ملتی جلتی سانسیں لیتی رہی' پھر اس نے پرس کھول کر ایک شیشی نکالی شیشی میں سے گن کر پانچ گولیاں نکالیں اور "یا اللہ شافی' یا اللہ کافی" کا ورد کرتے ہوئے پانی کے ساتھ گولیاں نگل لیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کے اعصاب کچھ نارمل ہوئے تو وہ معذرت کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"چین کے شہزادے!" جندوڈے نے پریشان ہو کر کہا۔ "موقعہ اچھا ہے' آؤ بھاگ چلیں۔"

"صبر---" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "جو بیج بویا ہے' اس کا پھل کا انتظار کرو جو عنقریب تمہاری جھولی میں ٹپکنے والا ہے۔"

"یہ بڑی بی---" جندوڈا دانت پیس کر بولا۔ "یہ خالہ جان قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھتی ہے مگر ارمان دیکھو۔ کہتی ہے کہ ایک لاکھ روپے حق مہر پر نکاح پڑھواؤں گی۔ ایک پائی کم نہیں لوں گی۔ تمہارا کیا خیال ہے چین کے شہزادے! اس مائی کی کپڑوں اور عینک سمیت کل مالیت کیا ہوگی؟"

"مفت بھی مہنگی ہے---" میں نے آہستہ سے کہا۔ "مگر چونکہ ایک بھی پائی خرچ کیے بغیر تمہیں بزنس پارٹنر بنا رہی ہے لہٰذا سستی ہے۔ مبارک ہو' قبول ہو۔"

اتنے میں گل بنفشہ بہت سے پمفلٹ' فائلیں' اخبارات کے تراشے اور دو رجسٹر لیے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ سارا ساز و سامان اس نے میز پر جگہ بنا کے ڈھیر کر دیا اور گل بنفشہ میرج سینٹر کی اب تک کارکردگی سے آگاہ کرنے لگی۔ اتنی شادیاں کروائیں' اتنی طلاقیں ہوئیں' اتنے دیوانی اور فوجداری مقدمے ہوئے--- جندوڈا اس تفصیل سے گھبرا گیا' بولا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ یہ رجسٹر کھاتے آپ بند کریں اور آمدنی والی سائڈ پر آئیں آمدنی کی کیا ضرورت ہے؟"

"رجسٹریشن فیسیں اور نذرانے!" گل بنفشہ نے بتایا "بعض مخیر حضرات چھپے بھی ہماری مالی معاونت کرتے ہیں۔ الحاج کریم داد چڑے والے ہمارے مستقبل کرم فرما ہیں' ہر سال چھ مہینے بعد ایک آدھ نکاح سے شوق فرماتے رہتے ہیں۔"

"پچھلی بیویوں کا کیا بنتا ہے؟" جندوڈا گھبرا کر بولا۔

"خلع یا طلاق---" گل بنفشہ نے وضاحت کی۔ "میں تو غیر شرعی یا غیر قانونی کام نہیں کرتے۔ اکیلی عورت بلکہ لڑکی---" وہ تاسف انگیز لہجے میں بولی۔ "مردوں کے اس معاشرے میں کامیاب نہیں ہو سکتی' جب کہ سر کا سائیں موجود نہ ہو۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ ہم لڑکیوں کو کیسی کیسی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی مختلف آپ بیتیاں شروع کر دیں کہ کس طرح بیچارہ جیپ میں سوار ایک صحت مند اور خوبصورت جاگیردار رشتے کی تلاش میں اس کے دفتر آیا اور ہزار جان سے اس پر عاشق ہو کر فوری نکاح کا مطالبہ کرنے لگا اور حق مہر کے طور پر اپنی پجارو جیپ اور منہ دکھائی کے طور پر کلاشنکوف نذر کرنے پر تیار ہو گیا۔ کس طرح اس نے جان چھڑائی اور کس طرح ایک فلمی ہیرو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا اور کس طرح ایک متمول نوخیز اور نوعمر زمیندار زمینوں کے کاغذات اور رجسٹریاں لیے اس کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرنے لگا نیز کس طرح اس نے ایک معروف سیاست دان سے جو وزیر بننے والا تھا' پیچھا چھڑایا۔ پھر اس نے بتانا شروع کیا کہ ٹی وی کا ایک انتہائی مقبول اور صاحب جائیداد اور خوبصورت ترین اداکار کس طرح اس کے عشق میں مبتلا ہو کر زہر کھانے کی دھمکیاں دینے لگا--- جندوڈے نے ایک دم ہڑبڑا کر چیخ ماری۔

"اف--- کاٹ لیا' برباد کر دیا' کرنٹ مار دیا' ککھ نہیں چھوڑا---"

گل بنفشہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی' بولی۔ "یا اللہ! خیر' سانپ تو نہیں تھا؟"

''غالباً---'' جندوڈے نے پسینہ پونچھتے ہوئے نیچے جھک کر دیکھا' پھر ایک آہ بھر کر بولا۔ ''نکل گیا۔ خیر جانے دیں اب اجازت؟''

''نہیں' نہیں---'' گل بنفشہ جلدی سے بولی۔ ''آپ لوگ کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتے۔ میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ہم لڑکیوں کی زندگیاں کتنی---''

جندوڈے نے بات کاٹ دی' بولا۔ ''تو پھر طے رہا کہ میں آپ کا بزنس پارٹنر بن گیا ہوں۔''

''طے رہا---'' گل بنفشہ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ''ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ ایک مرتبہ ایک انتہائی حسین وجمیل نوجوان ریشمی لباس زیب تن کیے خوبصورت چمکتی ہوئی کار میں سوار میرے پاس آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے دل کی عجیب حالت ہوئی۔ تڑپنے لگا اور کہنے لگا---''

جندوڈے نے زور سے میری پنڈلی پر چٹکی لی۔ ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

''نہیں' نہیں---'' گل بنفشہ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''رات کا کھانا---''

''کل دوپہر کا لنچ---'' جندوڈے نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''مگر---'' وہ باہر نکلتے نکلتے بولا۔ ''ادارے کا نام تبدیل کیا جائے گا۔''

میں بھی کافی دنوں سے یہی سوچ رہی تھی۔'' گل بنفشہ نے کہا۔ ''کیونکہ میرا نام اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ ادارہ پیچھے چلا گیا ہے۔ ابھی پچھلے مہینے کی بات ہے کہ بڑی بڑی آنکھوں والا ایک خوبصورت جوان' نئی کار میں سوار انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں پہنے۔''

''خدا حافظ---!''

جندوڈے نے زور سے کہا اور بے دھڑک دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔

اس رات دیر تک ہم ادارے کا نیا نام سوچتے رہے۔ آخر ''جے ڈبلیو بندھن سینٹر'' پر اتفاق رائے ہو گیا۔

''چین کے شہزادے!'' جندوڈے نے طویل گفتگو سے تھک کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ مائی کے پاس دماغ اور حسن نامی کوئی چیز نہیں اور یہ بی اے بھی نہیں لہٰذا ذہانت بروئے کار لا کر رجسٹریشن فارم کا خوبصورت عبارت اور اشتہار کے دل آویز مضمون سوچو اور ہر حال میں صبح یہ چیزیں تیار کر کے میرے حوالے کر دو۔''

جندوڈے کے جانے کے بعد میں دیر تک رجسٹریشن فارم کے سوالنامے اور اشتہارات تیار کرتا رہا۔ یہ مجھ ایسے ناتجربہ کار اور مجرد شخص کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ جندوڈے کی شادی چند خاندانی مسائل کے اچانک اٹھ کھڑے ہونے سے کھٹائی میں پڑنے کے بعد میں جب سے بھمبریاں والی سے آیا تھا' جندوڈا مسلسل کوئی نہ کوئی پروجیکٹ لے کر میرے گرد منڈلا رہا تھا۔

جے ڈبلیو بندھن سینٹر کے اشتہارات میں عوام الناس کو ان کے مفاد میں مطلع کیا گیا کہ وہ جعلسازوں کے چکر میں نہ پڑیں اور شریفانہ زندگی گزارنے کے لیے شریفانہ طریقے استعمال کریں۔ یعنی جے ڈبلیو خان سے ملیں' جن کے پاس ملکی وغیر ملکی رشتوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ سوالنامے میں جہاں آپ کی عمر اور آپ کی تعلیم والا کالم تھا اسے میں نے کاٹ دیا' آمدنی اور پیشے کے کالم بھی حذف کر دیے' اب چھ سات خالی لکیروں کے اوپر ایک فقرہ تحریر تھا۔

''آپ کی اپنے بارے میں رائے!''

نمکین غزل

تعریف گر کرے کوئی تو جان وار دو
تم کو بُرا کہے کوئی تو لات مار دو
آنکھوں میں جس کے پیار ذرا سا بھی دیکھ لو
ہونٹوں سے تم بھی پیار اُسے بے شمار دو
وہ گھورتی ہے' گھور کر ہی دیکھتی رہے
گر ہو سکے تو تم بھی اُسے آنکھ مار دو
یہ کیا کہا کہ ایک ہی سے پیار ہے تمہیں
محبوب دو ہزار لو' دِل دو ہزار دو
گالی ہو یا سلام ہو یا اعتبار ہو
گر ایک بار دے کوئی تو بار بار دو
زردہ پکانا فن ہے مرے دوست' آج کل
چینی اگر نہیں ہے تو گڑ کا بگھار دو
کھولی ہے گر دکان محبت کے شہر میں
سارے حسین لوگوں کو اکبر اُدھار دو

اکبر بخاری
موبائل: 0301-7560073
akber.bukhari@yahoo.com

نیچے کے کالم جوں کے توں رہنے دیے۔ یعنی آپ کا پتہ اور فون نمبر۔ ایک لفظ کا اضافہ یوں ضروری تھا۔ سو میں نے کر دیا کہ آپ کے تار کا پتہ' ڈاک کا کوڈ نمبر' ٹیلکس وغیرہ--- اس کے بعد کا نصف حصہ دفتری استعمال کے لیے تھا۔ جیسے۔ ''میں تصدیق کرتا/کرتی ہوں کہ مسٹر/مس نے بطور امیدوار کالم بھر کر رجسٹریشن فیس مبلغ روپے' ایڈوانس رقم مبلغ روپے' ادا کر دیے ہیں۔ انہیں رجسٹریشن نمبر الاٹ کر دیا جائے' آپ کی عین نوازش ہوگی۔

دستخط تصدیق کنندہ

نوٹ: والدین یا سرپرست درج ذیل خانے پر کریں۔
میں/ہم --- رشتہ--- عزیزم/عزیزہ--- کے رشتے کے سلسلے میں فیس رجسٹریشن مبلغ--- روپے بمعہ ایڈوانس مبلغ--- روپے۔ ادا کر کے عزیزم/عزیزہ--- کا/کے بہتر مستقبل کا/کے کے متمنی/دعا گو/شکر گزار ہوں/ہیں۔

دستخط والدین/سرپرست

اگلی صبح جندوڈے نے اپنی ہٹ دھرمانہ ترمیم و تنسیخ کے بعد ڈرائنگ منظور کر لی۔ ہم تیار شدہ فارموں' پمفلٹوں اور اشتہارات وغیرہ کی اشاعت کے لیے اندرون شہروں کی گلی میں واقع ایک پراسرار اور نیم تاریک چھاپہ خانہ میں پہنچے۔ جہاں جعلی چائے کے لیبل' عرس' میلاد اور ڈراموں کے پوسٹر وغیرہ چھپتے تھے۔ اشاعتی ادارے کا مہتمم جندوڈے کا دوست چراغ دین پروانہ تھا۔ اس وقت وہ گرمی کی شدت سے بے حال' قمیص اور بنیان اتارے' لنگی باندھے چنجنا چنگھاڑتا' اپنی ڈھلکی ہوئی توند پر ہاتھ پھیرتا دائیں سے بائیں گردش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے پہلوانوں کے سے انداز میں جھٹکے دار مصافحہ کیا اور خاصی دیر اس بات پر گہرے ملال کا اظہار کرتا رہا کہ اصلی دیسی گھی کی نایابی نے نوجوان نسل کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے' پھر اس نے ہمارے لیے ایک ایک فٹ کے گلاسوں میں لسی منگوائی اور آرڈر بک پر اشاعتی کام نوٹ کرنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے حساب کتاب کے بعد ایڈوانس کے طور پر ایک خطیر رقم کا مطالبہ کیا۔

''قائم مقام جنرل منیجر صاحب---!'' جندوڈے نے میری طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ادارے کی جانب سے پیشگی رقم عطا کی جائے۔''

میں نے حیرت اور برہمی سے اس کی طرف دیکھا۔

''فکر نہ کریں---'' میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اپنی آئندہ تنخواہوں میں سے اس رقم کو ایڈجسٹ کر لیں' فی الحال پیشگی رقم کا معمہ حل کر دیں۔''

میں نے طوہاً و کرہاً اپنی جمع پونجی جندوڈے کے حوالے کر دی اور باہر آتے ہی پرزور انداز میں احتجاج کیا کہ میرا معاشی استحصال بند کیا جائے۔ میں پہلے ہی حد درجہ مقروض ہوں اور شہر کی متعدد گلیاں مجھ پر بند ہو چکی ہیں۔ نیز قرض خواہوں کا ایک جم غفیر میرے تعاقب اور تلاش میں ہے اور کسی بھی وقت مجھ پر کمانڈو ایکشن متوقع ہے۔

''مائی بنفشہ---!'' جندوڈا میری پیٹھ تھپک کر بولا۔ ''تم پر بے حد مہربان ہو چکی ہے اور اسی کی خواہش پر تمہیں ادارے کا جنرل منیجر نامزد کیا گیا ہے۔ اب سے تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون پر ہماری دو رکنی انتخابی کمیٹی نے تمہاری تقرری کا فیصلہ کیا ہے---'' پھر اس نے میرے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر مجھے گلے لگاتے ہوئے بتایا۔ ''یہ پروجیکٹ ہمارے لیے ذہنی' قلبی' جذباتی اور مالی آسودگی کے دروازے کھول دے گا۔ بڑے بڑے صنعت کار' جاگیردار' سیاستدان اور فلمی دنیا کے متمول پرندے ہماری مٹھی میں ہوں گے' سرکار دربار میں رسائی ہو جائے گی۔ دولت' شہرت اور عزت چھما چھم بارش کی طرح ہم پر برسے گی۔ ہمارے بینک اکاؤنٹس سوئٹزر لینڈ' برطانیہ' بنکاک اور ہالینڈ کے علاوہ سویڈن میں ہوں گے۔ غیر ملکی فضائی کمپنیوں کی حسین و جمیل فضائی میزبان خواتین فلائٹ چھوڑ کر ہمارے پاس آ بیٹھا کریں گی--- آہ' چین کے شہزادے' عظیم دانشور' میرے دوست' پروفیسر بی کے بٹالہ! ذرا تصور کی آنکھ سے دیکھو کہ پی آئی اے کے جمبو جیٹ طیارے میں ہم دونوں نیویارک کی طرف پرواز کر رہے ہیں اور فرسٹ کلاس کے کیبن میں۔''

دوپہر کو حسب پروگرام جندوڈا مس گل بنفشہ کے پاس لنچ اور دیگر معاملات طے کرنے گیا۔ شام ڈھلے اس کی واپسی ہوئی تو وہ دریائی گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا اور کانوں کو ہاتھ لگا کر بار بار ورد کر رہا تھا۔

''اللہ معافی---اللہ معافی۔''

''بات کیا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''مائی بنفشہ---!'' اس نے پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ کہا۔ ''ایک خوفناک اور عجیب و غریب جناتی مخلوق ہے' جس نے عوام کو دھوکہ دینے کے لیے انسانی روپ دھار رکھا ہے۔ وہ مجھ پر ہزار جان سے عاشق ہو چکی ہے اور ہر فقرے کے بعد نکاح کا مطالبہ کرتی ہے۔ ایک لاکھ حق مہر کی شرط اس نے ہٹا دی ہے اور بغیر کچھ دو کچھ لو کے نکاح کی طالب ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنی ساری جائیداد ادارے سمیت میرے نام وصیت نامے میں لکھنے کے لیے تیار ہے--- اف' اس کا مسلسل گاجریں چبانا اور سلاد کے پتوں کو کچر کچر کھانا اور اونچی آواز میں ڈکاریں مارنا اور

دِ یاں کھانا۔''

بہرحال ---'' وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ''پرسوں شام مجوب پلازہ کے تہہ خانے میں ادارے کی افتتاحی تقریب منعقد ہو رہی ہے لیکن اس مرتبہ تم پر ایک انسانی ذمہ داری عائد ہو چکی ہے۔ تمہیں دو تقریریں لکھنی ہیں۔ ایک میرے لیے دوسری بنفشہ کے لیے۔'' اس نے جاتے جاتے پرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا۔ ''چین کے شہزادے! یاد رکھو تقریریں ایسی ہونی چاہئیں کہ حاضرین کی چیں بول جائے اور ان کے اوسان خطا ہو جائیں۔ علامہ کے اشعار بے شک میری تقریر میں ڈال دینا لیکن مائی کی تقریر میں آنسہ نسرین صابر وشاکر کے شعروں کا تڑکا لگانا مت بھولنا۔ سنا ہے شادی بیاہ کے سلسلے میں اس کی شاعری میرج گائیڈ کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کے بعد تین چار دن تک جندوڈے نے اپنی شکل نہیں دکھائی۔ میں مطلوبہ تقریریں تیار کر کے اس کی آمد اور اپنی تقریری کے پروانے کا منتظر رہا لیکن جندوڈا نہ آیا۔ جب میری مایوسی انتہا کو چھونے لگی تو میں نے ایک چھوٹی سی چھتری لی اور مس گل بنفشہ کی رہائش گاہ پر پہنچا اور چھتری کی نوک سے کال بیل بجائی۔ اوپر کھڑکی کے پٹ کھلے اور خلاف توقع مردانہ آواز آئی۔

''کون ہے اوئے' ڈاکٹر؟''

بلاشبہ یہ جندوڈے کی آواز تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں' شیو بڑھی ہوئی تھی اور حلیے سے وہ امیر الدین ٹھگ نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دھڑ دھڑاتا ہوا سیڑھیوں سے اترا اور آتے ہی گلے لگ کر بولا۔''

''چین کے شہزادے! چوٹ تو نہیں آئی۔''

''آج اللہ کا کرم رہا ---'' میں نے اس کو چھتری دکھاتے ہوئے کہا۔ ''حفاظتی سامان میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ تم بتاؤ' کہاں غائب ہو گئے تھے۔ لگتا ہے' تم نے انسانی بھلائی کے منشور پر دستخط کر دیے ہیں' نکاح کر لیا ہے؟''

''شش ---'' وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولا۔ ''مائی چار دن سے بیمار ہے اور میں اس کی عیادت کر رہا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آنے والا ہے۔''

''بیماری کیا ہے؟''

''دل کا عارضہ ---'' وہ انگلیوں پر گنوانے لگا۔ ''کمر کا درد' سر کا درد' جگر کی خرابی' نظر کی کمزوری' یادداشت کا بار بار گم ہونا' اس کے علاوہ ---''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ادارے کی بابت کیا سوچا ہے؟''

کہنے لگا۔ ''پرسوں افتتاحی تقریب کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ مائی کی بیماری کوئی نئی بات نہیں۔ جس وقت پہلی جنگ عظیم ہوئی تھی' اس وقت سے یہ بیمار چلی آ رہی ہے --- تم تقریریں لائے ہو؟''

اتفاقاً تقریروں کے مسودے میری جیب میں تھے' میں نے نکال کر اس کے حوالے کیے۔ جندوڈے نے سرسری انداز میں آنکھیں میچ کر کاغذ الٹ پلٹ کیے' کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے' تم جا سکتے ہو مگر پرسوں شام پانچ بجے مٹھائی کے ایک خوبصورت بڑے ڈبے کے ساتھ تقریب سے دس پندرہ منٹ پہلے پہنچ جانا۔''

میں نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''چین کے شہزادے! میں تمہاری طنزیہ نظروں کا مطلب سمجھ رہا ہوں مگر اس وقت میں خود مہمان ہوں لہٰذا چائے پانی سے تمہاری تواضع نہیں کر سکتا۔''

''مس گل بنفشہ کی عیادت ---'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''میرا انسانی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ براہ کرم سیڑھیوں کا راستہ گھیر کر کھڑے ہونے کی بجائے مجھے کمرہ عدالت تک لے چلو تاکہ میں مس بنفشہ کو جوشاندہ پینے کا مشورہ دے سکوں۔''

جندوڈے نے نفی میں گردن ہلا دی' بولا۔ ''یہ کام پھر کبھی کر لینا۔ انشاءاللہ' آئندہ بھی وہ بیمار پڑے گی' یہ کوئی آخری چانس نہیں ہے۔''

موٹاپا

پھولتی جا رہی ہو سر تا پا
ہائے بیگم' تمہارا موٹاپا!
ڈارلنگ تم کو میں کہوں کیسے
تم تو لگتی ہو اب بڑی آپا
اب تمہاری کمر ہے یا کمرہ
تم نے شاید کبھی نہیں ناپا
لگ رہی ہو ذخیرہ آٹے کا
پڑ نہ جائے پولیس کا چھاپہ
ڈٹ کے کھاتی ہو خود' مجھے لیکن
ایک چائے کی پیالی' اِک پاپا
روز تکرار ہے مرے گھر میں
دِھن دھنا دِھن تا' سا رے گا ما پا

ڈاکٹر جاوید پنجابی موبائل: 0345-8122095

میں نے نیم دل کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا اور جانے سے پہلے کرنٹ چیک کرنے کے لیے چھڑی کی نوک سے پھر کال بیل بجادی۔

☆☆

افتتاحی تقریب میں جو ایک ڈراؤنے اور پراسرار نیم تاریک نیم روشن تہہ خانے میں منعقد ہوئی۔ ارگرد کے چند دوکانداروں، مناسب رشتے کی متلاشی چند معمر عورتوں، ہونڈا موٹر سائیکلوں پر سائلنسر نکال کے ہواخوری کرنے والے چند خوش جمال لڑکوں، تہہ خانے کی بلیوں، مچھروں، چمگادڑوں اور میرے اور جندوڈے کے چند مشترکہ دوستوں، خیرخواہوں اور بدخواہوں وغیرہ نے شرکت کی۔ میں خالی ہاتھ پانچ بجنے سے بیس منٹ پہلے تقریب میں پہنچا تو ایک بڑی بی دوسری عمر رسیدہ خاتون سے کانا پھوسی کر رہی تھیں۔

''اے بہن رشیدہ! کیا بتائیں، ہم لڑکیوں کی تو قسمت ہی خراب ہے۔ بچپن اس آس میں گزرا کہ شائد ماں باپ خود کہیں ہمارا رشتہ کردیں، لیکن اللہ نے---''

دوسری نے انہیں ٹوک دیا۔ ''خدا کے فضل سے ابھی ساری عمر پڑی ہے۔ جوانی کا کیا ہے، یہ تو چار دن کی چاندنی ہے۔ چلی بھی گئی تو ہمارا کیا نقصان ہو جائے گا۔''

پہلی عورت نے کہا۔ ''رشتوں کے بارے میں ہمیں بھی اپنے مقررہ معیار پر کچھ نظرثانی کرنی پڑے گی۔''

''میں تو نہیں کروں گی---'' دوسری نے چمک کر کہا۔ ''بیس پچیس سال پہلے میں نے اپنے لیے رشتے کا جو معیار قائم کیا تھا، وہ اب تک قائم ہے۔ آدمی کو اپنی بات پر اٹل رہنا چاہئے۔''

مجھے کن سوئیاں لیتے دیکھ کر انہوں نے دبی دبی چیخیں مار کر ایک دوسری پر چھلانگ لگادی۔

جندوڈا اپنے نتھنے پھلائے، پگڑی باندھے، سمور کی ایک عجیب خوفناک واسکٹ پہنے ہاتھ میں تقریر لیے لپک لپک کر مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ اس کی پگڑی کے اونچے شملے پر گوٹے کناری سے ''جے ڈبلیو خان'' کے الفاظ کڑھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے لپک کر مصافحہ کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس لمبی میز پر لے آیا جو ایک گھٹا ٹوپ گوشے میں رکھی تھی اور جس پر چند بلیوں کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ ماچس جلا کر اس نے میز کی وضاحت کی۔ یہ چائے اور اس کے لوازمات کی میز تھی۔ مجھے اس میز کی حفاظت اور پاسبانی کے فرائض سونپ کر وہ تیزی سے لپکتا ہوا ایک بڑے میاں کی طرف بڑھا جو موٹے شیشوں کی عینک لگائے تہہ خانے کے ایک ستون سے مصافحہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''نئی مشینری اور نئے سازوسامان کے ساتھ کاروبار مبارک ہو، محترمہ! بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں۔''

یہ الحاج کریم داد چمڑے والے تھے۔ مس گل بنفشہ کے پرانے کرم فرما اور کلائنٹ جندوڈے نے پھرتی سے ان کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے مصافحہ کیا اور خوشخبری سنائی کہ محترمہ گل بنفشہ بس چند ہی لمحوں بعد پہنچنے والی ہیں۔ ایک بڑے میاں قریب کھڑے کچھ گنگنا رہے تھے، یہ کسی نظم کے اشعار تھے اور اس بزرگ کو پڑھنے تھے۔ ان کی پھنسی پھنسی بھنچی بھنچی آواز ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ وہ میری موجودگی سے بے خبر گنگناہٹ کے ساتھ ساتھ بڑبڑاہٹ سے بھی فیض کام ہو رہے تھے۔

''اوں اوں، تیری نظروں کے چلے تیر میرے سامنے پر---آں آں، سینے پر ہائے بے درد میرے سینے پر---'' ایں ایں۔ ایں آں آں۔

''میاؤں---میاؤں۔'' بلیوں نے خوش ہو کر آواز ملائی۔

''ایں ایں---آں آں---ایں ں ں۔''

''میاؤں---میاؤں---میاں ں ں---اوں۔''

''کون ہیں صاحب! آپ لوگ ہے؟'' ہڑبڑا کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔

''میاؤں---'' ان کے بالکل قریب سے آواز آئی۔

''بدذوقی کی حد ہوگئی---'' وہ جھلا کر بولے۔ ''خون جگر سے یہ نظم لایا ہوں اور آپ لوگ ہوٹنگ کر رہے ہیں؟ اس طرح تو ادب بھی ترقی نہیں کرسکتا، بھائی صاحبان!''

''میاؤں---میاؤں۔'' بلیوں نے احتجاج کیا۔

اتنے میں ہونڈا موٹر سائیکلوں والے نے منہ سے پیپنی بجانی شروع کی۔ ''پھرر رپھرر---پیں پاں---پیں پیں---پاں پاں۔''

اتنے میں لال رنگ کی انتہائی شوخ ساڑھی اور گہرے میک اپ میں ملبوس گل بنفشہ کا ورود ہوا۔ وہ کالے سے ڈراؤنے نین نقش والی لڑکی پیشوائی کے لیے ساتھ تھی۔ جندوڈے نے فوراً تقریب کے آغاز کا اعلان کردیا۔ الحاج سیٹھ کریم داد نے تلاوت کی۔

''قسم ہے زمانے کی انسان خسارے میں ہے---''

ادھر تلاوت کے بعد انہوں نے اپنی نشست کی طرف بڑھنا شروع کیا، ادھر جندوڈے نے انہیں دبوچ لیا۔ بولا۔

''جاتے کہاں ہو چین کے شہزادے! مس گل بنفشہ کے پرزور اصرار پر آپ کو مہمان خصوصی بننا ہے؟''

''سیٹھ صاحب منمنا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے، سرگوشی میں پوچھا۔''

''صدارت کس سے کروار ہے ہو' میاں برخوردار؟''

''آپ کے بھائی الحاج سیٹھ حکیم داد لوہے سریے والے سے۔'' جندوڈے نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔

ایک بڑے میاں راستہ ٹٹولتے کھنکھارتے' چیخیں مارتے کرسی صدارت کی طرف لپکے۔ یہ الحاج سیٹھ حکیم داد لوہے سریے والے تھے۔ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے سے رسماً ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھ گئے۔ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض جندوڈا انجام دے رہا تھا۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ صدر اور مہمان خصوصی ایک دوسرے کو قطعاً غیر ضروری سمجھ کر اطمینان سے اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے ہیں تو اس نے پرجوش انداز میں جے ڈبلیو بندھن سینٹر کی مالکہ اور جذبات کی ملکہ' حسن کی دیوی کو اسٹیج پر رونق افروز ہونے کے لیے مدعو کیا۔ اس کے بعد شاعر کو بلایا گیا۔ یہ حضرت غافل بدایونی تھے' اس قسم کی محفلوں کی رونق دوبالا کرنے والی چیز!

ابھی غافل صاحب نے نظم کا پہلا شعر پڑھ کر دوسرے شعر میں آواز کے گل کھلانے اور پھلجھڑیاں چھوڑنے کا آغاز کیا ہی تھا کہ عین انترے کے عروج پر جندوڈے نے انہیں ایک طرف دھکیل کر کہا۔

''ذرا ایک منٹ کے لیے اپنی یہ ٹیں ٹیں بند کریں جناب! ایک ضروری اعلان کرنا ہے۔''

یہ ضروری اعلان مجھ سے متعلق تھا۔ جندوڈا چنگھاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''عظیم دانشور' پروفیسر بی کے بٹالہ جو ڈیوٹی تمہارے ذمے لگائی گئی ہے' اس میں غفلت شعاری ہو رہی ہے۔ تم اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر حاضرین میں آبیٹھے ہو۔ واپس وہیں جاؤ' بلیاں سب چیزوں کا بیڑہ غرق کر رہی ہیں۔۔۔اعلان ختم ہوا' آؤ جی بدایونی صاحب! شروع ہو جاؤ۔''

غافل بدایونی نے جھک کر حاضرین کو سلام کیا اور روہانسی آواز میں دوبارہ نظم شروع کی۔ جندوڈا اس عرصے میں دانت کچکچاتا' کلبلاتا اور پہلو بدلتا رہا۔ شاعر جب نظم کے آخری شعر پر پہنچ کر اسے مکرر ارشاد کرنے لگا تو جندوڈے سے نہ رہا گیا۔ وہ لپک کر اٹھا اور ایک جھٹکے سے غافل کو پیر سے دھکیلتے ہوئے بولا۔

''بس جی' آپ کا کام ختم ہوا' تشریف لے جائیں۔۔۔ ہاں تو خواتین و حضرات اب آپ دل جگر تھام کے بیٹھیں' میری باری آئی۔''

جب بار بار اس نے لمبے وقفے دینے شروع کیے اور آوازیں دے دے کر میری کمک لینی شروع کی تو حاضرین کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ لوگ پہلو بدلنے کھنکھارنے اور باتیں کرنے لگے۔

''مجھے معلوم ہے چین کے شہزادو! جندوڈے نے کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے اچانک اپنی آواز بلند کر دی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ آپ بحالی جمہوریت کے سلسلے میں پریشان ہیں' پوری قوم کی یہی سوچ ہے۔ میں بھی صبح سے یہی سوچ رہا ہوں کہ بحالی جمہوریت کے لیے مجھے کیا کرنا چاہئے اسی لیے آپ کو مدعو کیا ہے۔''

لوگ نے یک دم اس طرف کان لگا دیئے' حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ میں نیم تاریکی میں رینگتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھا اور اکڑوں بیٹھ کر میں نے جندوڈے کی پنڈلی پر چٹکی لی۔ جندوڈا اچھل پڑا' دھاڑ کر بولا۔

''جب ہم جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو مخالف ہماری چونڈیاں کاٹتے ہیں۔ یہ لوگ جمہوریت کی قدر و قیمت نہیں پہچانتے' بڑے افسوس کی بات ہے کہ مجھ پر خفیہ حملہ کر دیا گیا ہے۔۔۔ بہرحال' اس حملے کو جاری رہنے دیں' میں اپنی بات پوری کروں گا۔''

''کون ہے۔۔۔؟'' ایک بڑی بی نے سہم کر چیخ ماری۔ ''میری وگ پکڑ کے کس نے کھینچی ہے؟''

''کون ہے سامراجی ایجنٹ؟'' جندوڈا چنگھاڑتا خم ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ''باز آجاؤ اپنے سامراجی ہتھکنڈوں سے خبردار۔ نہتی عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرنا' یہ تمہاری ماں اور نانی کے برابر ہیں۔''

جندوڈے کا اتنا کہنا غضب ہو گیا' بڑی بوڑھیاں دھاڑتی چنگھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہر طرف سے جندوڈے پر لعن طعن ہونے لگی۔ ایک بڑی بی تو اس قدر جوش میں آئیں کہ انہوں نے اسٹیج پر جوتی کھینچ ماری جو عین نشانے پر لگی یعنی سیٹھ کریم داد چھڑی والے بھنا گئے اور دھڑام سے

جھٹکے پہ جھٹکا

✿ ہر بتائی گئی بات میں دوسری کہانی تلاش کرنا عورت کا ہی کام ہے۔۔۔۔محمد عباس
☆ عورت بات کی تہہ تک جاتی ہے آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟
✿ دُنیا میں ہر طرف اَمن تھا۔۔۔۔اور پھر عورت آ گئی۔
☆ اور پھر ہر طرف بہار چھا گئی ہے' نا!
✿ اپنے بیسٹ فرینڈ کی غیبت عورت کا ہی کام ہے۔
☆ ہاں' کیوں نہیں' مرد تو تعریف کرتے نہیں جھکتے' نا!
✿ گھر کی دُنیا میں امریکہ کا کردار ہمیشہ عورت کرتی ہے۔
☆ اور مرد ہمیشہ اِنڈیا کا۔ ہے' نا!
✿ اور یہ لڑکیوں کی کتابیں لڑکوں کے پاس پہنچ کر ہی گرتی کیوں ہیں؟
☆ اور لڑکوں کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ کتابیں گرنے لگتی ہیں؟
✿ محبت اندھی ہوتی ہے تو صرف خوبصورت لوگوں سے کیوں ہوتی ہے؟
☆ اَب پتا چل گیا نا' کہ مرد جھوٹ بولنے میں ماہر ہوتے ہیں۔

محمد اسلم بلوچ' کلور کوٹ

کرسی سمیت فرش پر الٹ گئے۔ کسی جوشیلے نوجوان نے بھرپوری کارکردگی دکھانے کے لیے مین سوئچ آف کر دیا۔ ہر طرف ''پھرر پھرر' میاؤں میاؤں' ہائے ہائے'' گونجنے لگی۔ چند خائف حاضرین نے کھٹا کھٹ لائیٹر اور ماچس جلائیں جنہیں نسبتاً کم خائف ناظرین نے پھونکیں مار کر بجھا دیا۔

''ہائے میری وگ---'' ایک چیختی ہوئی آواز آئی۔

''اف میری بتیسی---'' ایک پوپلی آواز لہرائی۔

''آہ میری عینک---'' ایک ڈگمگاتی ہوئی آواز لڑکھڑائی۔

پھر کرسیاں گھومنے اور پلیٹیں چلنے لگیں' میزیں الٹنے اور ماچسیں جلنے لگیں۔ کسی نے دانت کچا کچا کر ایک مکہ میری پسلی میں رسید کیا' جواباً میں نے دونوں ہاتھوں سے حملہ آور کو پرے دھکیلا اور مکہ مارنے سے پہلے اس کا سر ٹٹولا میرے ہاتھ میں جندوڈے کا شملہ آیا۔ میں نے اسی پر اکتفا کی اور پھرتی سے پگڑی اتار کر سیڑھیوں کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اوپر سے کوئی نیچے آ رہا تھا' ہم دونوں دھپ سے گرے۔

''مار دیا ظالم!''

گرنے والے نے اٹھنے کی کوشش میں پھر گرتے اور مجھے گراتے ہوئے کہا۔

''مار دیا' شہر بلا کے ظالموں نے مار دیا۔''

میں چونک پڑا' یہ آواز تو خاصی جانی پہچانی تھی۔ میں نے جلدی سے سنبھل کر اٹھتے ہوئے اسے اٹھایا۔

''چوٹ تو نہیں آئی' چچا جان؟''

''اتنی خاص نہیں---'' گرنے والے نے کہا۔ ''غالباً دو چار پسلیوں پر زد پڑی ہے' تم پروفیسر بٹالہ تو نہیں؟''

''بے شک---'' میں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ ''اور آپ کو تو میں آواز ہی سے پہچان گیا ہوں۔ چچا نصیر الدین عرف کالی بدریا۔''

''تمہارے منہ میں گھی شکر---'' نصیر الدین نے کہا۔ ''باہر نکلیں یا نیچے چلیں۔''

میں نے کہا۔ ''نیچے تو اب ٹوٹی ہوئی پلیٹوں کے علاوہ آپ کو کچھ نہیں ملے گا' باہر ہی چلتے ہیں۔''

ہم دونوں آہستہ آہستہ کراہتے اور اپنے سروں اور جسموں کو سہلاتے اوپر آئے۔ اوپر کھلی ہوا میں آتے ہی چچا نصیر الدین کے اوسان بحال ہو گئے' پھر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

''بہت بہت خیر مبارک ہو۔''

''خیر مبارک---'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کس بات کی مبارک؟''

''شادی دفتر کھولنے کی---'' چچا نصیر باچھیں باچھیں پھیلا کر بولا۔ ''جندوڈے برخوردار نے مجھے خط لکھ کر اس دعوت میں بلایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی میں یہاں پہنچوں گا' فوراً میرا کام ہو جائے گا۔''

''کام---؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''کام تو ابھی ہم نے شروع نہیں کیا۔''

اس سے کیا فرق پڑتا ہے---'' چچا نصیر نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''برخوردار نے میرے لیے رشتہ پہلے سے ڈھونڈ رکھا ہے۔''

''رشتہ؟''

''پکا' پکا---'' چچا نصیر پرجوش انداز میں بولا۔ ''جذبات کی ملکہ' پریوں کی رانی' مدھوبالا ثانی' مس گل بنفشہ بی اے لافانی! جندوڈے نے اس کی تصویر بھی مجھے بھیجی تھی اور اس کے ہوش ربا حسن کی تفصیلات بھی مجھے لکھیں تھیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ بات پکی ہو چکی ہے۔ میں آج پہنچ جاؤں تاکہ تقریب کے فوراً بعد میرا نکاح اس بی بی کے ساتھ باندھا دیا جائے۔ صد ہزار آفرین ہے برخوردار جندوڈے اور آپ کی مشترکہ کدو کاوش' تلاش و جستجو پر۔''

چچا نصیر الدین کی تحویل میں نقد رقم کے علاوہ ایک زنانہ انگوٹھی ایک مردانہ تلے والی جوتی' ایک حد درجہ شوخ رنگ کا مردانہ کرتہ لاچہ اور پگڑی تھی۔ یہ یقیناً ہونے والی شادی کا ساز و سامان تھا۔ اور پھر حیران کن انداز میں دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ نکاح کے چھوہارے اور لڈو کھاتے ہوئے میں سوالیہ انداز میں جندوڈے کی طرف دیکھتا رہا جو مس گل بنفشہ بی اے کی چرنوں میں جھکا ہوا کہہ رہا تھا۔

''چچی جان! سسرال جاتے ہی چچا جان کا بکرا میری طرف چلتا کروائیں۔ اس بکرے کی بھنی ہوئی ران نوش کر کے میں تاعمر آپ کو دعائیں دوں گا۔''

اس سے بھی حیران کن عمل یہ ہوا کہ جندوڈے کی عاجزانہ درخواست پر بڑی بی نے ناک بھوں چڑھانے کی بجائے اٹھلا کر کہا۔

''چل ہٹ شریر کہیں کا؟''

مصنف کا نوٹ: ناچیز مصنف کا جی تو چاہتا تھا کہ وہ آپ کی معلومات اور دلجمعی کی خاطر نکاح کی جملہ تفصیلات اور جزئیات بھرپور انداز میں تحریر کرے لیکن خدا کے علاوہ سنسر کی مجبوریاں بھی دامن گیر ہیں لہٰذا تھوڑا لکھے کو بہت جانیئے اور جہاں جہاں کہانی نے اچانک زقند لگائی ہے' وہاں اپنے تخیل کو پرواز کی زحمت دیجیے' نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوگا۔

☆☆

دل دریا

☆ سید ابرار بخاری

تاہیے کے کانوں میں جب رُخصتی کے شادیانوں کی آوازیں پہنچیں تو غصے، رنج اور افسوس سے اُس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں، اُس کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں، اُس نے دانت کچکچائے اور بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔

''راجو---!''

مَیں نے اُس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھا اور اُس پر تھپکیاں دے کر اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ جس وقت رجو دُلہن بنی ہوئی، اپنی ہی طرح بجی سنوری کار میں بیٹھی تو تاہیے سے برداشت نہ ہو سکا اُس نے رُخ بدلا اور درخت کے تنے پر جس کے ساتھ ہم کھڑے تھے، تابڑتوڑ مکے برسانے شروع کر دیئے۔ مَیں نے تاہیے کو بڑی مشکلوں اور منتوں سے اُس پیڑ کے تنے سے دُور کیا لیکن اُس دوران تاہیے کے دونوں ہاتھ چھل چکے تھے اور اُن سے خون جھلکنے اور چھلکنے لگا تھا۔ تاہیے نے زور لگا کر اپنے بدن کو میرے بازوؤں سے آزاد کروایا اور اُدھر نگاہ ڈالی جہاں ایک کار اُس کی اُمیدوں، آرزوؤں کو روندتی ہوئی اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی دھول میں غائب ہو رہی تھی۔ تاہیا بچوں کی طرح روتا رہا۔ مچلتا اور سسکتا رہا۔ دُنیا اور دُنیا والوں کو بُرا بھلا کہتا رہا جس کی وجہ سے اُس کی رجو، اُس کی محبت اُس سے جدا ہو گئی تھی۔ مَیں نے آنسو بہاتے تاہیے کے آنسو بہاتے چہرے کو دیکھا۔ ٹھنڈی سانس بھری اور اُس کا بازو پکڑ کر کہا۔

''چل، تاہیے! گھر چلیں۔''

تاہیا چپ چاپ آنسو بہاتا رہا اور مجھے دیکھتا رہا۔ مَیں نے تاہیے کو ایک نظر اوپر سے نیچے تک دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر سوچا کہ محبت میں کتنی طاقت ہے جس نے اِس کڑیل جوان کو بھی اندر باہر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ جس نے ہمیشہ چھاتی نکال کر چلنا سیکھا تھا، آج بے بسی کے مجسم پیکر میں ڈھل گیا ہے--- یہ سب سوچتے سوچتے خود میرا دل بھی بھر آیا، مَیں نے تاہیے کے بازو پر اپنے ہاتھ کی گرفت کو مضبوط کیا اور پھر قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چل، تاہیے! چلیں۔''

تاہیے نے اِس بار نہ کچھ کہا اور نہ کیا۔ چپ چاپ میرے ساتھ قدم بڑھا دیئے۔ جب ہم آخری کھیت کی حد کراس کر کے گاؤں کے آخری مکان تک پہنچے تو مَیں نے تاہیے کے بازو پر ایک بار پھر تھپکی دی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے صبر کی تلقین کی۔ اُس نے گہری سانس لی اور میری طرف دیکھ کر آنکھیں بند کر کے سر کو ہلایا۔ پھر ہم دونوں نے اپنے قدم بڑھانے شروع کیے۔ پہلے تاہیے کا گھر آیا، دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر مَیں نے تاہیے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر صبر کی تلقین کی، تاہیے نے سر ہلایا اور تھکے تھکے قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔ مَیں نے بھی ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے گھر کو چل دیا۔

☆☆

مَیں تاہیے اور رجو کی محبت کا واحد گواہ تھا۔ رجو اور تاہیے کی محبت کی خوشبو صرف مَیں نے سونگھی تھی۔ وہ بھی صرف اِس وجہ سے کہ تاہیا میرا لنگوٹیا تھا اور ہر بات مجھ سے کرنے کا عادی، ہم دونوں کا یارانہ اِس قدر گہرا تھا کہ جب تک ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی بات نہ کہہ لیتے اور ایک دوسرے سے مشورہ نہ کر لیتے۔ ہمیں اطمینان نصیب نہ ہوتا تھا مثلاً کالج میں داخلہ لینے کے متعلق تاہیے سے رائے مانگی تو اُس نے کالج میں داخلہ لینے اور پڑھنے کی شدید مخالفت کی اور کہا تھا کہ ایک دِن تم پچھتاؤ گے کہ تاہیے کی بات کیوں نہ مانی اور واقعی آج تک پچھتاتا ہوں کہ بی اے کر کے بھی ڈھور ڈنگروں کے آگے چارہ اور کھل بنولہ ہی ڈالنی تھی تو اِس سے تو اچھا تھا کہ نہ ہی پڑھتا کہ خوامخواہ ہی خود پر غصہ آتا ہے اور

شرمندگی ہوتی ہے کہ "بابو" انسانیت کی خدمت کرنے کی بجائے حیوانیت کی خدمت کر رہا ہے--- تاہیے نے رجو کی محبت کا اقرار کرتے ہوئے اپنی بیقراری کا اظہار کیا تھا تو میں نے منع بھی کیا لیکن عشق کا بھوت مجھ سے زیادہ طاقتور تھا۔ تاہیے نے اُس کی مانی اور اَب پچھتا رہا تھا۔

رجو اور تاہیا دونوں آپس میں قریبی رشتے دار تھے۔ دونوں ایک ساتھ کھیلتے کودتے جوان ہوئے تھے۔ دونوں کے درمیان نہ تو روایتی ڈائیلاگ کا تبادلہ ہوا' اُن کی راتوں کو ملاقاتیں بھی نہیں ہوئیں اور نہ دِن کو اُنہوں نے آنکھیں لڑائیں لیکن دونوں کے دِل کے تار ایک ہی بار ہم آہنگ ہو کر بج اُٹھے۔ دونوں کے بدنوں نے ایک دوسرے کی طرف ایسی مقناطیسی لہریں اُچھالیں کہ اُن کی کشش سے دونوں کے دِل ایک دوسرے سے ٹھک کر کے جڑ گئے۔ دونوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ گاؤں بہت پیارا ہے' کوّے کی کائیں کائیں کتنی اچھی ہے کہ کسی پیارے کے آنے کا سندیسہ دیتی ہے کھیت میں پھولی ہوئی سرسوں کس طرح محبوب کی یاد دلانے لگتی ہے' رات کو چاند اور اُس کی چاندنی سونے کیوں نہیں دیتی اور اگر نیند آتی ہے تو اتنی میٹھی کیوں آتی ہے۔ اُن دِنوں رجو اپنا حسن سنوارنے میں' تاہیا اپنا بدن بنانے میں اور میں اپنا مستقبل تعمیر کرنے میں مصروف تھا۔ حق تو یہ ہے کہ تینوں اپنے اپنے شعبوں میں ناکام رہے۔ رجو نے شہر والیوں کو بمعہ میک اَپ کے نہیں دیکھا تھا کہ وہ اپنا اور اُن کا موازنہ کر سکتی۔ بیچاری کا میک اَپ خالص سرسوں کا تیل' تاجے پھیری والے کا سرمہ نورانی' سپیشل لاہوری منجن اور کڑوا داتن تھا۔ کبھی کبھی اپنے حسن کو چار چاند لگانے کے لیے وہ تبت کریم اور سستی ترین سرخی کا استعمال بھی کر لیتی جو کھانا کھاتے وقت ہونٹوں سے ٹھوڑی' رُخسار اور خوراک کے نوالوں کے ساتھ معدے میں اُتر کر اُسے بھی "سرخرو" ہونے کا موقعہ عطا کرتی لیکن یہ موقعے سال میں دو چار بار ہی آتے جب گاؤں یا برادری میں سے کسی کا شادی بیاہ ہوتا۔ رہا تاہیا تو وہ اپنی پہلوانی کو چمکانے کے لئے خالص دودھ' خالص دیسی گھی اور دیسی مرغ کا استعمال کرتا تھا اور وہ بھی بے دریغ لیکن ڈنڈ بیٹھکیں وہ گن کر لگاتا تھا۔ اُس کی بدولت اُس کا بدن سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا تھا۔ البتہ دو چار گاؤں کی حدود پار کرنے کے بعد اُسے اُس کی پہلوانی کی بدولت کوئی جانتا بھی نہ تھا اور رہا میں تو میرے جیسے بی اے پاس شہر میں سینکڑوں سڑکوں پر خجل خوار ہوتے اور نوکری کے لئے دفتروں میں جوتیاں چٹخاتے پھر رہے تھے لیکن چونکہ ہم تینوں گاؤں کے باسی تھے اور گاؤں بھی وہ جو شہر سے دس بارہ میل دُور تھا اِس لئے گاؤں کی حد تک ہم تینوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ رجو' تاہیا اور میں بالترتیب اندھوں میں کانی رانی اور اندھوں میں کانے راجہ تھے۔

تاہیے نے ایک بار رجو سے کوئی اپنی نشانی دینے کو کہا۔ رجو نے دوسرے دِن تاہیے کو اپنے بالوں کا وہ گچھا عنایت کر دیا جو کنگھی کرتے ہوئے ٹوٹے اور کنگھی میں ہی اٹک کر رہ گئے۔ تاہیے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اُنہیں چوما اور پھر مٹھی کو بند کر کے اُنہیں جیب میں ڈالا اور چمکتے دمکتے چہرے اور شاداں فرحاں بدن کو لیے کشاں کشاں مجھے بتانے کو چل پڑا۔ اُس نے پہلے تو مجھے مبارکباد دی پھر انتہائی احتیاط سے اپنی بند مٹھی کو جیب سے نکالا اُسے کھولا' ناک کے قریب لا کر بالوں کو سونگھا' پھر اُنہیں چوما' ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی اور ہتھیلی میرے آگے کر دی جس میں سیاہ بالوں کا گچھا پڑا مجھے دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے تاہیے کو دیکھا تو تاہیا خوشی سے کانپتی لرزتی آواز میں منمنایا۔

"یہ رجو نے مجھے نشانی کے طور پر دیئے ہیں۔"

میں نے غور سے اُنہیں دیکھا اور منہ بنا کر کہا۔

"گدھے! اگر اُس سے کوئی نشانی ہی لینی تھی تو کوئی رومال' چھلہ' انگوٹھی لیتا تو اُٹھا لایا یہ بال' بغیر کسی لیبارٹری میں چیک کروائے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اِس بالوں کے گچھے میں پچاس فیصد سرسوں کا تیل' بیس فیصد گدھوں' گھوڑوں' خچروں کی قدرتی کھاد' بیس فیصد سکری اور دس فیصد مردہ جوئیں اور اُن کی آل اولاد ہے۔"

لیکن وہ میری باتوں سے بے نیاز اُس بالوں کے گچھے کو بار بار چومنے اور آنکھوں سے لگانے میں مصروف رہا۔ میں نے کہا۔

"تاہیے! اگر تو نے یہی نشانی لانی تھی تو مجھے کہتا' میں لا دیتا۔ رجو روز کنگھی کر کے اِن ٹوٹے ہوئے بالوں کو اُس دیوار کی درزوں میں اُنگلی سے اڑستی ہے جو ہمارے اور اُن کے مکان کے درمیان سانجھی ہے اور جس کی درزوں میں سے ہماری خواتین جھانک جھانک کر ایک دوسرے کے اندرونی رازوں سے آگاہی حاصل کرتی ہیں۔"

اِس سے پہلے کہ تاہیا مجھے کوئی جواب دیتا' ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اُس بالوں کے گچھے کو تاہیے کی ہتھیلی سے اُڑا لے گیا۔ کچھ دُور جا کر وہ زمین پر گرا اور پھر ہوا کی موجوں سے زمین پر کسی گیند کی طرح لڑھکتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ تاہیا فوراً اُس کی طرف جھپٹا لیکن اُس کے پکڑتے پکڑتے بھی اُس گچھے سے کئی بال زمین کی خاک میں خاک ہو گئے۔ تاہیا اُس بالوں کے بچے گچھے کو دوبارہ ہاتھ کی ہتھیلی میں قید کر کے میرے پاس لے آیا اور آہستہ آہستہ اُس پر پھونکیں مار کر بالوں سے گرد کے ذرّات اُڑانے لگا۔ چند لمحوں بعد اُس نے حسرت سے اُس جگہ کو

دیکھا جہاں پر رجو کے بال گم ہو گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور اُس کی دونوں ہتھیلیوں اور ہتھیلیوں میں موجود بالوں میں گم ہو گئے۔ مَیں نے حیرت سے اُس کو دیکھا۔ ''ہوں'' کر کے گردن کو جنبش دی اور دِل میں کہا کہ ''پاگل!''

ایک دوپہر کا ذِکر ہے کہ مَیں اور تاہیا کھیتوں کے درمیان بنی کھال کے کناروں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گاؤں کی طرف سے رجو لسّی کی چاٹی پر روٹیوں کی چنگیر رکھے آتی دِکھائی دی۔ وہ دوپہر کا کھانا لے کر اپنے ڈیرے کی طرف جا رہی تھی جب وہ ہمارے پاس سے گزرنے لگی تو تاہیا بولا۔

''رجو! ہم کو بھی تھوڑا سا اَن پانی کروا دے۔ رَبّ دی قسمے، صبح سے بھوکے بیٹھے ہیں۔''

رجو نے اپنے قدم روک لیے اور رُخ ہماری طرف کر کے بولی۔

''کھا کھا کر سانڈ ہوتا جا رہا ہے، کم کھایا کر۔ یہ تیرے جیسے اور تیرے اِس مسٹنڈے دوست جیسے ویلے ناکاروں کے لیے نہیں ہے۔ یہ اُن کے لیے ہے جو صبح سے شام تک بیلوں کی طرح کام میں جتے رہتے ہیں۔ زمین کا سینہ چیر کر اُس سے اپنے اور اپنے جیسی خدا کی دوسری مخلوق کے لئے روزی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں۔ تمہارے جیسے ہڈحرام نہیں ہیں، کام کے نہ کاج کے، دُشمن اناج کے، ہونہہ!''

یہ کہہ کر وہ چل پڑی۔ غصہ تو مجھے بہت آیا لیکن اِس سے پہلے کہ مَیں کچھ بولتا، تاہیا بولا۔

''میرا بھی تیرے لیے مشورہ ہے کہ کچھ زیادہ کھایا پیا کر۔ کیسے فاقہ زدہ بکری کی طرح تیری پسلیاں نکلی ہوئی ہیں۔''

رجو نے قدم روکے اور گردن موڑ کر بولی۔ ''تاہیے! دُر فٹے منہ تیرا۔''

تاہیا زمین سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''رجو! تیرا دو بارہ دُر فٹے منہ۔''

چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے، آہستہ آہستہ دونوں کے ہونٹوں پر پہلے ہلکی سی مسکراہٹ ظاہر ہوئی، پھر دونوں کے دانت ظاہر ہوئے اور اِس کے بعد دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ رجو ہنستے ہنستے ڈیرے کی طرف چل پڑی، تاہیا ہنستے ہنستے زمین پر بیٹھ گیا اور ایک ٹانگ سے دھوتی اُٹھا کر پنڈلی پر خارش کرنے لگا۔ مَیں جو احمقوں کی طرح دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ مَیں نے زمین سے گھاس کی پتی اکھیڑی اور اُسے کان میں پھیرتے ہوئے سوچنے لگا کہ نامراد غصے کس بات پر ہوئے تھے اور ہنسے کس وجہ سے تھے؟

رجو اور تاہیے دونوں کے گھرانے خاصے خوشحال اور کھاتے پیتے تھے۔ اپنی زمینیں اور کھیتی باڑی تھی اور دونوں گھرانے گاؤں کے چوہدری ہونے کا استحقاق رکھتے تھے۔ تاہیے نے اپنے ڈیرے پر ہی چھوٹا سا اکھاڑہ بنا رکھا تھا جہاں پر تاہیا اور گاؤں کے چند دوسرے نوجوان جو پہلوانی اور کسرت کے شوقین تھے، جمع ہو کر تیل لگاتے، سردائی گھوٹتے اور ایک دوسرے کو اپنے جسموں کے نیچے روند کر خوش ہوتے۔ تاہیے نے اپنا جسم دبوانے، سردائی گھوٹنے اور تیل لگانے کے لئے ناموکمہار کو رکھا ہوا تھا جو چالیس روپے روز نقد لیتا، بچی ہوئی سردائی پی کر جسم بناتا اور انواع واقسام کی گالیاں کھاتا تھا۔ تاہیے کو اُس سے بے شمار شکایتیں تھیں جن میں سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ نامراد سردائی کے بادام موٹے موٹے پیتا ہے، جس کی بدولت تاہیے کو صرف باداموں کی خوشبو ہی آتی ہے اور ناموکو نیچے بیٹھے ہوئے بادام، ایک بار یہی چیک کروانے کے لئے

چاپلوسی

ایک کامیاب زندگی کے لئے جہاں دیگر لوازم ضروری ہیں، وہیں چاپلوسی بھی ازحد ضروری ہے۔ اگر آپ کو چاپلوسی کا عظیم ہنر نہیں آتا تو ہم آپ کا ہاتھ دیکھے اور زائچہ بنائے بغیر بتائے دیتے ہیں کہ آپ کی لائف ایک ڈم تھرڈ کلاس گزرے گی۔ اتنی کہ آپ لامحالہ کہہ اُٹھیں گے کہ ''ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے''---- زیرِ نظر تحریر رقم کرنے سے پیشتر راقم کو بھی اِس کی افادیت سے مطلق آگاہی نہیں تھی مگر بھلا ہو ایک شناسا کا کہ جنہوں نے ہمیں چاپلوسی کے اِسرار و رموز سمجھاتے ہوئے زندگی گزارنے کا آسان ترین رستہ سمجھایا۔ موصوف چاپلوسی میں یکتائے عالم ہیں۔ اِن کے پائے کا چاپلوس چشمِ فلک نے آج تک نہیں دیکھا۔ موصوف ایک سرکاری محکمے سے تعلق شدہ ہیں۔ آپ ایک بار فرما رہے تھے کہ تمام کے تمام افسران میری مٹھی میں ہیں، یہ سن کر ہم نے بہ حیرت اُن کی مٹھی کی طرف دیکھا اور کہا کہ دِکھاؤ۔ ہماری اِس بات سے موصوف بہت مسرور ہوئے اور بولے کہ تمہارا ہیومر بہت عمدہ ہے۔ بعدازاں ارشاد ہوا کہ میاں! میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب میری نیچے لگے ہوئے ہیں---- اب کی بار ہمیں جرأت نہ ہوئی کہ اُنہیں کرسی سے اُٹھا کر کرسی ملاحظہ کرتے لہٰذا ہم نے پوچھا کیسے؟ جواب میں اُنہوں نے افسران کو قابو کرنے کی جو ترکیب بتائی، وہ یہ تھی کہ پہلے افسران کے سامنے تعریف و توصیف کی بین بجاؤ، آہستہ آہستہ دھڑ دھڑ میٹھی میٹھی ڈھیرے ڈھیرے۔ مست ہو کر افسر جھومنے لگیں گے اور بے خود ہو جائیں گے۔ بس یہی وہ وقت ہوگا جب چاپلوسی کا پھندا پھینکا جائے۔ مگر حضرت! تعریف بھی تو چاپلوسی ہی کو کہتے ہیں۔ ہم نے مقدور بھر فراست کا مظاہرہ کیا جسے موصوف نے یہ کہہ کر پائے حقارت سے ٹھکرا دیا کہ تم ابھی طفلِ مکتب ہو۔ میاں! چاپلوسی اور تعریف میں نمایاں فرق ہے۔ مَیں اگر تم سے کہوں کہ تم خوبصورت ہو (مَیں صرف فرض کر رہا ہوں) تو یہ ہوگی تعریف لیکن اگر مَیں یہ کہوں کہ فلاں شخص اتنا خوبصورت نہیں جتنا کہ تم ہو تو یہ ہوگی چاپلوسی---- صاحبو! یہ مدلل تشریح سن کر تو ہم حیران رہ گئے۔ واقعی ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔ یہ گر پا لینے کے بعد ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اپنے پیارے پیارے راج دُلارے قارئین تک بھی اِسے پہنچائیں تاکہ سینہ بہ سینہ چلتا رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ اب ہم اتنے بھی خود غرض نہیں ہیں کہ کوئی کام کی بات ہمیں معلوم ہو اور ہم اپنے قارئین کو نہ بتائیں (چاپلوسی مت سمجھ لیجیے گا)

محمد سعید خان

تاہیے نے تفتیشی آفیسر یعنی مجھے ساتھ لیا اور جا چھاپہ مارا۔ ناموا بھی بادام گھوٹ رہا تھا۔ تاہیے نے ایک جگہ سے تھوڑی سی سردائی اُنگلی سے اُٹھائی اور آنکھوں کے سامنے لاکر پوچھنے لگا۔

''اوئے ناموا یہ کیا ہے؟''

نامو نے اُونٹ کی طرح گردن آگے بڑھائی اور غور سے دیکھ کر بولا۔

''چوہدری جی! یہ کالی مرچ ہے۔''

تاہیے نے دو ہنٹر اُس کی کمر پر رسید کیا' دس' بارہ گالیاں نکال کر اُس کی مستقبل میں آنے والی اور سابقہ جانے والی نسلوں کی پیڑھیوں میں مختلف جانوروں کو باریابی کا شرف بخشا اور بولا۔

''حرامخور! یہی کالی مرچیں گھر ہانڈی میں ڈالتے ہو---؟'' پھر اُس کی گردن کو اپنے بازو میں جکڑ کر اپنی اُنگلی کے قریب کیا اور بولا۔'' آنکھیں کھول کر دیکھ' یہ کالی مرچ نہیں' تیری طرح کالے کرتوتوں والی کالی سیاہ مکھی ہے۔''

بعد میں اُس نے مکھیوں اور نامو کے شجرہ نسب کی مزید مٹی پلید کی اور غصے میں آکر سردائی گھوٹنے والے ڈنڈے کو زور سے مٹی کی دوری پر مارا۔ دوری کے تین چار ٹکڑے ہو گئے پھر اُس نے قمیص پہنی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''چل' یار! گھر کو چلیں' یہ گدھا تو مجھے الابلا کھلا کر بیمار کرنے اور مارنے پر تلا بیٹھا ہے۔''

ہم گاؤں کی طرف چل پڑے۔

راستے میں رجو کے باپ کا ڈیرہ آ گیا۔ تاہیا بولا۔

''یار! بڑے زوروں کی پیاس لگ رہی ہے۔ چاچا آج کل گنوں کو بیل رہا ہے' چل چل کر رَو پیتے ہیں۔''

اور اِس سے پہلے کہ مَیں ہاں یا ناں میں جواب دیتا' اُس نے پگڈنڈی سے ہٹ کر ڈیرے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ رجو بھی ڈیرے پر موجود تھی اور ایک بڑے کڑاہے کے نیچے گنوں کا خشک پھوک جلا کر گنے کے رس کو کاڑھ رہی تھی اور ایک بڑے سے چمچ کے ساتھ اوپر آئی ہوئی میل کو اُتار رہی تھی۔ اُس نے کنکھیوں سے ہمیں دیکھا اور اپنے کام میں مصروف رہی۔ رجو کے باپ نے ہمیں دیکھا تو حقے کو ہاتھ میں پکڑے اُسے گڑگڑاتا ہوا ہماری طرف آ گیا اور حقے کی نے منہ سے نکال کر بولا۔

''اوئے' جوانو! آج کس طرح راستہ بھول گئے؟''

تاہیا بولا۔''اِنہی رستوں پر پل بڑھ کر تو جوان ہوئے ہیں تو اِنہیں کس طرح بھول سکتے ہیں؟ بس کام سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ آج رَو پینے کو جی چاہا تو سوچا چاچے کو سلام کر آئیں لیکن چاچا تو نے تو انجن ہی بند کر دیا ہے۔''

چاچا بولا۔''اوئے' تو اِسے چالو ہونے میں کون سے سال لگتے ہیں؟ ابھی لو---'' پھر وہ رجو کو آوازیں دینے لگا۔''رجو پتر' رجو!''

رجو وہیں سے پکاری''آئی' ابا---!''

چند لمحوں بعد وہ ہمارے پاس کھڑی تھی۔ چاچا اُسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''پتر! ذرا تھوڑی سی رَو تو گنوں سے نکال دے۔ جوانوں نے ذرا منہ کا ذائقہ بدلنا ہے۔''

رجو نے ڈوپٹے سے اپنے چہرے اور گردن پر آئے ہوئے پسینے کو صاف کیا اور بولی۔

''مجھے تو پہلے ہی پتہ لگ گیا تھا کہ مفتے آئے کھڑے ہیں۔''

چاچا بولا۔''نہ نہ دھیے! اِس طرح نہیں کہتے--- چل' میرا پتر! جلدی سے رَو نکال کر جوانوں کو پلا مَیں ذرا کڑاہ کا خیال رکھتا ہوں۔''

چاچے نے کڑاہ کی طرف قدم بڑھا دیئے اور رجو اور ہم نے بیلنے کی طرف۔ رجو نے جنریٹر سٹارٹ کیا' اُسی کے ساتھ دونوں بیلنے گھومنے لگے اور اُن کے درمیان میں گنے موت و حیات کی کشمکش سے گزرنے لگے۔ مَیں نے تاہیے کو مخاطب کیا اور کہا۔

''یار' تاہیے! مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم گنوں کا رس نہیں پی رہے' اُن کا خون پی رہے ہیں۔ جس طرح خون ہمارے جسم کے لئے ضروری ہے' اِسی طرح گنے کے جسم کے لئے رس۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں' ایک کا رنگ سرخ ہے' دوسرے کا ہلکا سبز۔''

تاہیے نے ٹھاہ کر کے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑے اور بولا۔

''علامہ صاحب! مجھے تو معاف ہی رکھو۔ یہ مشکل مشکل لفظ اور فقرے یا تو مسجد کے سپیکر میں بولنا یا گھر میں اور یا پھر کسی اپنے جیسے پڑھے لکھے پاگل کے ساتھ۔''

رجو کھلکھلائی' تاہیا بھی ہنسا مجھے ایسے لگا جیسے دونوں مل کر میرا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ مَیں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔''

اور بیٹھ کر گنوں کے بچے کھچے کپڑے اُتارنے لگا۔ مَیں گنوں کو دیکھنے بھالنے لگا اور تاہیا اور رجو ایک دوسرے کو--- مَیں نے ایک گنے کو نکال کر پرے رکھ دیا جس کی چار پانچ منزلوں میں سنڈیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے لیکن رجو نے فوراً اُسے بھی بیلنے میں دے دیا اور

"ارے ارے" ہی کرتا رہ گیا۔ رجو نے انجن بند کیا۔ کنستر کو گھڑے سے نکالا اور ایک بڑے سے سلور کے پیالہ نما برتن میں اُسے ڈالا اور میری طرف بڑھا کر بولی۔

"راجو! پی لے۔"

میں نے تاپیے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آنکھوں دیکھی مکھی نگلنا بہت مشکل کام ہے۔ اب تو گنوں کے خون میں اُن دس بارہ بے گناہ سنڈیوں کا خون بھی شامل ہو گیا ہے جو تیرے ہاتھوں چکی کے دو پاٹوں میں پس کر شہید ہو گئی ہیں۔"

رجو نے اصرار کیا لیکن میرے دِل میں کراہت کا جذبہ کچھ زیادہ ہی بیدار ہو چکا تھا۔ میں نہ نہ کرتا ہوا ذرا دُور بھینسوں کی اُلٹی پڑی ہوئی کھرلی پر جا کر بیٹھ گیا۔ پندرہ بیس قدم دُور تاپیا اور رجو اَب بحث مباحثے میں مشغول تھے۔ تاپیا رجو سے کسی بات پر اصرار کر رہا تھا لیکن رجو انکار کر رہی تھی۔ آخر رجو نے پہلے کام میں مصروف اپنے باپ کی طرف دیکھا' پھر میری طرف نگاہ کی۔ میں جان بوجھ کر ایسے بن گیا جیسے میں اُنہیں دیکھ ہی نہیں رہا۔ رجو نے پیٹھ پھیری' برتن سے ایک گھونٹ بھرا' پھر اُسے تاپیے کی طرف بڑھا دیا جسے وہ غٹا غٹ چڑھا گیا۔ پھر اُس نے اپنی مونچھوں کو صاف کیا اور پکارا۔

"راجو! چل چلیں۔"

ہم نے چاچے کو سلام کی اور گاؤں کو چل دیئے۔ تھوڑی دو جا کر میں نے تاپیے سے کہا۔

"تاپیے! میں نے تو رس اِس لیے نہیں پیا تھا کہ اُس میں سنڈیوں والے گنے کا رس بھی شامل تھا۔"

بولا۔ "یار! تُو تو ہے ہی بیوقوف! اوئے' سنڈیوں کی کون سی ہڈی پسلی ہوتی ہے۔"

باقی راستے نہ میں بولا' نہ تاپیا البتہ میں یہ سوچ سوچ کر ضرور پریشان ہوتا رہا کہ تاپیے نے ایک مکھی کی وجہ سے سردائی نہیں پی تو سنڈیوں والا رس کس طرح پی گیا؟--- پھر یہ سوچ کر دِل کو تسلی دے لی کہ سنڈیاں مکھیوں سے افضل ہوتی ہیں۔

رجو اور تاپیے کے درمیان محبت پروان چڑھتی رہی' چھوٹے چھوٹے تحفوں کا تبادلہ ہوتا رہا لیکن اِس سے پہلے کہ تاپیا اپنے والدین کے ذریعے رجو سے شادی کا ڈول ڈالتا خود رجو کے والدین کسی عزیز کی شادی میں گئے اور رجو کی شادی کا ڈول ڈال آئے رجو کے باپ نے برادری کے بزرگوں کے سامنے زبان دے دی اور تاپیے اور رجو کی محبت پر اپنے فیصلے کی لکیر پھیر دی۔

دوسرے دِن تاپیا ظالم سماج کو گالیاں دے رہا تھا۔ تیسرے دِن تاپیے اور رجو کی خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں "زہر پھونکنے' نہر میں کود جانے' گھر سے بھاگنے" جیسے موضوعات پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ چوتھے دِن رجو نے بھائیوں سے مار کھائی جب لوگ چھڑوانے پہنچے تو اُنہیں بتایا گیا کہ کسی بات پر رجو نے بڑے بھائی کے آگے زبان چلائی تھی۔ بڑا بھائی غصے کا ذرا تیز ہے' بس غصے میں پٹائی کر دی۔ میرے سوا سب نے اِس بات پر یقین کر لیا کیونکہ رجو کا بھائی واقعی بڑا منہ پھٹ اور ہتھ چھٹ تھا--- پانچویں دِن رجو اور تاپیے نے گھر سے بھاگ جانے کا پروگرام بنایا۔ چھٹے دِن ایک بار پھر رجو کے گھر والوں نے دو دِن پہلے والے گر رجو پر آزمائے۔ ساتویں دِن جب میرے یار تاپیے کو رجو ملی تو اُس نے دوپٹے کا پلو منہ میں دبا کر روتے اور ٹھسکتے ہوئے تاپیے سے گزارش کی کہ وہ اُسے بھول جائے' سمجھ لے کہ رجو مر گئی۔ دُنیا میں اُس کا نام و نشان بھی نہیں اور اُسے معاف کر دے کہ وہ اپنے وعدوں پر پورا نہ اتر سکی--- میرے استفسار پر کہ اتنی جلدی رجو کی کایا پلٹی تو کیسے پلٹی تو تاپیا رندھی ہوئی آواز میں بولا کہ پہلے تو بھائیوں اور باپ نے کمرے میں بند کر کے رجو کی ٹھکائی کی' جب دال نہ گل سکی تو باپ نے تمام بھائیوں کو کمرے سے نکال کر اُس کے قدموں میں اپنی پگ اُتار کر ڈال دی کہ وہ اپنے باپ کی عزت کی لاج رکھ لے ورنہ وہ دُنیا اور برادری والوں کو منہ دِکھانے کے قابل بھی نہیں رہے گا یا پھر اِس عزت کے نشان کو روندتی ہوئی چلی جائے' اُسے کوئی بھی نہیں روکے گا اور اتنا رویا کہ رجو کا دِل پسیج گیا اور اُس نے زمین سے پگ اُٹھا کر باپ کے سر پر رکھ دی۔ اِس طرح رجو نے اپنے ہاتھوں سے محبت کی قبر کھودی اور اُسے زندہ ہی دفنا دیا۔ تاپیا اُس فرضی قبر پر کھڑا کتنی ہی دیر تک بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا رہا میں نے پوچھا۔

"تاپیے! اب تم کیا کرو گے؟"

تاپیا دُور خلا میں تکتا ہوا بولا۔ "میں نے کیا کرنا ہے؟ میرے قدموں میں تو رجو اپنی اور اپنی محبت کی قسموں کی بیڑیاں ڈال گئی ہے کہ میں کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھاؤں گا جس سے اُس پر اور اُس کے خاندان پر کوئی حرف آئے یا اُن کی بدنامی ہو۔"

میں نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔ "تاپیے! تیرے نہ ہونے والے سوہرے نے یقیناً وہ فلم دیکھی ہوگی جس میں اِسی طرح کی سچویشن میں ہیروئن کا باپ ایسے ہی ہیرا پھیری سے کام لے کر ہیرو ہیروئن کی محبت پر شب خون مارتا اور پگڑی بیٹی کے قدموں میں ڈال کر ہیرو کو زیرو اور بامراد کو نامراد کر دیتا ہے۔"

پہلے تو تاہیے نے چاچے کو فراڈیا، نوسرباز، چار سو بیس جیسے القابات سے نوازا بعدازاں اُس نے فلم بنانے والے اور فلم میں کام کرنے والوں کو انواع واقسام کی گالیوں سے مستفید کیا لیکن جب اُس نے اپنی زبان کے انجن کو اُس پٹڑی پر ڈالا کہ جس نے فلم دیکھی بھی تھی، اُس کی بھی---
تو مجھے فوراً وہ کام یاد آگیا۔ جو اباجی نے پرسوں میرے ذمے لگایا تھا، جس کو اپنے فطری تساہل کی بدولت میں پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا تھا اور مسلسل اباجی کی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا تھا۔

☆☆

رجو کی شادی کے تیسرے دِن جب تاہیے نے اُس کے شوہر کو دیکھا تو تاہیے پر اُسے قتل کرنے کا بھوت سوار ہوگیا۔ بڑی مشکلوں سے میں نے اُسے سمجھایا اور ٹھنڈا کیا لیکن وہ بار بار ہتھے سے اکھڑ جاتا تھا وہ تو خیر ہوئی، رجو کو اُس کے سسرال والے تیسرے دِن ہی آ کر لے گئے ورنہ کوئی بعید نہیں تھا کہ رجو شادی کے فوراً بعد ہی بیوہ ہو جاتی لیکن اب اُٹھتے بیٹھتے تاہیے کی تان اِسی بات پر ٹوٹتی کہ اُس بجو کی اولاد سے بدلہ لینا ہے۔ وہ بقول اُس کے اُس کا دُشمن نمبر ایک بھی تھا اور آخری بھی---
ایک دِن میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے اپنے آپ کو شاباش دینے کی بجائے لعن طعن کی کہ یہ ترکیب اور سامنے کی بات آخر اَب تک میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی تھی۔ میں فوراً تاہیے کی طرف چل پڑا۔ اِس سے پہلے تاہیا میرے سامنے اپنے دُکھوں اور محرومیوں کی داستان امیر حمزہ کا پنڈورا بکس ایک بار پھر کھولتا، میں نے بغیر کسی تمہید کے اُس سے سوال کیا۔
"تاہیے! تو اپنے دُشمن کو ذلیل خوار کرنا چاہتا ہے، اُس سے بدلہ لینا چاہتا ہے؟"
تاہیے نے فوراً میرے سوال کا جواب سر ہلا کر دیا۔ میں نے کہا۔
"تو یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔"
تاہیا بے تابی سے بولا۔ "وہ کیسے؟"
میں نے کہا۔ "تمہارے علم میں شاید یہ بات ہو یا نہیں کہ تمہارا دُشمن نمبر ایک بھی پہلوانی کا شوق رکھتا ہے۔ تم دونوں کا جوڑ ڈلوا دیا جائے اور تم اُسے چت کر دو تو تمہارے سینے میں بھڑکنے والا الاؤ ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔"
تاہیے نے چند لمحے سوچ بچار میں لگائے، پھر اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اُس نے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چوما، سینے سے لگایا اور بولا۔
"واہ، میرے شہزادے! بدلہ لینے کی ترکیب خوب بتائی یقین کر میں اُس بجو کی اولاد کو اکھاڑے کی مٹی میں یوں روندوں گا کہ وہ کسی کو منہ دِکھانے کے قابل نہ رہے گا---تو جلدی سے جوڑ ڈلوانے کی کوشش کر۔"
یہ بتانا فضول ہے کہ تاہیے اور رجو کے شوہر کا جوڑ ڈلوانے میں کس قدر مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی راضی ہی نہیں تھا، بڑے بوڑھوں کا اعتراض تھا کہ ایک گاؤں کا بیٹا ہے، دوسرا داماد، کوئی جیتے یا ہارے، کسی کے جیتنے پر خوشی نہیں ہوگی۔ ہاں، ہارنے والے کا غم ضرور ہوگا لیکن میں نے اور چند دوسرے افراد نے مل کر جوڑ ڈلوا ہی دیا۔ جوڑ دو ماہ بعد پیر نو لکھے شاہ کے عرس پر ہونا قرار پایا۔ اب تاہیا تھا اور اکھاڑہ، مجھ جیسے جگری یار کو بھی اُس نے جھنڈی دِکھا دی تھی۔ یہ جھنڈی دِکھانا ہی تھا کہ جب پوچھو، پتہ چلتا کہ "اکھاڑے میں ملے گا" اکھاڑے میں جاتا" د گاؤں کے دوسرے شوقیہ پہلوانوں سے داؤ پیچ میں ہی لگا رہتا۔ تاہیے نے پتہ نہیں کہاں سے ایک رُستمِ گوجرانوالیہ بھی ڈھونڈ لیا تھا جو تاہیے کو فن کشتی کے اسرار و رموز اور داؤ پیچ سکھا رہا تھا مجھ جیسے یار کو سلام کرتا اور بس البتہ گھر جاتے وقت وہ مجھے ساتھ لے جانا نہ بھولتا راستے میں رجو کے خاوند کی ایسی تیسی کرنے کی باتوں کے علاوہ قسم ہے جو وہ کوئی اور بات زبان سے کہتا، اُس کی کسرت اور جسم کی اُٹھان دیکھ کر لگتا یہی تھا کہ وہ رجو کے خاوند کی ایسی تیسی کرے ہی کرے۔
کشتی سے پندرہ دِن پہلے تاہیے نے مجھے رجو کے گاؤں بھیجا کہ میں پتہ کروں کہ کامے پہلوان کی تیاری کہاں تک پہنچی ہے۔ یہاں بتاتا چلوں کہ رجو کے خاوند کا نام اکرام اللہ تھا اور اُسے کاما اُسی طرح کہتے تھے جیسے رضیہ رجو تھی، تاج محمد تاہیا تھا اور میں اعجاز احمد راجو تھا---میں عین اُس وقت کامے کے گاؤں پہنچا جب وہ کسرت میں مصروف تھا۔ میں بھی ایک کونے میں کھڑا ہو کر اُسے ورزش کرتے دیکھنے لگا۔ حق بات تو یہ تھی کہ وہ اپنے تاہیے کی جوڑ تھا ہی نہیں میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ کشتی کا فیصلہ پہلے دو چار منٹ میں ہی ہو جائے گا اور یہ فیصلہ سو فیصد تاہیے کے حق میں ہوگا اِسی دوران کامے نے مجھے دیکھ لیا اور ہاتھ ماتھے پر لیجا کر مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی گردن کے اشارے سے اُس کے سلام کا جواب دیا۔ کسرت ختم ہوئی تو وہ باقاعدہ مجھ سے بغلگیر ہو کر ملا اور گھر ساتھ چلنے کا اتنا اصرار کیا کہ مجھے بالآخر اُس کی بات ماننے پڑی۔
گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی وہ پکارا۔
"رجو---اری، رجو! دیکھ تو تیرے گاؤں سے تیرا بھائی باد آیا ہے۔"

رجو سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی فوراً چولہے سے اُٹھ کھڑی ہوئی جو صحن کی ایک دیوار کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ میرے سامنے پہنچ کر اُس نے کہا۔

''سلام ویرا---!''

مَیں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کاما مجھے لے کر ایک چار پائی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

''رجو! لے آ کھانا' آج باؤ اعجاز کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کا مزہ ہی اور آئے گا۔''

رجو کھانے کے دوران اپنے گھر والوں اور گاؤں والوں کا احوال اور خیر خیریت ہی پوچھتی رہی۔ کھانے سے فراغت کے بعد مَیں نے اجازت چاہی اور اپنے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ عشاء کے وقت گھر میں داخل ہوا تو گھر والوں نے بتایا کہ تاہیا دو تین بار تمہارا پوچھنے آ چکا ہے۔ ابھی وہ یہ بات کر ہی رہے تھے کہ باہر سے تاہیے کی آواز آئی۔

''چاچا جی! راجو ابھی گھر واپس آیا ہے کہ نہیں؟''

مَیں نے گھر والوں کو کہا مَیں ذرا تاہیے سے مل کر آتا ہوں۔ دروازہ کھولا تو تاہیا میری صورت دیکھتے ہی بولا۔

''کہاں مر گئے تھے' یار! اتنی دیر لگا دی؟''

مَیں نے ''الف'' سے لے کر ''ی'' تک اُسے تمام باتیں بتائیں' کہنے لگا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ رجو سے ملے تھے تو وہ کیسی تھی؟''

مَیں نے کہا۔ ''بھلی چنگی تھی' شوہر کی خوب ٹہل سیوا کر رہی ہے۔ میرے سامنے اُس نے اُسے دیسی گھی کی چپڑی روٹیاں اور دیسی مرغ کی بوٹیاں اصرار کر کر کے کھلائی تھیں۔ وہ نامراد جتنا انکار کرتا تھا' وہ اُسی قدر اصرار سے اُسے کھلاتی تھی۔''

اچانک مجھے محسوس ہوا تاہیے کا چہرہ بجھ کر رہ گیا ہے۔ مَیں فوراً سمجھ گیا کہ مَیں کچھ غلط بول گیا ہوں۔ مَیں نے تاہیے کو مخاطب کیا اور بولا۔

''یار! بیوی کو نہ چاہتے ہوئے بھی شوہر کی خاطر داری کرنی پڑتی ہے' اُس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

تاہیے نے ایک لمبی سی ''ہوں'' کی اور کہنے لگا۔

''اچھا' یار! میں چلتا ہوں۔''

مَیں نے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ تاہیا جب رُخ بدل کر گلی میں چلنے لگا تو مجھے ایسے لگا جیسے اُس کے کندھے ڈھلک گئے ہیں اور اُس کی ٹانگیں شل ہو گئی ہیں جنہیں وہ گھسیٹ رہا ہے۔

اگلے پندرہ دن تاہیے نے جی جان لگا کر ورزش کی۔ ہر کوئی کہتا تھا کہ تاہیا کشتی تو جیتے گا ہی مخالف کی کوئی نہ کوئی ہڈی پسلی بھی توڑے گا۔

جس دن کشتی تھی' تاہیے نے مجھے کہا۔

''راجو! تو کامے کے گاؤں جا اور اُس کے ساتھ ہی آنا بس دیکھنا وہ کیسے گاؤں سے گھوڑی پر سوار ہو کر نکلتا ہے' رجو کس طرح اُسے رُخصت کرتی ہے وہ کس انداز سے لوگوں کو سلام کرتا ہے اور گھوڑی پر چڑھنے سے پہلے اپنے حواریوں کے حوصلے بڑھانے کے لئے کیسے سلامتی دیتا ہے۔''

مَیں نے کہا۔ ''یار! کیسی پاگلوں جیسی باتیں کرتا ہے' مَیں اپنے جگری یار کو چھوڑ کر اُس کی سلامی کا نظارہ دیکھنے اُس کے گاؤں جاؤں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔''

لیکن تاہیا ایسی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اُس نے اپنی بات منوا کر چھوڑی۔ مَیں صبح صبح ہی کامے کے گاؤں چلا گیا کیونکہ کامے کے سالے بھی صبح صبح ہی تیار ہو کر کامے کے گاؤں کو چل پڑے تھے حالانکہ کشتی کا وقت عصر کے بعد کا تھا۔ مجھے ساتھ دیکھ کر اُنہیں بڑی حیرت ہوئی' آخر

نمکین غزل

مَیں سارے ٹوٹکے آزما رہا ہوں
کہ ''ناڑا'' جینز میں ڈلوا رہا ہوں
بجٹ تقریر کا لے کر ہتھوڑا
غریبوں کو ذرا دھمکا رہا ہوں
سماعت میں مری تھوڑا خلل ہے
ذرا لکھ دو' مَیں کیا فرما رہا ہوں
کلیجہ جلنے کی بو خاک آئے
ابھی تو کوئلے دہکا رہا ہوں
کنکشن کاٹنے کیوں آ گئے ہو
کیا مَیں گھر چھوڑ بھاگا جا رہا ہوں
جو پہلے ہو چکی' کافی نہیں ہے
ابھی تک تھوبڑا سہلا رہا ہوں
وہ ہتھے سے اکھڑتے جا رہے ہیں
اِدھر میں ہوں کہ بس گھگیا رہا ہوں
تمہاری مرحبا' واہ واہ' مکرر
میں مسٹر بانس چڑھتا جا رہا ہوں

مسٹر ڈیکلاں
موبائل: 0333-6108120

ایک نہ رہ سکا اور بولا۔

''راجو! خیر تو ہے' تاہیے کا لنگوٹیا اور ہمارے ساتھ' کہیں ہمارے بہنوئی کو کچھ کھلانے کا ارادہ تو نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''خدا کا خوف کھاؤ' لنگوٹیا اپنی جگہ اور کھیل کا شوق اپنی جگہ اور پھر کاما ہے کون' میرا بھائی ہے۔ جس طرح تمہارا ہے' اُسی طرح میرا۔''

بڑے بھائی نے اُس کو جھڑکا تو وہ معذرت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

''میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

میں جب اُس جلوس کے ہمراہ جو کامے کے ساتھ دوسرے گاؤں سے آیا تھا' اکھاڑے میں داخل ہوا' تو تاہیا پہلے ہی اکھاڑے کے ایک کونے میں ریشمی لاچا اور ریشمی قمیص پہنے' گلے میں ریشمی دوپٹہ ڈالے جسم کو گرم کرنے کے لیے اُسے ہلا جلا رہا تھا اور ہلکی پھلکی ورزش میں مصروف تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور بیتابی سے بولا۔

''یار! بتا ہمارا دُشمن کس طرح سلامتی دیتا آیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تاہیے! لاکھ سلامیاں دیتا رہے' جیت تمہاری اور ہماری ہی ہوگی۔ گھر سے رُخصتی کے وقت پہلے رجو نے پیر صاحب سے دَم کروایا ہوا پانی پڑھ کر کچھ اُسے پلایا اور باقی اُس پر چھڑکا' پھر اُس کے بازو پر امام ضامن باندھا اور پھر قرآن کے سائے تلے اُسے رُخصت کیا۔''

تاہیے کے ہلتے بازو اور تھرکتے پاؤں اچانک تھم گئے۔ اُس نے زیرِ لب دُہرایا۔

''رجو نے امام ضامن باندھا اور قرآن کے سائے تلے کامے کو رُخصت کیا۔''

پھر وہ جیسے میری اور دوسروں کی موجودگی سے بے خبر سا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں لیکن خود وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ کامے کا نام جب منصف کشتی نے پکارا تو کامے نے اکھاڑے کی مٹی کو لے کر چوما اور اکھاڑے کے چاروں طرف گھوم کر سلامی دی۔ جب منصف نے تاہیے کا نام پکارا تو اُس نے رُخ میری طرف پھیرا' چند لمحے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''راجو! کامے کو رُخصت کرتے وقت رجو کی آنکھوں میں آنسو تو ضرور آئے ہوں گے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اُس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ تاہیے نے اکھاڑے کو سلامی پیش کی' کامے سے ہاتھ ملایا۔ منصف کشتی نے کشتی شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ ہمارے اندازے کے مطابق دومنٹ میں ہی کشتی کا فیصلہ ہو گیا لیکن جیتنے والا تاہیے کی بجائے ''کاما'' تھا۔ کامے کی جیت ہمارے لیے تو حیران کن تھی ہی' خود ''کاما'' اور اُس کے حواری بھی اِس بات کی توقع نہیں کر رہے تھے کہ تاہیا ریت کی دیوار ثابت ہوگا لیکن میں کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔

کامے کے حواری ڈھول کی تھاپ پر ناچ رہے تھے' شور وغل مچا رہے تھے نعرے اور بڑھکیں مار رہے تھے۔ میں ہارے ہوئے قدموں سے ہارے ہوئے تاہیے کی طرف بڑھا۔ میں نے شکایتی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اُس نے چند لمحے مجھے دیکھا اور بولا۔

''یار! تو میرا ایک کام کرے گا؟''

میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ ''تاہیے! میں نے کبھی تیری بات کا انکار کیا ہے؟ بول' کیا کام ہے۔''

اُس نے مجھے شانے سے پکڑا اور سب سے الگ لے جا کر کہنے لگا۔

''راجو! تو بس دیکھ کر آ کہ رجو' کامے کی جیت پر کتنی خوش ہے؟''

رجو ہمارے ساتھ ہی گاؤں آئی تھی اور اب کامے کا فاتحانہ جلوس ہمارے گاؤں کا چکر لگانے کو نکلا تھا اور ظاہر ہے' سوہروں کے گھر تو زیادہ خوشی منائی جاتی۔ میں نے تاہیے کو دیکھا جس کی آنکھوں میں نمی اُتری صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں نے سر ہلایا اور جلوس کے پیچھے پیچھے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

جب شام کے ملگجے اندھیرے میں میں تاہیے سے ملا تو تاہیے نے پھیکی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''سنا' راجو! رجو خوش تو تھی' نا! خاوند کی جیت پر؟''

میں نے سر ہلایا تاہیے نے دوبارہ پوچھا۔ ''بہت خوش تھی؟'' میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہاں' بہت زیادہ خوش۔''

تاہیا خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ''رجو بہت خوش تھی' بہت۔''

اُس نے اپنی بند مٹھی کو کھولا' اُس میں بالوں کا ایک گچھا پڑا تھا۔ تاہیا پھر بڑبڑایا۔

''رجو بہت خوش تھی' بہت۔''

اور اُس کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک کر بالوں میں جذب ہو گئے۔ اِسی کے ساتھ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور تاہیے کی ہتھیلی سے بالوں کو اُڑا لے گیا۔ تاہیا اَب کی بار اُن کے پیچھے قطعاً نہیں بھاگا بس یہ کہتا رہا کہ رجو بہت خوش تھی بہت---اور میں نے سوچا ٹھیک کہتے ہیں---

دِل دریا سمندروں ڈونگے' تے کون دِلاں دیاں جانے' ہو

☆☆

موٹر وے اور ہم

☆ ظفر ندیم وہرہ

عرصہ دراز سے دل میں یہ خواہش انگڑائیاں لے رہی تھی کہ کسی روز لاہور اور ''وزیرستان'' المعروف اسلام آباد کے درمیان واقع اصلی تے وڈی شاہراہ' عرف موٹروے پرسفر کر کے اپنا نام ان خوش قسمت افراد کی فہرست میں درج کرالیں جو کہ اس طلسماتی روڈ کی تعریفیں اور خوبیاں بیان کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔ اس ''آتش شوق'' کو بھڑکانے میں ان احباب کا بھی نمایاں کردار تھا جو کہ اس سڑک پرسفر کرنے کا اعزاز حاصل کر چکے تھے اور اپنے آپ کو اس قدر خوش نصیب سمجھ رہے تھے کہ جیسے انہوں نے سمرقند و بخارا فتح کرلیا ہو لیکن ہمارے ساتھ یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اس روڈ اور ہمارے غریب شہر کے درمیان اس قدر طویل فاصلہ حائل تھا کہ جسے عبور کرنا آسان کام نہیں تھا۔ دراصل اس شاہراہ کے خالقوں اور منصوبہ سازوں نے ایک غلطی کر دی' انہوں نے اس کا نقشہ بناتے وقت ہم سے مشورہ کیا' نہ ہمیں اعتماد میں لیا ورنہ ہم انہیں یہ مفید مشورہ دیتے کہ وہ اس کو کہیں اور بنانے کی بجائے کراچی اور حیدرآباد کے درمیان بچھائیں تاکہ ہم بھی اس کے فوائد سے مستفید ہوسکیں لیکن صاحب! نقارخانے میں طوطی کی آواز بھلا کون سنتا ہے؟ اس طرح انہوں نے تو اپنی جانب سے پوری کوشش کر لی کہ ہم اس شاہراہ کی برکتوں سے فیض یاب نہ ہونے پائیں لیکن بقول شاعر---

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

اگرچہ اس روڈ کو ہمارے شہر سے گزرنے کا اعزاز تو حاصل نہیں ہوا لیکن قدرت نے بیٹھے بٹھائے ہمیں ایک سنہری موقع فراہم کر دیا کہ ہم بھی اپنی اس اکلوتی خواہش کو عملی جامہ بلکہ پاجامہ پہنا سکیں اور یہ ماننا پڑا کہ وہ بلاشبہ بڑا کارساز ہے۔ اس کے گھر میں دیر ہے مگر اندھیر نہیں ہے---کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ہمیں کاروباری کے سلسلے میں کچھ عرصہ کے لئے اپنے آبائی شہر چنیوٹ منتقل ہونا پڑا۔ اب سوال یہ تھا کہ موٹروے پر سفر کیسے اختیار کیا جائے۔ خدا نے چاہا تو یہ مشکل بھی آسان ہوگئی۔ ہوا یوں کہ ہمارے ایک رفیق جو کہ ماضی میں ہمارے ہم جماعت اور لنگوٹیے یار رہ چکے تھے' انہوں نے ایک ملاقات کے دوران ہمیں یہ خوشخبری سنا دی کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں' اگر آپ ساتھ جانا چاہیں تو ست بسم اللہ۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ اکیلے سفر کریں اور خواہ مخواہ بوریت سے دوچار ہوتے پھریں۔ اندھے کو اور کیا چاہیئے' دو آنکھیں۔ ہم نے ان کے ساتھ جانے پر رضامندی ظاہر کردی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر لگن سچی ہو تو انسان چاند کا بھی چکر لگالیتا ہے۔

دوسرے روز ہم نوکری کے لئے انٹرویو دینے کے لئے جانے والے امیدوار کی طرح صبح سویرے تیار ہوگئے۔ آج کا دن ہمارے لئے روز عید سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ یہ ہمارا خیال نہیں بلکہ دعویٰ ہے کہ اتنی خوشی رانجھے کو تخت ہزارہ جاتے وقت نہیں ہوئی ہوگی جتنی کہ ہمیں اسلام آباد جاتے وقت ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہم ہواؤں میں اُڑے جارہے ہوں۔ آخر کار وہ وقت آگیا جس کا ہمیں بڑی شدت سے انتظار تھا۔ ایک مختصر سی کال نے ہمیں فوراً گرین سگنل دے دیا۔ چونکہ سفر طویل اور وقت کم تھا اس لئے مزید وقت ضائع کئے بغیر اپنے تاریخی سفر پر روانہ ہوگئے۔ جب ہماری گاڑی تحصیل چوک پر پہنچی تو اس کا رُخ فیصل آباد کی طرف موڑ دیا گیا۔ ہم بہت حیران ہوئے کہ یہ روٹ سے ہٹ کر کیوں جارہے ہیں جبکہ اصولی طور پر ہمیں پنڈی بھٹیاں کی طرف مڑ جانے کی ضرورت تھی؟ چنانچہ ہم نے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''رفیق محترم! یہ آپ بائیں طرف مڑنے کی بجائے ناک کی سیدھ میں کیوں جا رہے ہیں' کیا اسلام آباد جانے کا پروگرام بدل گیا ہے؟''

انہوں نے حسب عادت ایک زوردار قہقہہ چھوڑا جس کی آواز فضا میں تو نہ بکھر سکی کیونکہ اے۔سی چلنے کی وجہ سے گاڑی کے شیشے بند تھے' پھر گویا ہوئے۔

''مائی ڈیئر فرینڈ! آپ غلط سمجھ رہے ہیں' ہم بالکل ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔''

''لیکن اسلام آباد کا راستہ تو پنڈی بھٹیاں سے ہو کر جاتا ہے جب کہ آپ جھنگیوں کے شہر کی طرف دوڑے جا رہے ہیں؟''

انہوں نے فلمی ولن کی طرح مزید ایک قہقہے کی فضول خرچی کی اور اپنا وضاحتی بیان جاری کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو علم نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے۔''

''لیکن اس معاملے سے اس خبرنامے کا کیا تعلق ہے؟''

''تعلق ہے اور نہایت گہرا تعلق ہے۔ ہمارے ملک میں واقعی سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا ہے مگر یہ سڑکوں کا جال کم اور کھڈوں کا جال زیادہ ہے۔''

''شمع کیجئے گا مہاراج! آپ کی بات میرے سر کے اوپر سے یوں گزر گئی ہے کہ جیسے پیشہ ور سیاستدانوں کی باتیں غریب عوام کی بالائی منزل کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔''

''بندہ پرور! دراصل بات یہ ہے کہ پنڈی بھٹیاں روڈ اس قدر خستہ و خراب ہو چکی ہے کہ جیسے کتوں کے ہاتھوں پھاڑی ہوئی رضائی ہوتی ہے۔اس پر کاریں تو کیا' بیل گاڑیاں بھی نہیں چل سکتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی ذہین کار سوار ادھر سے جانے کی حماقت نہیں کرتا۔اگر کرتا ہے تو اس کے احمق اعظم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں یا یہ اخباری بیان ہے؟''

''اگر آپ کو دھکے کھانے کا شوق ہو تو میں گاڑی واپس گھما لیتا ہوں۔ پھر اس ناچیز سے شکایت نہیں کیجئے گا۔ جو ہوگا' یا قسمت یا نصیب!''

''مگر ٹی وی پر بتایا جاتا ہے کہ ہماری ہر چھوٹی بڑی سڑک موٹروے کا روپ اختیار کر چکی ہے؟''

''ان کے سب دعوے جھوٹے اور بے بنیاد ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ عوام کو جی بھر کر بیوقوف بنایا جا رہا ہے کیونکہ یہ وعدوں' نعروں اور خواہشات پر جینے مرنے والی قوم ہے۔۔۔''

ابھی باتوں کا سلسلہ رواں دواں تھا کہ اچانک گاڑی نے چیل کی طرح ایک زبردست غوطہ لگایا اور ایک فلنگ اسٹیشن کے اندر جا گھسی۔ پتہ چلا کہ اس کے پیٹ میں گیس کی کمی واقع ہو گئی ہے جسے دور کرنے کے لئے یہاں آنے کی زحمت کی گئی ہے۔ہم نے رفیق محترم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا' وہاں سے ارجنٹ جواب واپس آیا۔

''میں نے سوچا کہ گاڑی میں گیس فل کرالی جائے۔ایسا نہ ہو کہ یہ راستے میں جواب دے جائے اور ہم جنگل میں بیٹھ کر قوالی کر رہے ہوں۔''

ہمیں اِن کی ذہانت اور دور اندیشی پر کافی رشک آیا کہ بندہ ہو تو ایسا ہو جو کہ عقاب کی طرح ہر طرف نظر رکھے اور سواری کی ضروریات پوری کرنے میں کنجوسی اور کوتاہی سے کام نہ لے۔۔۔ہم انہیں خیالات میں گم تھے کہ اچانک ہمیں اپنے عقب سے ''گھڑ گھڑ'' کی آوازیں سنائی دیں۔یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بجری اور سیمنٹ مکس کرنے والی مکسچر مشین چل پڑی ہو۔ پتہ چلا کہ گاڑی میں گیس بھرنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ابتدا میں ایسی بے تکی اور بے سُری آوازیں آتی ہیں مگر جوں جوں گیس بھرتی چلی جاتی ہے' یہ آوازیں کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ جب گیس فل ہو گئی تو اچانک گاڑی میں سے ایک عجیب و غریب آواز برآمد ہوئی' یوں لگا کہ جیسے پانی کی موٹر چلتے چلتے اچانک بند ہو گئی ہو۔ پمپ مین نے ہوٹل کے بیرے کی طرح آواز لگائی کہ ایک سو بانوے روپے ادا کریں تا کہ ہم شکریئے کی رسم ادا کر سکیں۔ شیخ صاحب نے بٹوے میں سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ کھینچا اور اس کی ہتھیلی پر سجا دیا اور وہ بقایا لانے کے لئے کیبن کی طرف دوڑ پڑا۔

اچانک پیلی وردی میں ملبوس ایک شخص کہ جس کی مونچھیں دانتوں کے برش جیسی تھیں' گاڑی کے سامنے نمودار ہوا۔اس نے ہاتھ میں چھوٹی سی بالٹی پکڑ رکھی تھی جب کہ بغل میں ایک نابالغ وائپر WIPER تھام رکھا تھا۔اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' وائپر کو فضا میں بلند کیا اور شیشے کے ساتھ رگڑا بازی کرنے لگا۔ہم بہت حیران ہوئے کہ ہم نے تو کسی بھلے مانس کو شیشہ صاف کرنے کا آرڈر نہیں دیا' یہ بن مانس کہاں سے آ گیا؟ اس سے پہلے کہ ہماری حیرانی کا گراف بڑھ جاتا اور اس کی پیمائش کے لئے ماہرین کو بلایا جاتا کہ میزبان گرامی نے بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ پمپ والوں کا مقرر کردہ آدمی ہے۔اس کا کام اسٹیشن پر آنے والی گاڑی کا شیشہ چمکانا ہوتا ہے۔وہ یہ کام فی سبیل اللہ کرتا ہے۔اگر کوئی خوش ہو کر دس بیس کا نوٹ تھما دے تو لینے سے انکار نہیں کرتا بلکہ

اسے غیبی امداد سمجھ کر قبول کر لیتا ہے کہ مفت میں ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔ اس عمل کو آپ ایک قسم کی رشوت بھی کہہ سکتے ہیں تا کہ یہاں پر آنے والا کارسوار دوبارہ بھی آئے اور ان کا پکا بلکہ پکا پکایا گاہک بن جائے۔

''تو گویا یہاں پر SMS فری ہے۔'' ہم نے رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔

اب ان کی حیران ہونے کی باری تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ یہ فلنگ اسٹیشن ہے' کسی موبائل کمپنی کا دفتر نہیں ہے۔''

''کمال کی ٹانگ تو آپ توڑ رہے ہیں جو میری بات کو ذہن میں نہیں اتار رہے ہیں۔ S.M.S کا مطلب ہے۔ شیشہ' مفت' صاف!''

انہوں نے ایک خستہ اور کرارا قہقہہ فضا میں چھوڑا اور ایس۔ ایم۔ ایس کا ایکسرے نکالنے پر ہمیں بھرپور مبارکباد دی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے گاڑی کا گیئر بدلا اور اسے ہوا کے دوش پر ڈال دیا۔ نصف گھنٹے کے سفر کے بعد ہم کمال پور انٹرچینج پر پہنچ گئے جو کہ فیصل آباد کو اسلام آباد موٹروے سے ملاتا ہے۔ جب ٹول پلازہ کا مقام آیا تو کیبن کے اندر مورچہ زن ایک کلرک بادشاہ نے ملاقاتی کارڈ سے ملتا جلتا ایک کارڈ نکال کر ہمارے متھے مار دیا۔ ہم نے کارڈ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اس پر اوٹ پٹانگ قسم کی تصاویر بنی ہوئی تھیں جنہیں وہی سمجھ سکتے تھے کہ جنہوں نے یہ نادر کارڈ جاری کیا تھا گویا ''لکھے موسیٰ' پڑھے خدا'' والا معاملہ تھا۔ چوکی انچارج نے کارروائی مکمل ہوتے ہی ایک بٹن دبایا اور راستے میں پڑی ہوئی رکاوٹ کو دور کر دیا۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ اب آپ کو موٹروے پر سفر کرنے کی کھلی اجازت ہے۔ شیخ صاحب نے کارڈ کو کار کے ڈیش بورڈ میں بنے ہوئے خانے میں یوں فٹ کیا کہ جیسے ٹیپ ریکارڈ میں کیسٹ لوڈ کی جاتی ہے اور گاڑی کو ایڑ لگادی۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب روڈ صاف اور ہموار ہو اور گاڑی بھی حسین و جوان ہو تو سُست سے سُست ڈرائیور کا بھی خون گرم ہو جاتا ہے' اس وقت اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ خلا نورد کبوتر کی طرح ہواؤں میں اُڑتا پھرے اور جی بھر کے سفر کے مزے لوٹے۔ اس مقصد کے لئے وہ گاڑی کو ہوائی جہاز بنانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ چنانچہ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اِدھر گاڑی نے شاہراہ پر قدم رکھا' اُدھر انہوں نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ ہم چونکہ فرنٹ سیٹ پر براجمان تھے اس لئے گاڑی کا رفتار پیما ہماری نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہماری نظریں اسی پر یوں ٹکی ہوئی تھیں کہ جیسے رکشے میں بیٹھے ہوئے مسافر کی

زکام

جب بھی گرمی کا موسم ختم اور سردی کا شروع ہو جاتا ہے تو ناک میں کھجلی ہوتی ہے۔ میرے خیال سے یہ زکام کی آمد کی نشانی ہے۔ زکام بھی مردوں کی طرح بدتمیز ہوتا ہے۔ نہ جگہ دیکھتے ہیں' نہ موقع' بس دوسروں کو متوجہ کرنے کے لئے لاؤڈ اسپیکر آن کرتے ہیں---- ایک دن یوں ہوا کہ میرے کزن آصف جو رات کو کسی کیچڑ میں گر گئے تھے اور آج ہمیں تفصیل بتانے آئے تھے۔ اُن کا مزاج ایسا ہے کہ اُنہیں ہنسی سے نفرت ہے۔ بہت جذباتی لڑکا ہے۔ (شاید ٹارزن 421 کی طرح) اور میری خوش نصیبی یا کہ بدنصیبی کہ اِن دنوں زکام کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ گھر میں اچھا خاصا دیوان بنا ہوا تھا۔ میں بھی دیوان کا ایک حصہ دار بن کر بیٹھ گئی۔ آصف کہہ رہا تھا۔

''اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔''

''چھی---!'' میری چھینک نکل گئی۔

آصف خاموش رہا پھر شروع ہوا۔ ''اچھا تو میں کہہ رہا تھا کہ راستے میں ایک پتھر سے بھی خوب ملاقات ہوگئی۔'' (آ---چھی---) پھر میری چھینک نکل گئی۔ پھر بھی آصف زہر کا گھونٹ پی گیا اور دوبارہ اسٹارٹ ہوا۔ ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔'' (آ---چھی---) اب آصف کو کون روک سکتا ہے بھلا؟

''حمیرا یہ کیا آ چھی' آ چھی لگا رکھی ہے۔ خود تو بات نہیں کرتے ہمیں تو بات کرنے دیں۔'' آصف اور میرے سوا سبھی ہنس رہے تھے۔ ناک صاف کرتے ہی میں نے کہا۔

''آصف! آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئے چلئے اب ٹھیک ہے اب بولیے۔

''حمیرا اب اگر تم نے چھینک ماری تو میں یہ پلستر (جو ٹیبل پر بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا) اپنے منہ یا تمہاری ناک میں لگا دوں گا۔'' آصف نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا اور پھر اسٹارٹ۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے نہیں معلوم کہ آگے کیچڑ ہے میں سب سے بے خبر ہاتھ پاؤں ہلاتا ہوا گزر رہا تھا کہ---'' (آ---چھی---) پھر سے نکل گئی۔

اب آصف کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اِس سے پہلے کہ آصف کچھ کہتا میری چھوٹی بہن بول اُٹھی۔

''دیکھ باجی حمیرا! رات گزر چکی ہے مگر آصف ابھی تک کیچڑ میں نہیں گرے ہیں۔ بیچارے پر رحم کرو اور اُسے کیچڑ میں گرنے دو نا!'' ہنسی کا دورہ پھر سے پڑ گیا۔ اب میں نے وہاں سے نکلنے میں ہی عافیت جانی۔ ارے ہمیں چھوڑیئے آصف کو دیکھیں بیچارے نے اپنے وعدے کے مطابق پلستر اپنے منہ میں لگا لیا تھا۔

کبھی کبھی زکام یعنی (چھینک) نیک کام بھی کرتی ہے جیسے لڑکیاں!

ایک صبح جب میں ناشتہ نوش فرما رہی تھی کہ بھائی کچن میں آ کر کہنے لگے۔

''حمیرا اچھا ہوا تم نے مجھے جگا دیا ورنہ دیر ہو جاتی مجھے دفتر میں جانے کے لئے۔''

''میں---میں نے نہیں اُٹھایا آپ کو۔'' میں نے حیرانگی سے جواب دیا۔

بھائی جان یہ کہہ کر اُٹھ گئے کہ صبح سویرے تمہاری چھینک نکل گئی تھی اِسی چھینک نے مجھے جگا دیا۔ اِس وقت میری بتیسی کو نکلنے میں دیر نہیں لگتی۔ واقعی زکام تو زکام ہوتا ہے مگر اگلی رات میری چھینک نے کسی کو سونے نہیں دیا تو قیامت آ گئی۔ کچھ رشتہ داروں کی آمد کی وجہ سے بھائی اور ایک بہن میرے کمرے میں سو رہے تھے یہ دونوں حسین خواب دیکھ رہے تھے شاید مگر میری چھینک اُن کے آڑے آ گئی اور یعنی نکل گئی اور اِسی وقت دو تکیے اور ایک گلاس میرے سر کے اوپر سوار اور میرے منہ سے نکل ہی گئی کہ ''ہائے اُف یہ زکام۔''

حمیرہ عیسیٰ تمپ' ملک آباد

نظریں اس کے میٹر پر جمی ہوئی ہوتی ہیں۔ میٹر کے اندر لگی ہوئی لال رنگ کی سوئی نے اچانک انگڑائی لی اور نیچے سے اوپر کی طرف سفر شروع کر دیا اور چند ہی ساعتوں میں سوا سو کے ہندسوں کو چھونے لگی۔ اس قدر تیز رفتاری دیکھ کر دل ناتواں لرز گیا۔ ایسا ہونا لازمی امر تھا کیونکہ ہم جن گاڑیوں میں سفر کرنے کے عادی تھے اگرچہ ان کی پیشانی پر ایف۔ سولہ لکھا ہوا ہوتا تھا مگر ان کا کانٹا پچاس ساٹھ سے اوپر جاتا ہی نہیں تھا۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ہم نے دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا اور جس قدر دعائیں یاد تھیں وہ کئی کئی بار پڑھ ڈالیں۔ اس وقت ہماری جیب میں تسبیح موجود نہیں تھی وگرنہ ہم منکوں کی برسات شروع کر دیتے --- ہم نے ہمسفر کے چہرے پر نظر دوڑائی کہ شاید انہیں بھی اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہو مگر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گاڑی چلانے میں مصروف تھے۔ ہم نے ان کے ماتھے پر فکر کی لکیریں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ان کا چہرہ بالکل اسپاٹ تھا، کم از کم اب تک وہاں پر ایسی کوئی علامت نہیں اُبھری تھی کہ جس سے یہ بات ثابت ہو سکے کہ وہ تیز رفتاری سے فکر مند یا خوفزدہ ہیں بلکہ وہ تو مزے سے لتا اور رفیع کے سدا بہار نغمے سن رہے تھے اور اس طرح روح کی غذا حاصل کر رہے تھے۔

اچانک گاڑی میں پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ابتدا میں کوئل کی کوکو سنائی دی، پھر تیتروں نے "سبحان تیری قدرت" کا ورد شروع کیا، آخر میں بیٹروں نے چٹاخ چٹاخ شروع کر دی۔ ہم حیران تھے کہ یہ آوازیں کہاں سے برآمد ہو رہی ہیں جب کہ قریب و جوار میں کوئی چرند نظر آ رہا ہے، نہ کوئی پرند دکھائی دے رہا ہے۔ دل نے کہا کہ یاالٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟ تھوڑی سی ذہنی جمناسٹک کرنے کے بعد یہ بھید کھلا کہ یہ آوازیں موبائل فون کے گلے سے نشر ہو رہی ہیں۔ ہمیں موبائل فون رکھنے والے کرم فرماؤں کے شوق اور جدت پسندی پر رشک آنے لگا کہ جنہوں نے اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر من پسند دُھنیں بھر رکھی ہوتی ہیں۔ ہمیں یاد آیا کہ گزشتہ دنوں جب ہم ایک ویگن میں سفر کر رہے تھے تو ایک دیہاتی بابے کے فون سے بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ جب کہ ایک مرغی فروش کے سیٹ سے چوزوں کی "چوں چوں" سنائی دینے لگی تھی --- شیخ صاحب نے ڈیش بورڈ میں رکھا ہوا گول مٹول موبائل اُٹھایا اور جھٹ سے کنپٹی پر لگا لیا۔ اس موقع پر ہمارے اندر کا ذمہ دار شہری جاگ اُٹھا۔ ہم نے انہیں اس حرکت سے روکتے ہوئے کہا:

"آپ کو پتہ ہے کہ ڈرائیونگ کے دوران موبائل فون کا استعمال ممنوع ہے؟"

"یہ سب خوبصورت باتیں ہیں جو کہ غیر ممالک سے درآمد کی گئی ہیں، یہ چونچلے یہاں اچھے نہیں لگتے ہیں۔"

"لیکن قانون تو قانون ہوتا ہے جس کی پابندی ہر شہری پر لازم ہوتی ہے؟"

"چھوڑیں جی! یہاں پر تو کوئی قومی ترانے کا احترام نہیں کرتا۔ ادھر سینما ہال میں ترانہ شروع ہوتا ہے ادھر لوگوں باہر کی طرف بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔"

"وہ بات تو ٹھیک ہے۔ اگر ایک لاکھ لوگ ایک ہی غلطی کر رہے ہوں تو اس سے وہ غلطی درست نہیں ہو جاتی۔"

"میں آپ کی بات کی تائید کرتا ہوں مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ اس جنگل بیابان میں خدا کے سوا کون دیکھ رہا ہے؟"

'کیوں نہیں دیکھ رہا ہے۔ کسی خفیہ کیمرے کی آنکھ ہمیں کسی وقت بھی کیچ کر سکتی ہے، جانتے ہیں پھر کیا ہوگا؟"

"زیادہ سے زیادہ دو چار سو روپے جرمانہ ہو جائے گا، یہی سمجھیں گے کہ زکوٰۃ نکل گئی۔"

"اگر زکوٰۃ نکالنے کا اتنا ہی شوق ہے تو یہ غریبوں، مسکینوں اور ناداروں کو دی جا سکتی ہے، سرکار کا پیٹ بھرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

'جناب کے مزاج کافی برہم دکھائی دے رہے۔ لیجئے، انار کا جوس نوش جان فرمائیں تاکہ درجہ حرارت میں کمی واقع ہو جائے --- خیر، ہو آپ کی۔"

گاڑی منزلوں پر منزلیں طے کرتی چلی جا رہی تھی۔ رفتار کا یہ عالم تھا کہ ہر شے بھاگتی دوڑتی نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے ایستادہ درخت یوں جھوم رہے تھے کہ جیسے رقص کر رہے ہوں۔ شاہراہ کے سینے پر پینٹ شدہ ٹریفک کے نشانات عجب منظر پیش کر رہے تھے۔ یہ اتنی تیزی سے گزرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے کہ ان کی نقل و حرکت دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے کروز میزائل چل رہے ہوں۔ ہم شیشے سے یہ سارے مناظر براہ راست دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں کوریا کے ماہرین کی فنی مہارات کو داد دے رہے تھے کہ جنہوں نے اس قدر شاندار روڈ بچھا کر نہ صرف عوام الناس کے دل جیت لئے تھے بلکہ کشور حسین کی آن بان اور شان میں نمایاں اضافہ کر دیا تھا وگرنہ ہم اب تک ایسی شاندار اور چمکیلی سڑکیں صرف ٹی۔ وی پر دیکھتے چلے آ رہے تھے کہ جنہیں دیکھ کر غیر ملکیوں کی قسمت پر رشک کیا کرتے تھے کہ وہ کس قدر خوش نصیب ہیں کہ جنہیں آمد و رفت کے لئے ایسی ہموار اور صاف ستھری شاہراہیں ملی ہیں

کہ جن پر سفر کر کے بندے کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے اور بلڈ پریشر نارمل ہو جاتا ہے۔ ہم اکثر سوچا کرتے تھے کہ کیا کبھی ہمارے ملک میں ایسا وقت آئے گا کہ بین الاقوامی معیار کی کوئی شاہراہ اس کے نقشے پر اُبھرے گی۔ بھلا ہو میاں برادران کا کہ جن کے عزم واستقلال نے یہ کارنامہ کر دکھایا--- خیالات کی مد وجزر کا سلسلہ جاری تھا کہ اچانک شیخ صاحب کی آواز ہماری سماعت سے ٹکرائی۔

''گیس ختم، پیسہ ہضم!''

''ہائیں! اتنی جلدی گیس کیسے ختم ہوگئی' کیا گیس کی بجائے ہوا بھروائی تھی جو اتنی جلدی اُڑنچھو ہوگئی؟''

''محترمہ گیس کا یہی تو رونا ہے۔ ایک دفعہ فل کرو تو مشکل سے سو ڈیڑھ کلومیٹر کا سفر طے کرتی ہے۔ اگر اے۔سی گردش میں ہو تو یہ اوسط مزید کم ہو جاتی ہے۔''

''اس وقت گیس کی پوزیشن کیا ہے؟''

''وہی جو ہمارے ڈیموں کی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ڈیڈ لیول پر ہے' صرف ایک دانہ باقی بچا ہے۔ ہمیں جلد گیس بھروانے کا بندوبست کرنا ہوگا ورنہ مشکل ہو جائے گی۔''

''اب کیا ہوگا؟''

''فکر کی کوئی بات نہیں۔ گاڑی کے پیٹ میں کافی پٹرول موجود ہے۔ اِدھر گیس ٹاٹا کرے گی' اُدھر گاڑی پیٹرول کے خانے میں چلی جائے گی۔ فی الحال گیس بچانے کے لئے میں اے۔سی کو رخصت پر بھیج رہا ہوں' آپ ذرا اپنی سائیڈ کا شیشہ کھول دیں تاکہ حبس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

ہم نے فوراً لیور گھما کر شیشہ کھول دیا۔ شیشہ کھلتے ہی ہوا کے جھونکے اندر آنا شروع ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی مختلف قسم کی نشریات شروع ہو گئیں۔ کبھی سیٹیوں کی آواز سنائی دیتی تو کبھی آندھی کا بیک گراؤنڈ شروع ہو جاتا' گرد وغبار کی سروس ان کے علاوہ تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہم کار کی بجائے اُڑن قالین پر بیٹھے ہوں۔ شیخ صاحب نے فوراً اپنا چشمہ نکالا اور اسے ناک پر بٹھالیا۔ ہم چشمہ گھر پر بھول آئے تھے اب جو آنکھوں میں مٹی پڑی تو اس کی یاد ستانے لگی مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ رومال کا سہارا لینا پڑا کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے--- خدا خدا کر کے سی۔این۔جی اسٹیشن کی صورت دکھائی دی۔ گاڑی کے ایک بار پھر گیس کا ناشتہ کیا اور بقایا سفر پر روانہ ہوگئی۔ اگرچہ گیس کی بندش سے ہمیں کسی خاص پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا مگر ہمیں گیس کا نظام متعارف کرانے والوں پر شدید غصہ آرہا تھا کہ جنہوں نے اس کی خامیوں اور خرابیوں پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اگر انہوں نے یہ چکر چلانا ہی تھا تو کم از کم سلنڈر میں اتنی گنجائش تو رکھی ہوتی کہ چار پانچ کلومیٹر کا سفر آسانی سے طے ہو جاتا ورنہ اس سے تو پیٹرول کا نظام اچھا تھا کہ ایک بار ٹنکی فل کرا دو اور مزے سے چلتے رہو۔ یعنی فکر نہ فاقہ' عیش کر کاکا لیکن بُرا ہو اس مہنگائی کا کہ جس نے اچھے بھلے ہنستے بستے اور چالو نظام کو اُجاڑ کے رکھ دیا اور عوام کو گیس کے چکروں میں اُلجھا دیا۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔

اب ہماری گاڑی ایک پُل پر سے گزر رہی تھی۔ اچانک ''ٹھک

ہزل

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

لیلیٰ مرے پیچھے ہے تو لیلیٰ مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز ہی جھگڑا مرے آگے

کل جس نے رچائی تھی بڑی دھوم سے شادی
اب روتا ہے دن رات وہ دولہا مرے آگے

بات اُس کی مجھے کوئی سمجھ آتی نہیں ہے
ہاتھ اپنے نچاتا ہے جو گونگا مرے آگے

جھاڑو سے چھڑاتا ہوں اگر جان میں اپنی
رکھ دیتی ہے برتن مری زوجہ مرے آگے

مہمان گویوں کو منع کر نہیں سکتا
ہر آن بجاتے ہیں وہ باجا مرے آگے

لگتا ہے مجھے ڈر کہ وہ رسّی نہ چھڑالیں
گدھی مرے پیچھے ہے تو گدھا مرے آگے

کیا موسم برسات ہے' کہنے لگا واعظ
اے کاش کہ لے آئے کوئی حلوہ مرے آگے

بچے ہیں ترے پندرہ تو ہیں میرے بہتر
فریاد کوئی اپنی نہ کرنا مرے آگے

چھکوں سے حکیم اُس کے چھڑاتا ہوں میں چھکے
بولنگ نہ کرائے کوئی کھبا مرے آگے

حکیم خان حکیم
فیض بک ڈپو ڈاک خانہ کامل پور موسیٰ ضلع اٹک

ٹھک" کی آوازیں آنے لگیں کہ جیسی فلم میں خطرناک ولن کی سین میں انٹری مارنے پر سنائی دیتی ہیں۔ ویسے تو یہ روڈ اتنا صاف، ساکن اور ہموار ہے کہ کسی قسم کے ہچکولوں سے سابقہ نہیں پڑتا مگر پل چونکہ ہمیشہ ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائے جاتے ہیں اس لئے معمولی سے ہچکولوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ پل بے حد شاندار اور لمبا چوڑا تھا جسے دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ ہم نے جنرل نالج میں اضافے کے لئے پوچھا:

"رفیق محترم! اس وقت ہم کون سا پل عبور کر رہے ہیں، ذرا اس پر روشنی تو چھوڑیں۔"

"آپ کو پتہ نہیں، یہ دریائے چناب کا پل ہے؟"

ہم نے دریا کے اندر نگاہ دوڑائی۔ ہمیں دریا تو نظر نہیں آیا البتہ پانی کی ایک لکیر سی بہتی ہوئی دکھائی دی ہم حیران ہوئے کہ اگر یہ دریا ہے تو پھر نالی کیا ہوتی ہے اور اگر یہ نالی ہے تو پھر دریا کہاں ہے؟---اچانک ہمیں خیال آیا کہ اس سے بڑے دریا تو ہمارے شہر حیدر آباد میں ہوتے ہیں کہ جنہیں جابجا گلیوں اور سڑکوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ چڑھائیوں اور ڈھلانوں کا شہر ہونے کے ناطے آبشاروں کا نظارہ بھی کیا جا سکتا ہے جو کہ لوگوں کے باورچی خانوں سے برآمد ہوتی ہیں اور ڈھلانوں پر رقص کرتی ہوئی اور شور مچاتی ہوئی شاہراہوں پر آجاتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنی رولنگ دیتے ہوئے کہا:

"چھورو! اگر یہ دریا ہے تو اس کا پانی کہاں گیا، اسے کسی ڈائنو سار پی گیا یا کسی جادوگر نے غائب کر دیا؟"

"جانِ من! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ وہی عظیم دریا ہے کہ جس کی لہروں پر سوہنی گھڑے پر تیرا کرتی تھی۔ جہاں تک پانی کی کمیابی کا تعلق ہے تو آپ یہ سوال اس مرحوم فیلڈ مارشل کی قبر سے جا کر پوچھیں کہ جس نے چند سو کروڑ روپیوں کی خاطر ملکی دریا مہاشوں کے ہاتھوں فروخت کر دئے تھے اور اس طرح اپنے سینے پر نااہلی کا ایک اور تمغہ سجا لیا تھا۔"

"آپ نے بات تو سوا لاکھ کی بتائی ہے۔ یہ امر واقعی غور طلب ہے کہ جس ملک میں ہر سال خوفناک سیلاب آیا کرتے تھے، ہاں پر اب لوگ سیلابوں کو ترس گئے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ انڈیا نے جگہ جگہ ڈیم کھڑے کر کے پانی کو فل اسٹاپ لگا دیا ہے۔ اب ہمارے دریاؤں میں خاک نہیں اُڑے گی تو کیا پریاں رقص کریں گی؟"

کہا جاتا ہے کہ سفر کی عمر کم ہوتی ہے۔ ایک بار چل پڑو تو پھر چل سو چل شروع ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ سفر کٹ جاتا ہے۔ اب جبکہ دنیا ایک گاؤں میں سمٹ چکی ہے، اس کا کٹاؤ بے حد آسان اور بہ سہولت ہو گیا ہے۔ اب چند گھنٹوں میں آپ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے پر جا سکتے ہیں۔ باتوں ہی باتوں اور لتا جی کے گانوں کی جھنکار میں پتہ ہی نہ چلا کہ بھیرہ آ گیا۔ یہ موٹر وے کا ایک مشہور و معروف مقام ہے کہ جہاں پر اچھے اور معیاری ریستوران موجود ہیں کہ جن کی دلکشی اور خوبصورتی انسان کو اپنی طرف یوں کھینچتی ہے کہ جیسے لوہا مقناطیس کو کھینچتا ہے۔ یہاں پر کھانے پینے کی تمام اشیاء عام جام مل جاتی ہیں، بشرطیکہ آپ کی جیب رنگا رنگ نوٹوں سے شاد و آباد ہو البتہ کمزور دل اور فشار خون میں مبتلا بندوں کے لئے یہ جگہ قطعی سازگار نہیں ہے اس لئے انہیں یہاں پر سوچ سمجھ کر جانا چاہیے کیونکہ یہاں کے ہوشربا اور آتش فشاں ریٹ سن کر ان کا بلڈ پریشر بے قابو ہو سکتا ہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جگر تھام لیں یا دل کو پکڑ کر بیٹھ جائیں۔ مثال کے طور پر جوس کا جو ڈبہ بازار میں دس روپے کا ملتا ہے، وہ یہاں پر پچیس تیس روپے سے کم نہیں ملے گا۔ اسی طرح بسکٹ، چپس اور چائے وغیرہ دوگنی تگنی قیمت پر ملیں گے۔ اگر آپ نے غلطی سے یہاں پر کھانا کھا لیا تو اس کا بل دیکھ کر آپ یقینی طور پر بلبلا اُٹھیں گے اور آئندہ یہاں پر کھانا کھانے سے توبہ کر لیں گے کہ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے لیکن آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، فارسی کی ایک کہاوت ہے کہ "ہر گلے را خار باشد ہم نشین۔" یعنی ہر پھول کے ساتھ کانٹے ہوتے ہیں۔ یہاں پر ایک ایسی سوغات بھی موجود ہے کہ جسے حاصل کرنے کے لئے آپ کو کوئی پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑتا بلکہ لنگر کی طرح یہ آپ کو مفت مل جائے گی۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس بیدرد اور دشمن جاں مہنگائی کے دور میں جب کہ تمام چیزوں کے نرخ اوج ثریا پر پہنچے ہوئے ہیں، اس دنیا میں کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہے کہ جسے آپ بلا معاوضہ حاصل کر سکیں۔ جی ہاں، بالکل موجود ہے اور وہ ہے یہاں کا ٹھنڈا، میٹھا اور خوشبودار پانی۔ اس پانی کی خصوصیات یہ ہے کہ اس میں سے سونف کی مسحور کن خوشبو آتی ہے جو کہ دل و جان کو ایک انوکھا سرور بخشتی ہے۔ کچھ لوگ اسے آب حیات سے تشبیہ دیتے ہیں اور یہاں پر خصوصی طور پر رک کر جی بھر کر سیراب ہوتے ہیں۔ بعض زندہ دل حضرات یہاں سے کولر اور بوتلیں بھر کر ساتھ لے جاتے ہیں کہ شاید دوبارہ انہیں ایسا صحت افزا پانی میسر آئے یا نہ آئے---چنانچہ ہم نے بھی اس روائیت کو زندہ رکھتے ہوئے خوب پانی پیا اور کچھ بوتلیں بھر کر گاڑی میں رکھ لیں تا کہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔ ہمیں یہاں کے لوگوں کی قسمت پر رشک آنے لگا کہ جنہیں پینے کے لئے ایسا صاف اور شفا بخش پانی میسر ہے وگرنہ بڑے شہروں میں تو کڑوا پانی پی پی کر لوگوں کے معدے گڑبڑ ہو گئے ہیں جس کے نتیجے میں وہ آئے دن

ڈاکٹروں اور حکیموں کی شکار گاہوں کے چکر کاٹتے رہتے ہیں کہ یار لوگوں نے مجبوری کا نام شکر یہ رکھا ہوا ہے۔

یہ بات دُہرانے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ اس نامی گرامی روڈ پر سفر کرنے کا ہمارا پہلا اتفاق تھا جس کی وجہ سے یہاں کے بارے میں ہماری معلومات بالکل صفر تھیں۔ ہمیں تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ راستے میں کون کون سے مقام آتے ہیں اور کن کن نظاروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ تو بھلا ہو شیخ صاحب کا جو کہ قدم قدم پر نہ صرف ہماری رہنمائی فرما رہے تھے بلکہ ہمیں محکمہ سیاحت والوں کی طرح مکمل اور بھرپور معلومات فراہم کر رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے رہبر کا کردار ادا کر رہے تھے۔ ہمیں آج پتہ چلا کہ ان کے پاس تو معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ موجود ہے' وہ یہاں کے چپے چپے سے آشنا دکھائی دے رہے تھے۔

بقول ان کے' وہ درجنوں بار اس روڈ کی سیاحی کر چکے تھے۔ اسلام آباد تو ان کے لئے سسرال بنا ہوا تھا کہ جہاں پر اکثر ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ذاتی گاڑی کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے کہ جب چاہو' گھر سے نکل پڑو اور جب جی چاہے' واپسی کے لئے رختِ سفر باندھ لو۔ اگر بسوں اور ویگنوں کے محتاج بن کر رہو تو دھکے کھاؤ۔ اگر ذرا سی دیر ہو جائے تو رات ہوٹل یا مسافر خانے میں گزارو گویا گھر سے بے گھر ہو جاؤ اور اپنے آپ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔

اچانک انہوں نے یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ آنے والا شہر کلر کہار ہوگا۔ وہی کلر کہار کہ جہاں سڑکوں پر موڑ ٹہلتے ہیں اور رقص کرتے ہیں۔ یہاں پر اتنے اونچے اونچے پہاڑ موجود ہیں کہ جنہیں دیکھتے وقت سر سے ٹوپی گر جاتی ہے اور کمر میں چک پڑ جاتی ہیں۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ انہیں یہاں پر ایک چھوٹا سا کام ہے جس کے لئے ہمیں مختصر وقت کے لئے موٹروے کو خیر باد کہہ کر شہر کی طرف جانا پڑے گا۔ دراصل وہ یہاں سے کچھ عرقیات خریدنا چاہتے تھے کہ جن کے فرمائش کنندگان کی فہرست ان کی جیب میں موجود تھی۔

جونہی کلر کہار انٹرچینج آیا' انہوں نے گاڑی موٹروے سے اتار کر بغلی شاہراہ پر ڈال دی۔ دس پندرہ منٹ کے روایتی سفر کے بعد ہم شہر جا پہنچے۔ انہوں نے عرقیات کے ایک مشہور اسٹور کے آگے گاڑی روکی اور مختلف عرقیات کے بارے میں تبادلہ خیالات کرنے لگے جبکہ ہم وقت گزاری کے لئے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ یہاں پر چاروں طرف گھنے اور سایہ دار درخت تھے جو کہ سُندر بن کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ ہم نے ایک جانب نگاہ دوڑائی تو وہاں پر ٹوکروں میں رکھے ہوئے خوبصورت لوکاٹ نظر آئے۔ تازہ اور پکے ہوئے لوکاٹ دیکھ کر منہ میں پانی کا نل چالو ہو گیا۔ اس موقع پر ہماری بے تکلفی کام آئی۔ ہم نے دوکاندار کی اجازت کا انتظار کئے بغیر ایک گچھا اُٹھایا اور مزے لے لے کر کھانے لگے۔ دوکاندار بھی شاید ہفتہ خوش اخلاقی منا رہا تھا' اس نے ہماری اس حرکت کا کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے ہمیں ایک اور خوشہ اٹھا کر دے دیا کہ آپ کی اپنی دوکان ہے۔ لوکاٹ واقعی بے حد لذیذ اور مزیدار تھے' کھا کر لطف آ گیا۔ پتہ چلا کہ یہ یہاں کی خاص سوغات ہے۔ ریٹ بھی انتہائی مناسب اور ہماری سوچ سے بھی کم تھے۔ یعنی صرف پچاس روپے کلو۔ یہاں سے ہم نے مختلف عرقیات کی ایک درجن بوتلیں خریدیں اور چلتے چلتے پانچ کلو لوکاٹ خرید لئے کہ اسلام آباد والے دوستوں کو گفٹ کریں گے۔ اس دوکاندار نے قریب ہی واقع لوکاٹ کے باغات کا ہمیں دورہ بھی کرایا اور ان کے بارے میں بھرپور معلومات فراہم کیں۔ یہاں پر مجموعی طور پر ہم نے سات سو روپے کی خریداروں کی۔ اس دوران گھڑی کی سوئیاں نصف گھنٹہ آگے چلی گئیں۔ چونکہ ہمارے پاس وقت محدود تھا اس لئے مشن مکمل ہوتے ہی ہم وہاں سے واپس نکل پڑے اور دوبارہ موٹروے پر چلنے والی ٹریفک کا حصہ بن گئے۔

اب ہمارے سامنے اونچے اونچے پہاڑ تھے اور لمبی لمبی چڑھائیاں

نمکین غزل

گیس تھی بند' اب بجلی نہیں ہے
جو آٹا ہے' تو گھر میں گھی نہیں ہے
جسے دیکھو' وہ سرگرداں ہے غم میں
بشر غم سے کوئی خالی نہیں ہے
بچارے کو ملے ہیں آٹھ سالے
قسم سے' ایک بھی سالی نہیں ہے
حسینہ نے اُڑا لی ساری تنخواہ
ابھی تک گھاس بھی ڈالی نہیں ہے
بجاؤں بین میں اب کس کے آگے
کبھی اِک بھینس تک پالی نہیں ہے
خوشی سے روح بھی پرواز کر لے
سنو' گھر میں ' میری بیوی نہیں ہے

روح' مردان

تھیں۔ چونکہ گاڑی نئی اور آرڈر میں تھی اس لئے وہ یوں چڑھتی چلی جا رہی تھی کہ جیسے چھپکلی شہتیر پر چڑھتی ہے۔ جب وہاں سے گزرنے والے ٹرک اور بسیں اس قدر آہستگی سے چل رہی تھیں کہ جیسے ان میں ٹربو انجن کی بجائے رکشے کا انجن لگا دیا گیا ہو۔ یہ چڑھائیاں اس قدر سخت اور ظالم ہیں کہ انجن کی جان نکال کر رکھ دیتی ہیں۔ اگر ڈرائیور ناتجربہ کار یا اناڑی ہو تو اسے ان راستوں کو عبور کرتے وقت خدا یاد آ جاتا ہے۔ اس کے باوجود روڈ بنانے والے کاریگروں کی فنی مہارت کی داد دینا پڑتی ہے کہ جنہوں نے مہارت اور جانفشانی سے ان فلک بوس پہاڑوں کے اندر سڑکیں بچھائی ہیں۔ ان راستوں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کم وبیش دس کلومیٹر پر مشتمل یہ چڑھائیاں اور ڈھلانیں ان کے ہرفن مولا ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ بعض مقامات کی اونچائی تو اس قدر زیادہ ہے کہ جب ہم چوٹی پر پہنچے تو وادیاں عرف پربتوں کی شہزادیاں بالکل چھوٹی سی نظر آتی ہیں۔ ان کا نظارہ یوں دکھائی دیتا ہے کہ جیسے کوئی شخص مینار پاکستان پر کھڑا ہو کر لاہور شہر کا نظارہ کر رہا ہو۔ غروب آفتاب کے وقت تو یہ منظر اس قدر سہانا ہو جاتا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی دلہن سہاگ کا جوڑا پہن کر چراغاں ہو گئی ہو۔ ان دلکش اور خوبصورت قدرتی مناظر کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ یہاں پر ہی کیبن نصب کر کے رہائش اختیار کر لی جائے۔ سچ پوچھیں تو یہ مقام موٹروے کا ڈریم لینڈ کہلانے کا مستحق ہے۔ ان راستوں اور گزرگاہوں کو عبور کرتے وقت جو لطف آیا' وہ شاید نیاگرا آبشار یا تاج محل دیکھ کر بھی نہ آتا۔ ایک جگہ پر ہم اس قدر بلندی پر آ گئے کہ نیچے دیکھ کر خوف آنے لگا حالانکہ اس میں خوفزدہ ہونے والی کوئی بات نہیں تھی مگر صاحبو! اس دل کا کیا علاج کیا جائے۔ کبھی یہ چاند پر پہنچ جانے کے باوجود نہیں ڈرتا اور کبھی سر پر سے لڑاکا طیارہ گزر جانے پر لرز اُٹھتا ہے--- یہاں سے بخیر وخوبی گزرنے کے بعد جب دوبارہ سیدھے سادھے راستے پر پہنچے تو ایک جگہ پر کاروں کی ماں ٹویوٹا عرف ٹوڈی کو زمین پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس کی ٹانگیں عرش کی طرف اور چھت فرش پر ٹکی ہوئی تھی۔ گاڑی اس قدر بُری طرح پچکی ہوئی تھی کہ اس کا حلیہ دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا کہ جیسے سفاک لوہاروں کی کسی ٹولی نے اس پر تابڑ توڑ ہتھوڑے برسا کر اپنے دل کی بھڑاس خارج کی ہو۔ اس حادثے کو دیکھ کر ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ یا تو اس کے ڈرائیور کو اونگھ آ گئی تھی یا پھر اوور اسپیڈ کی وجہ سے گاڑی اس کے قابو سے باہر ہو گئی۔ گویا مالک کی قسمت کی دیوی توے میں چلی گئی۔ اس کی خستہ حالی دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یا تو اسے کباڑی بازار والے بیاہ کر لے جائیں گے اور مقتل میں کھڑا کر کے اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے یا پھر اگر مالک کی پسلی مضبوط ہوئی تو وہ اسے دوبارہ تعمیر کرے گا جس کے نتیجے میں اس کی جیب کافی ہلکی پھلکی ہو جائے گی۔ ہم نے اس گاڑی کے بدنصیب مالک کے حق میں صدق دل سے دعا کی کہ مصیبت زدہ شخص کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے سے نیلی چھت والا خوش ہوتا ہے اور ثواب کا بونس عطا کر دیتا ہے--- کچھ دیر کے مزید سفر کے بعد ہم اسلام آباد ٹول پلازہ پر پہنچ گئے جو کہ اس موٹروے کا آخری سرا ہے لیکن ابھی ایک اور مرحلہ باقی تھا اور وہ تھا موٹروے پر سفر کرنے کا ٹیکس چکانے کا۔ کیبن کے اندر براجمان چوکیدار نے کارڈ کا معائنہ کرنے کے بعد ایک سو روپے جرمانہ سنا دیا۔ بادل نخواستہ یہ کڑوا گھونٹ بھی پینا پڑا کہ ہوٹل میں کھانا کھانے پر بل تو ادا کرنا ہی پڑتا ہے ورنہ ہوٹل والے باہر نہیں جانے دیتے۔

کہا جاتا ہے کہ زندگی ایک سفر ہے۔ یہ سفر ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے اور قبرستان میں جا کر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ راجدھانی میں چار پانچ گھنٹے گزارنے کے بعد ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ یہاں پر مختصر قیام کے دوران ہم نے کیسے کیسے نظارے دیکھے' اس کا احوال قلمبند کرنے کے لئے ایک دستہ کاغذ اور ایک عدد بال پین کی ضرورت پڑے گی جو کہ اس ظالم مہنگائی کے دور میں فضول خرچی کی جانب ایک قدم ہو گا۔ ویسے بھی اس سرگزشت کو لمبا کر کے ہم آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتے لہٰذا اس مسئلے کو سرد خانے کی نذر کرتے ہوئے سلسلہ وہیں سے شروع کرتے ہیں کہ جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اب ایک بار پھر ہم موٹروے پر رواں دواں تھے۔

شیخ صاحب کو گھر جانے کی جلدی پڑی ہوئی تھی کیونکہ ان کے ازدواجی کیمپ سے بار بار ہوم منسٹر کے فون آ رہے تھے کہ آپ اس وقت کون سے علاقے پر پرواز کر رہے ہیں اور کہ آپ کھانا راستے میں کھائیں گے یا عشائیہ ہمارے ساتھ کھائیں گے' مزید برآں آپ کب تک مرکزی ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے--- اس مہم میں ان کے بال بچے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ وہ بھی بار بار رنگ مار کر اپنے بابا جان کا مغز چاٹ رہے تھے۔ جب ان کی شرارتیں کنٹرول لائن پار کرنے لگیں تو انہوں نے موبائل کے سینے پر انگوٹھا دبا کر اسے توے میں پہنچا دیا کہ نہ ہو گا بانس' نہ بجے گی بانسری۔ واقعی یہ موبائل بھی وکھری ٹائپ کی چیز ہے۔ کبھی تو اس کی مدھر آواز سننے کو کان ترس جاتے ہیں تو کبھی اس کی آواز سن کر کانوں میں روئی ٹھونسنے کو جی چاہتا ہے۔ جب اس کی شرارتیں حد سے بڑھ جاتی ہیں تو اس وقت جی چاہتا ہے کہ اسے لے جا کر ایدھی سنٹر کے جھولے میں ڈال دیا جائے یا سو چھیدوں والی

جھولی رکھنے والے کسی فقیر کو خیرات میں دے دیا جائے کہ خس کم از جہاں پاک۔

اب ایک بار پھر موٹروے تھا اور ہم تھے۔ گاڑی حسب معمول پوری رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ روشنی کا دیوتا دن بھر خلق خدا کے منہ پر چانٹے مارنے کے بعد آنکھوں سے اوجھل ہو رہا تھا گویا لوڈ شیڈنگ کا ٹائم شروع ہو رہا تھا۔ اندھیرے کا احساس ہوتے ہی شیخ صاحب نے لائٹ سوئچ کا کان مروڑا' فوراً حکم کی تعمیل ہوئی اور گاڑی کی آنکھوں کی روشنی لوٹ آئی۔ اب ہر طرف نور کا سیلاب آ گیا۔ شاہراہ رنگ برنگی بتیوں سے منور ہو گئی۔ یہ منظر دیکھ کر یوں احساس ہوا کہ جیسے ستاروں کا قافلہ زمین پر اتر آیا ہو۔ ایک جگہ پر موٹروے پولیس کی ٹم ٹم کھڑی نظر آئی جس میں سے لال اور نیلی روشنیاں بلند ہو رہی تھیں جو کہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے اور کہ اسپیڈ توڑ کے جانے والے! ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں' پھر نہ کہنا کہ خبر نہ ہوئی --- مزید پیش قدمی کی تو درختوں کی اوٹ میں روپوش خفیہ کیمرے فٹ ہونے کی اطلاع سنائی دی۔ ان کے دیدار کی سعادت اگرچہ نصیب نہیں ہوئی مگر دل کہہ رہا تھا کہ کچھ تو ہے' جس کی پردہ داری ہے البتہ شیخ صاحب کی عقابی نظریں انہیں دیکھنے میں کامیاب ہو گئیں۔ ماننا پڑا کہ وہ اقبال کے شاہین ہیں۔ سچ ہے تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی رفتار کم کر لی کہ کہیں قانون کا اینٹی ڈنڈا حرکت میں نہ آ جائے' اور قہر سرکاری بن کر برس نہ جائے۔ اس ڈنڈے میں میزائل سے کم طاقت نہیں ہوتی۔ ہمارے ساتھ چلنے والی گاڑیوں نے بھی ایمرجنسی پلس کا احساس کرتے ہوئے اپنی اپنی رفتار کم کر لی کہ ہمہ یاراں جنت' ہمہ یاراں دوزخ۔

ادھر ڈینجر زون ختم ہوا' اُدھر گاڑی کی رفتار میٹر توڑ حد پر آ گئی۔ ہمارے قومی مزاج کی یہی تو خوبی ہے کہ ہم پل صراط سے گزر جانے کے بعد پھر اپنی کھال میں واپس آ جاتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ جنہوں نے شلواریں سلوائی ہیں' انہوں نے نیفے بھی رکھے ہیں۔ اب گاڑی ایک سو چالیس کلومیٹر کی رفتار سے اپنے جوہر دکھانے لگی۔ شیخ کی بالائی منزل میں نجانے کیا بات آئی کہ انہوں نے آگے جانے والی ایک شارک نما کار کو اوورٹیک کر ڈالا' اس جسارت پر اس کا باریش ڈرائیور تپ گیا۔ اس نے اس عمل کو اپنی اور گاڑی کی توہین گردانا' اسے بھلا یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ ایک چھوٹی سی گاڑی چاغی پہاڑ کے ماڈل جتنی گاڑی کو اوورٹیک کر جائے۔ چنانچہ اس نے فوراً چیلنج قبول کر لیا اور ایکسلیٹر پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ اس کی غیر

شغل + مغل

(شاعر حضرات سے بغیر معذرت کے ساتھ)

✿ محمد کامران شہزاد: دل سے دل کو ملا نہیں سکتا
تیرے در پہ آ نہیں سکتا

☆ کرایے کے لیے پیسے تو نہیں کم گئے؟

✿ اکبر ملک: کون سا وقت ہے اچھا آپ کی خاطر' جناب
مجھ سے بیگم نے یہ پوچھا رات کھانے کے بعد

☆ شوہر کے لیے اچھا وقت وہی ہے جب بیگم میکے گئی ہو۔

✿ محمد قربان: تھوڑی سی دیر کے لیے چارپائی پر لیٹا تھا
شریر دوستوں' نے جنازہ پڑھا دیا

☆ یعنی آپ دوستوں کو "پیارے" ہو گئے۔

✿ نعیم خان نیازی: کبھی بھی شکوہ نہ تجھ سے کریں گے پھر جانم
اگر تعارف کروا دو اپنی کسی سہیلی سے

☆ پھر "شکوہ" تو سہیلی ہی کرے گی۔

✿ روح' مردان: اپنے گاؤں کی لڑکیاں مجھ سے
جب بھی دیکھو تمہیں پردہ کرتیں

☆ آپ کو وہ اپنے جیسا تصور کرتی ہوں گی۔

✿ محمد صابر مغل عبدو پوری: پیش جو موبائل کیا بولی یہ تو بہت خوبصورت ہے
پیش جو دل کیا بولی اس تکلف کی کیا ضرورت ہے

☆ موبائل کے ساتھ آٹھ دس ہزار نقد دیتے تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔

✿ تنویر پھول: تجھ کو چاند کہوں کیسے
دھبے دار اے پگلی' چاند

☆ چاند کا ٹکڑا کہہ لیجئے' جناب!

✿ حافظ مظفر محسن: یہ ہیلمٹ سر پہ جب چڑھ گیا ہے
میرے سر کا وزن کچھ بڑھ گیا ہے

☆ وزن بڑھنے سے پہلے سر "خالی" سا لگتا تھا' نا!

✿ انصر لطیف: مئیں بھی منہ میں "پان" رکھتا ہوں
کاش' پوچھو اس کی وجہ کیا ہے

☆ مفت میں مل گیا ہو گا' نا!

✿ اکبر ملک: کوشش' کاوش کرتے رہنا
اچھی خواہش کرتے رہنا

☆ اچھی خواہش یہی ہے کہ ہمیشہ آدمی کنوارہ رہے۔

✿ اکبر ملک: شاعر ہو اشعار کی اکبر
چھم چھم بارش کرتے رہنا

☆ جی آپ کی ہمارے ساتھ کیا دُشمنی ہے؟

✿ اکبر ملک: اِک بیوی سے جی نہ بھرے گا
چار کی خواہش کرتے رہنا

☆ کوئی سرپھرا ہی یہ خواہش کر سکتا ہے۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

معمولی رفتار دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ یا تو اس کا ''کوچوان'' پاگل ہو گیا ہے یا گاڑی بے قابو ہوگئی ہے۔ ہم یہ سارا منظر سائیڈ شیشے میں براہ راست دیکھ رہے تھے اور مفت کی اس ریس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اب دونوں گاڑیاں اپنی پوری رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نیچی پرواز کر رہی تھیں۔ کبھی ہم آگے نکل جاتے تو کبھی رقیب آگے نکل جاتا۔ یہ سلسلہ چار پانچ کلومیٹر تک جاری رہا۔ آخر کار کالی دیوی ہمیں پاس کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ دراصل دونوں گاڑیوں میں کوئی مقابلہ نہ تھا' یہ کچھوے اور خرگوش کی کہانی تھی جس میں خرگوش کی جیت یقینی تھی۔ بہرحال' دلِ ناتواں نے مقابلہ تو خوب کیا۔ نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلا کیونکہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ گویا یہ سوچ کے دل کو بہلا لیا کہ۔۔۔

کبھی شاہ' کبھی پٹواری
کبھی اُتار لیں گے باری

جب سفر دیوار چین کی طرح لمبا ہو تو جہاں وہ بوریت کی فضا پیدا کرتا ہے' وہاں دماغ اور جسم کو نچوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ ڈرائیور کی تو جو حالت ہوتی ہے سو ہوتی ہے مگر ساتھ بیٹھا ہوا شخص بھی سستی اور کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب ہم بھیرہ انٹر چینج پر پہنچے تو تھکن سے چور چور ہو چکے تھے۔ چنانچہ یہ قرارداد پاس ہوئی کہ یہاں پر شارٹ بریک لے کر ہاتھ منہ کی سروس کر لی جائے اور خدا توفیق دے تو ایک ایک کپ چائے کا لے کر جسم کی بیٹری کو چارج کر لیا جائے کہ چائے ہزار نعمت ہے۔۔۔ چنانچہ ہم نے گاڑی کو پارکنگ لاٹ میں کھڑا کیا اور واش روم کی طرف چل پڑے۔ یہاں کا انتظام اے ون تھا۔ سکی باتھ روم' محفوظ کیبن' چمکتے دمکتے ایسٹرن اور ویسٹرن اسٹائل بیت الخلا' پانی کی فراوانی' استنجے کے پریشر والے ہولڈر' غرضیکہ وہ سب کچھ کہ جس کا عام جگہوں پر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کونے میں لوٹا پڑا ہوا نظر آیا جو کہ زبان حال سے پکار رہا تھا کہ ''کبھی ہم بھی تم سے تھے آشنا۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔'' باتھ روم کی یاترا کے بعد جب باہر آئے تو شیخ صاحب کو پلیٹ فارم پر اپنا منتظر پایا۔ وہ بڑے ٹھاٹھ سے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے اور وزارت صحت کی ہدایات کا منہ چڑا رہے تھے۔ ہم نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی کہ کھانے کی کس چیز پر چھاپہ مارا جائے۔ انجام کار نگاہیں بار۔ بی۔ کیو پر آ کر تھم گئیں۔ گرم گرم کبابوں سے اٹھنے والی بھاپ دل و جان کو مسحور کر رہی تھی۔ خوشبویات کا یہ عالم تھا کہ ناک پھٹی جا رہی تھی اور منہ میں بار بار پانی اُمڈ رہا تھا۔ چنانچہ بذریعہ پارلیمنٹ یہ فیصلہ ہوا کہ آج کبابوں پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ یہ سوچ کر آگے بڑھے اور اسٹال پر موجود کارکن سے شائستہ لہجے میں کہا:

''بھائی جان! چار کباب عنائیت فرما دیں۔''

منہ بولے بھائی جان نے ہماری بات سُنی اَن سُنی کر دی اور بدستور اپنے کام میں مصروف رہا۔ ہم نے اپنے الفاظ دوبارہ ادا کئے تو مغلوں کی سی بے نیازی سے بولا۔

''چار کبابوں کے ایک پلیٹ کی قیمت ایک سو پچاسی روپے ہے۔''

یہ سن کر ہمیں حیرت کا ایک زبردست جھٹکا لگا کہ جس کی شدت 440 وولٹ سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ ایک لمحہ کے لئے ہمیں اپنی قوت سماعت پر شک ہوا کہ ہم سے سننے میں کچھ غلطی ہوگئی ہے۔ چنانچہ درستگی کی خاطر ہم نے مکرر پوچھا۔

''آپ نے کیا فرمایا' ذرا دوبارہ ارشاد فرمائیں؟''

اس نے سیخوں کو نچاتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ ریڈیو پاکستان صرف ایک دفعہ بولتا ہے' اس کے باوجود میں آپ کو دوبارہ بتا رہا ہوں کہ اگر آپ کو کباب چاہئیں تو ایک چوکڑی کی قیمت =/185 روپے ہوگی۔''

ہم نے دل ہی دل میں حساب لگایا تو یہ جواب آیا کہ ایک کباب کی قیمت =/46 روپے سے کچھ اوپر بن رہی ہے۔ اس موقع پر ہماری رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی' ہم نے عرض کیا۔

''کیا ہرن کے کباب کھلاؤ گے؟''

اس پر وہ بھیگی بلی بن گیا اور اپنی کھوپڑی کھجاتے ہوئے بولا۔

''صاحب! کیوں مذاق کر رہے ہوں؟''

''مذاق ہم نہیں کر رہے ہیں' غالباً آپ فرما رہے ہیں۔۔۔ یہ بتائیں' کیا یہاں پر گوشت نہیں ملتا جب کہ بھیرہ شہر دس بالشت کے فاصلے پر ہے؟''

''صاحب! گوشت تو بے حساب ملتا ہے مگر کباب کھانے والے نہیں ملتے۔''

''ظاہر ہے جب آپ کے ریٹ اس قدر بلند ہوں گے تو فرشتے ہی کباب کھانے آئیں گے۔''

''ہم کیا کر سکتے ہیں جی' ٹھیکیدار بادشاہ کا آرڈر ہے کہ اس ریٹ پر مال فروخت کریں سو ہم تعمیل کر رہے ہیں۔۔۔ حکم کے غلام جو ٹھہرے۔''

شیخ صاحب نے اِس جلاّد پر تبرّہ پڑھا اور ہمیں چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد انہوں نے اپنا بیان جاری کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اُلٹی چھری سے ذبح کر رہے ہیں۔ منافع خوری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے‘ انہوں نے تو یہودیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے‘ اللہ اکبر!"

ہمارا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ان کے خلاف دیواروں پر نعرے لکھ دیتے۔ یوں ہماری کباب کھانے کی مسرت دل ہی میں رہ گئی۔ چونکہ گاڑی میں گیس ختم ہو رہی تھی اس لئے سوچا کہ یہیں سے گیس بھرا لی جائے‘ کیا پتہ آگے ملے یا نہ ملے۔ جب گاڑی آگے بڑھائی تو وہاں پر گیس کے سائلین کی لمبی قطار لگی ہوئی نظر آئی جو کہ آٹے کی لائن سے بھی کچھ بڑی ہی تھی۔ اس قطار کو دیکھ کر دل بیک وقت خوش بھی ہوا اور ناخوش بھی۔ خوش اس لئے ہوا کہ اب ہم نے قطار بندی کا اصول اپنا لیا ہے۔ ناخوش اس لئے ہوا کہ اب ہمیں آٹے‘ گھی اور چینی کے ساتھ گیس بھی لائن میں لگ کر ملے گی--- لائن کی غیر معمولی طوالت دیکھ کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے پرواز کر گئے۔ دل پکارا اٹھا کہ یا مظہر العجائب یہ کیا ہو رہا ہے۔ ڈیسک سے معلومات حاصل کرنے پر پتہ چلا کہ آج موٹروے پر معمول سے زیادہ ٹریفک چل رہی ہے‘ یہ رش اسی کا شاخسانہ ہے۔ امید پر جہاں قائم ہے لہٰذا اللہ کا نام لے کر قطار میں شامل ہوگئے کہ زندگی رہی تو نمبر آ ہی جائے گا۔ ہمیں یوں پر کھڑے ہوئے اچھی خاصی دیر ہوگئی مگر لائن تھی کہ آگے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے زمین نے ان کے پاؤں پکڑ لئے ہوں‘ اُدھر ڈرائیور برادری میں بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے حالانکہ گیس کی سپلائی دو اطراف سے جاری تھی‘ اس کے باوجود یہ حال تھا۔ کچھ ہی دیر میں لائن نے رینگنا شروع کر دیا۔ جیسے ہی تھوڑی سی جگہ بنی‘ ایک سفید رنگ کی مہران کار نے کہ جس کے مڈگارڈ پر اسپیشل ایڈیشن کا اسٹکر لگا ہوا تھا‘ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زبردستی لائن میں گھسنے کی کی کوشش کی۔ شیخ صاحب کو ایک درانداز کی یہ حرکت ایک آنکھ نہیں بھائی (دوسری آنکھ کا پتہ نہیں) چنانچہ انہوں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنانے کے لئے جلدی سے گاڑی آگے بڑھائی مگر اس وقت تک کچھ دیر ہو چکی تھی۔ ڈرائیور نے ہماری غفلت کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور بڑی صفائی سے لائن میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا جس پر یا شیخ کو تاؤ آ گیا‘ وہ فوراً گاڑی سے خارج ہوئے اور اس ڈرائیور سے اُلجھنے لگے کہ اس نے قطار توڑنے کی کوشش کیوں فرمائی؟ اس پر وہ بکری کی طرح منمناتے ہوئے بولا۔

"سر جی! آپ غصہ مت کریں اور ہماری عرضداشت سن لیں--- بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے صاحب کو اپینڈکس کی تکلیف ہو رہی ہے اس لئے ان کا جلد از جلد ہسپتال پہنچنا ضروری ہے ورنہ ان کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ بندہ اس غلطی کی معافی چاہتا ہے۔"

یہ دلیل اور اپیل سن کر ان کا سارا غصہ ہرن ہو گیا اور وہ واپس آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے کی زبان بتا رہی تھی کہ انہیں اس کہانی پر یقین نہیں آیا۔ یقین تو ہمیں بھی نہیں آیا تھا کیونکہ ان کی کہانی میں کافی جھول تھا۔ چنانچہ جیسے ہی ان کی گاڑی فلنگ پوائنٹ پر پہنچی‘ ہم اپنا شک دور کرنے کے لئے گاڑی سے نیچے اترے اور ٹہلتے ہوئے ان کی گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ ہم نے اندر جھانک کر دیکھا‘ ہمیں وہاں پر کوئی مریض نظر نہیں آیا بلکہ وہ سب لوگ اطمینان سے بیٹھے سگریٹ اور جُوس پی رہے تھے اور بے ہنگم قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ بڑی صفائی سے ہمیں بیوقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہمیں ان کی مریضانہ سوچ پر

ایک سیاسی نظم

۱

پچامے اور لے آؤ
ہمارے ملک میں جتنے پچامے ہیں
پرانے ہیں یا میلے ہیں
انہیں دھوبی کو دے آؤ
کہیں سے اور لے آؤ
کسی آڑے پچامے میں بڑی کرسی کا ناڑا ہے
کسی کو میرے حلقے کے سبھی ووٹوں نے ساڑا ہے
کسی کو اس عوامی دور نے مل کر بگاڑا ہے
او پاجامے‘ بتا!
تجھ کو یہاں کس کس نے پھاڑا ہے
کسی کے پائینچے امداد کے دھاگے سے سلنے ہیں
ابھی سرکار کی کھونٹی پہ بھی یہ سب لٹکنے ہیں
سلائی ہو نہیں سکتی تو ان کو پھینک ہی آؤ
پچامے اور لے آؤ
پچاموں کے جو ٹھیکیدار ہیں
چاچے ہیں‘ مامے ہیں
یہ مامے دور لے جاؤ
پچامے اور لے آؤ!

✿ سیّد فہیم الدین‘ دوحہ‘ قطر
sfd24@hotmail.com

سخت افسوس ہوا۔ ہم سوچنے لگے کہ لوگ اپنا مطلب نکالنے کے لئے کیسے کیسے شرمناک ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ آخر ہم لوگ کبھی سدھریں گے یا سدا یونہی رہیں گے۔ ہم نے قوم کی بے ڈھنگی چال پر فاتحہ خوانی کی اور واپس گاڑی میں آ کر مسند نشین ہو گئے۔

آخر خدا خدا کر کے ہمارا نمبر آیا۔ گیس بھروانے کے چکر میں ہمارا نصف گھنٹہ غارت ہو گیا تب جا کر ہمارے من کی مراد پوری ہوئی۔ چونکہ عشاء کی نماز کا وقت ہو رہا تھا اس لئے سوچا کہ کیوں نہ یہاں پر نماز پڑھ لی جائے تا کہ خدا کو یاد کرنے کا فرض پورا ہو جائے۔ چنانچہ ہم نے گاڑی مسجد کے قریب پارک کی اور داخلے کی تیاری کرنے لگے۔ ہم نے اپنے ٹائر اتارے اور انہیں بغل میں دبا کر اندر جانے لگے۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے دربان کو ہماری یہ حرکت پسند نہیں آئی' اس نے ہمیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ مسجد کے اندر جوتے لے جانے کی اجازت نہیں ہے لہٰذا انہیں باہر چھوڑ کر جائیں --- یہ عجیب و غریب حکم سن کر ہم چکرا گئے۔ ہم نے عرض کیا۔

''اگر ہمیں باتھ روم جانا پڑا تو اس وقت ہم کیا کریں گے؟''

''ہر باتھ روم کے باہر چپلوں کی جوڑیاں موجود ہیں' آپ انہیں پہن کر اندر جا سکتے ہیں۔''

حکم حاکم' مرگ مفاجات۔ ہم نے بادل نخواستہ جوتوں کو دروازے پر الوداع کیا اور مسجد کے اندر چلے گئے۔ یہاں کا انتظام قابل تعریف تھا' پانی کی بہتات تھی اور صفائی کا انتظام اپنی مثال آپ تھا۔ ہم نے وضو بنایا اور ہال کے اندر چلے گئے۔ اندر کا ماحول دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ پورے ہال میں خوب صورت قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہر طرف روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ماننا پڑا کہ مسلمان چاہے نمازیں پڑھیں یا نہ پڑھیں مگر مسجدیں بنانے اور سجانے میں سر فہرست ہیں' شاید اسی لئے شاعر مشرق نے فرمایا تھا ---

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

ہم نے سنتیں ادا کیں اور جماعت کے کھڑے ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ نماز کا وقت قریب آ گیا مگر امام صاحب کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ خیال آیا کہ یہیں کہیں حجرے میں بیٹھے تسبیح رول رہے ہوں گے اور آتے ہی ہوں گے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ پیش امام صاحبان امامت کے لئے عین اس وقت نازل ہوتے ہیں جب موذن تکبیر پڑھنے کے لئے پر تول رہا ہو مگر محبوب کی طرح انہیں آنا تھا' نہ آئے۔ اِدھر نمازیوں میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی' ان کی نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں کہ جہاں سے چاند نے طلوع ہونا تھا مگر دروازہ مسلسل ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ جب گھڑی کی سوئیاں نماز کے مقررہ وقت سے پانچ منٹ آگے بڑھ گئیں تو ان کی بے چینی کا ناپ بڑھ گیا۔ اور وہ فرط جذبات سے بار بار پہلو تبدیل کرنے لگے۔ عجب صورت حال تھی' بارات حاضر تھی مگر دولہا غائب تھا۔ اچانک گارڈ اندر آیا اور اس نے یہ اعلان کر کے سب نمازیوں کو حیرت زدہ کر دیا کہ آج امام صاحب نہیں آئیں گے کیونکہ موتیوں والی سرکار کی بکری گم ہو گئی ہے اور وہ اسے تلاش کرنے گئے ہوئے ہیں لہٰذا آپ لوگ ان کا انتظار نہ فرمائیں اور اپنی مدد آپ کے تحت خود ہی سجدے کر لیں۔ یہ تازہ بلیٹن سن کر تمام حضرات کھڑے ہو گئے اور نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ جب ہم نماز پڑھ کر باہر جانے لگے تو ہم نے دربان سے امام صاحب کی لاپرواہی کی شکائیت کی۔ جس کے جواب میں اس نے بتایا کہ امام صاحب زائد المیعاد ہو چکے ہیں' وہ قریب ہی کسی گاؤں میں رہتے ہیں اور وہاں پر دودھ دہی کی دوکان چلاتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ اگر موڈ ہو تو نماز پڑھانے کے لئے تشریف لے آتے ہیں ورنہ معاملہ اللہ کے سپرد کر کے الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی طبیعت مہینے میں دس پندرہ روز خراب رہتی ہے' حافظے کا یہ عالم ہے کہ چار کی بجائے پانچ رکعتیں پڑھا دیتے ہیں۔ اکثر چار رکعتوں والی نماز میں تیسری ہی رکعت پر فرش نشین ہو جاتے ہیں۔ سجدے میں جاتے ہیں تو اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے جس سے نمازی خوفزدہ ہو جاتے ہیں کہ خدانخواستہ فوت تو نہیں ہو گئے۔ نماز میں مسلسل کھانستے رہتے ہیں' بعض اوقات کھانسی کا دورہ اس قدر طویل ہو جاتا ہے کہ بے حال ہو جاتے ہیں۔ ایسے نادر روزگار امام صاحب کی تعریف و توصیف سن کر دل باغ باغ ہو گیا اور دل میں ان سے ملنے کی خواہشیں اجاگر ہو گئیں۔ بقول احمد فراز ---

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

لیکن مجبوری یہ تھی کہ ہمارے پاس ٹھہرنے کے لئے فاضل وقت نہیں تھا لہٰذا یہ معاملہ آنے والے وقت پر چھوڑ دیا کہ پھر ملیں گے' گر خدا لایا۔ اس کے بعد کیا ہوا' یہ جاننے کے لئے ہم آپ کو اگلی قسط کا لولی پاپ تو نہیں دے سکتے۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ رات ساڑھے گیارہ بجے جب گرد آلود پیشانیوں کے ساتھ ہم اپنے مرکزی اسٹیشن پر پہنچے تو تھکن کے مارے بُرا حال ہو چکا تھا' یوں لگ رہا تھا کہ جیسے تیس کوڑے کھا کر آئے ہوں۔

☆☆

کمال کی چیز

☆ منظور احمد اعوان

فہد نے بی۔اے کر لیا تھا اور اب سرکاری ملازمت کے لئے جوتے چٹخاتا پھر رہا تھا۔ اُس روز بھی وہ ایک جگہ انٹرویو دے کر اپنی سائیکل پر مایوس گھر کو لوٹ رہا تھا۔ گرلز کالج کے سامنے تانگوں، رکشوں اور لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی، معلوم ہوا کالج میں چھٹی ہو گئی ہے۔ راستہ مسدود ہونے کے باعث فہد کو بریک لگانی پڑی۔ وہ رُکا ہی تھا کہ ایک لڑکی بھیڑ کو چیرتی ہوئی اور "فہد بھائی---فہد بھائی---" پکارتی ہوئی اُس کی جانب بڑھی۔ کسی ہوئی سفید بے داغ یونیفارم میں ملبوس اُس گوری رنگت، پھولے پھولے گالوں اور بھرے بھرے جسم والی لڑکی کو وہ پہچان نہیں پا رہا تھا۔ جب وہ قدرے قریب آئی تو وہ پہچان گیا۔ وہ مُنشی جی کی بیٹی دُردانہ تھی۔ اُس کی گلی میں نکڑ والا مکان اُن ہی کا تھا۔

"بھائی جان ! آپ تو رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوئے ہیں---" وہ پاس آ کر بولی۔ اُس کی آواز میں گڑ جیسی مٹھاس تھی۔ "صبح ابو چھوڑ گئے تھے، اُنہوں نے لینے بھی آنا تھا لیکن پتا نہیں اب تک کیوں نہیں آئے ہیں۔ میں یہاں کافی دیر سے پریشان کھڑی ہوں۔"

"گھبرائیں نہیں---" فہد نے ملائمت سے کہا۔ "میں کوئی بندوبست کرتا ہوں۔"

پھر وہ بندوبست کرنے کے لئے جانے لگا۔

"چھوڑیئے، بھائی جان---!" دردانہ نے مایوسی سے کہا۔ "خوامخواہ کی بھاگ دوڑ میں آپ کا تیل نکل جائے گا، میں پیدل ہی چلی جاؤں گی۔"

قریب ہی ایک سوکھا سڑا نوجوان کسی اُلو کی طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر دُردانہ کو گھور رہا تھا۔

"باجی ! آپ کو پیدل جانے کی کیا ضرورت ہے، میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

بہن کے پیار کو "ترسے" ہوئے اُس نوجوان نے مستعدی سے کہا اور پھر اپنی پھٹیچر سی بائیک کو اسٹارٹ کرنے کے لئے لاتیں مارنے لگا۔ دُردانہ نے اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور فہد نے بھی۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں لے چلوں؟" فہد نے ڈرتے ڈرتے پیش کش کی۔

دُردانہ کھل اُٹھی۔ "اس میں بُرا ماننے والی کونسی بات ہے؟ آپ کوئی غیر تھوڑی ہیں، میرے ہمسائے ہیں۔ ہمسایہ تو ماں جایا ہوتا ہے۔" وہ اپنا بیگ سنبھال کر اُس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

"بڑا ہی نصیبوں والا ہے۔" بائیک والا نوجوان آہ بھر کر بڑبڑایا۔

دُردانہ اُس کی سائیکل پر کیا بیٹھی، اُس کی تو گویا لاٹری نکل آئی۔ وہ دِل ہی دِل میں "آ جانی بہہ جا سائیکل تے" کا وِرد کرتا جا رہا تھا۔ ابھی وہ مین روڈ پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس نے منشی جی کو سکوٹر پر آتے دیکھا اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ٹانگیں لرزنے لگیں لیکن منشی جی کی نظر اُن پر نہیں پڑی تھی، وہ تو بس ناک کی سیدھ میں دیکھ رہے تھے۔ وہ سکوٹر کو ہوا کے گھوڑے کی مانند اُڑاتے ہوئے آئے اور زن سے اُن کی دائیں جانب نکل گئے۔ اِس واقعہ کی خبر دُردانہ کو نہیں ہوئی تھی۔ فہد نے شارٹ کٹ کی بجائے جان بوجھ کر ایک لمبا راستہ اختیار کیا تا کہ کہیں پھر نہ منشی جی سے مڈبھیڑ ہو جائے اور اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا کر دُردانہ کے ساتھ دو چار باتیں کر لی جائیں، نہ جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو؟

دُردانہ ایک باتونی لڑکی تھی، راستہ بھی اُس کی زبان قینچی کی طرح چلتی اور فہد کے کان کترتی رہی۔ فہد یہ جان کر پھولا نہیں سما رہا تھا کہ اُن کے خیالات کافی حد تک ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ منزل کے قریب پہنچتے پہنچتے اُن میں اچھی خاصی انڈرسٹینڈنگ ہو چکی تھی، اجنبیت کے تمام پردے پیاز کے پرتوں کی طرح یکے بعد دیگرے اُترتے چلے

گئے تھے۔ کالونی شروع ہونے سے پہلے ہی فہد نے اُسے ڈراپ کر دیا کیونکہ آگے جانے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔

''جان! تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' دُردانہ نے اسے میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ کس بات کا' جانو---؟ فہد نے کسی فلمی ہیرو کی مانند اپنے بالوں کو جھٹک کر ڈائیلاگ بولے۔ ''یہ تو میرا مرض---سوری' فرض تھا۔''

اُس کی آنکھیں دُردانہ کے حسین سراپے کا طواف کر رہی تھیں اور دل مست ہو کر دھمال ڈال رہا تھا۔ وہ شرما کر چلی گئی وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا اور اپنے لاڈلے کی بے لگام دھڑکنوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ اب دُردانہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور وہ اس کے حسین خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک قریب ہی کسی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اُسے پکارنے لگا۔

''فہد پتر---ارے او فہد پتر!''

فہد نے آنکھیں کھول دیں' اُس کے پاس لاٹھی کے سہارے بابا خیر دین کھڑا تھا۔

''بڈھے! تو نے سارا مزہ ہی کرکرا کر دیا ہے۔'' اُس نے دِل میں کہا۔

''پتر! کدھر کو یلغار کے ارادے ہیں؟''

''بابا جی! میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔'' فہد نے ناگواری سے کہا۔

''تو پھر یہاں رُکے کیا کر رہے ہو' گھر کا راستہ بھول گئے ہو کیا؟''

''میرے یہاں رُکنے سے آپ کو کیا تکلیف ہے؟'' فہد نے منہ ٹیڑھا کر کے پوچھا۔

''پتر! تکلیف ہو میرے دُشمنوں کو' مجھے کیوں ہونے لگی؟--- ویسے میں بازار کی جانب جا رہا ہوں۔ اگر چھوڑ آؤ تو تمہاری مہربانی ہو گی' تمہیں دُعائیں دوں گا۔''

''نہیں' بابا جی! اپنی دُعائیں اپنے پاس رکھیں کیونکہ پچھلے ٹائر میں ہوا کم ہے---'' فہد نے بہانہ بنا کر صاف انکار کر دیا۔ ''ویسے پیدل چلا پھرا کریں' اس سے صحت بہتر رہتی ہے۔'' اس نے مشورہ دیا اور جانا چاہا۔

بابا خیر دین نے پیچھے سے کیریئر کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ فہد نے پیڈل پر پاؤں کا پورا دباؤ ڈالا مگر غریب کے ہتھ کی طرح بابے کی گرفت کافی سخت تھی' سائیکل ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''ٹھیک ہے' پتر! میں پیدل ہی چلا جاؤں گا---'' بابے نے کہا۔

''مگر جاتے جاتے میری ایک بات تو سنتے جاؤ۔''

''بہت ضروری بات ہے کیا؟'' فہد نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں' بہت ضروری ہے۔''

''اچھا' بولیں۔''

''کچھ دیر پہلے میں نے تمہارے پیچھے منشی کی بیٹی کو بیٹھے دیکھا تھا' اس وقت ہوا پوری تھی کیا؟'' بابے خیر دین نے طنز سے کہا اور کیریئر چھوڑ دیا۔

فہد سناٹے میں آ گیا۔ اُس کا دِل زور سے تھرتھرایا' اس نے خود کو پنکچر ہوتا ہوا محسوس کیا۔ ایک خوف نے اسے اپنے شکنجے میں بُری طرح جکڑ لیا۔ اسے اپنے ہاتھوں پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''بابا جی! میں تو مخول کر رہا تھا---'' اس نے چاپلوسانہ رویہ اپناتے ہوئے کہا۔ ''آپ خواہ مخواہ خفا ہو گئے۔ ہوا پوری ہے' آئیں تشریف کی ٹوکری رکھیں' جہاں کہیں گے پھینک آؤں گا۔''

''بابا خیر دین ''بسم اللہ'' پڑھ کر اور لاٹھی کو بغل میں دبا کر پیچھے بیٹھ گیا۔

''پتر! تم نیک ماں باپ کی اولاد ہو' اللہ تمہیں لمبی حیاتی دے۔ اللہ کرے تمہاری اور تمہاری سائیکل کی ہوا ٹائٹ رہے اور تم یوں ہی مجھ جیسے بزرگوں اور منشی کی بیٹی کی خدمت کرتے رہو۔'' اس نے دُعا دی۔

فہد کے احساسات اس وقت دھوبی کے گدھے کے جیسے ہو رہے تھے جو کپڑوں کا گٹھڑا اُٹھائے گھر اور گھاٹ کے چکر کاٹتا رہ جاتا ہے۔ اسے مفت میں یہ بھٹیک بھگتنا پڑ رہی تھی۔

''بابا جی کہاں اُتریں گے؟'' اُس نے نہایت ادب سے دریافت کیا۔

''پتر! مجھے رَین بو سینما کے سامنے اُتار دینا' بڑی زبردست پشتو فلم لگی ہوئی ہے۔''

''اوئے' بابیا! تیرا بیڑا غرق ہو---'' فہد نے حدِ اَدب کو پھلانگتے ہوئے کہا۔ ''اس بڑھاپے میں بھی یہ فلمیں دیکھتے ہیں۔ شرم آنی چاہیے' اب تو آپ کے میت (مسجد) میں بیٹھ کر ''اللہ' اللہ'' کرنے کے دن ہیں؟''

''پتر! میں اتنا بڈھا بھی نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ پشتو فلمیں دیکھ دیکھ کر ایسا ہو گیا ہوں۔''

''پشتو سمجھ لیتے ہیں کیا؟''

''کچھ کچھ لیکن مجھے زبان سے کیا لینا دینا' مجھے تو پشتو فلموں کی ہیروئنیں اچھی لگتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر دِل پشوری کر لیتا ہوں' یوں باہر

ے بڈھا اور اندر سے جوان رہتا ہوں--- ویسے پتر! کبھی فخر نہیں کیا ہے لیکن اب تو خیر سے اتنا تجربہ ہوگیا ہے کہ پشتو تو کیا انگریزی بھی سمجھ لیتا ہوں۔''

''بابا جی! آپ منشی جی کی بیٹی والی بات تو کسی کو نہیں بتائیں گے نا؟'' فہد نے اسے سینما کے سامنے اتارتے ہوئے اپنی تسلی کی خاطر پوچھا۔

''اونہیں' پتر جی! اب تم بے فکر ہوکر موجاں کرو۔'' بابا خیر دین نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ''بس مجھے کبھی کبھار سینما تک آنے جانے میں پرابلم ہوتی ہے' تمہیں زحمت دیا کروں گا۔''

یہ کہہ کر وہ لنگڑاتا ہوا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا سینما کے گیٹ کی سمت بڑھ گیا۔ فہد نے بھی گھر کی راہ لی۔

فہد کا انگ انگ تھکاوٹ اور مستی سے چور چور ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دُردانہ کے پیار کا خمار چھایا تھا۔ وہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا گیت ''کرگئی کرگئی جادو کرگئی'' گنگناتا ہوا داخل ہوا۔ اس نے سائیکل برآمدے میں پارک کی' پھر ایک چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ ماں اُس کے لئے ٹھنڈے ٹھار پانی کا گلاس بھر لائی۔ بیٹے کو خوش دیکھا تو اس کے دل میں اُمید کی ایک کرن ٹمٹمائی۔

''بیٹا! نوکری مل گئی ہے کیا؟'' اُس نے پوچھا۔

فہد نے پانی کا گلاس غٹا غٹ پی لیا۔

''نہیں' ماں! نوکری تو نہیں ملی البتہ--- چھوکری مل گئی ہے۔'' چھوکری والی بات اس نے دل میں کہی تھی۔

''بیٹا! مایوس مت ہوا کرو---'' ماں نے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ ''تیرے نصیب میں جو نوکری ہے نا' تجھے مل کر رہے گی۔''

''اچھا' ماں! باقی باتیں پھر سہی' لنگر میں کوئی دال دلیہ ہے تو لے آئیں' خالی پیٹ میں چوہے اِدھر اُدھر پنجے مارتے پھر رہے ہیں' ایسا نہ ہو کہ وہ بھوک کے مارے میری کوئی آنت ہی کاٹ کھائیں۔'' فہد نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور پھر چارپائی پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔

فہد اور دُردانہ میں خفیہ خط و کتابت کا سلسلہ چل پڑا۔ چھلوں' انگوٹھیوں' لاکٹوں' تصاویر اور خیالات کا تبادلہ ہوا۔ کبھی کبھار فون پر بھی ''ہیلو ہائے'' ہو جاتی۔ پھر ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ دُردانہ سکول سے چھٹیاں کرنے لگی' فہد انٹرویو کا بہانہ بنا لیتا اور پھر وہ سیر سپاٹے کے لئے نکل جاتے۔ وہ صبح سے دوپہر تک دُردانہ کو سائیکل کے کیریئر پر لاد کر کسی پھیری والے کی طرح پھرتا رہتا۔ پیڈل مار مار کر اس کی ٹانگیں شل ہو جاتیں' پھر وہ ستانے کے لئے کہیں بیٹھ جاتے۔ وہ اُنگلیوں میں اُنگلیاں پھنسائے' آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے میں کھوئے رہتے۔ وہ ایک دوسرے کے حواس پر بُری طرح چھا گئے تھے۔ انہوں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ اب وہ کسی ترکیب سے دو سے ایک اور پھر تین' چار' پانچ ہو جانا چاہتے تھے لیکن ظالم سماج نے اُن کی راہ میں دیوارِ چین کھڑی کردی تھی اور اس دیوار کو پھلانگنا آسان نہیں تھا۔

دُردانہ' فہد کو جوان مردی دِکھانے پر اُکساتی تھی اور فہد اُسے ہلاشیری دیتا رہتا تھا۔ دُردانہ ڈر کے مارے کسی سے بات نہیں کرتی تھی کہ اگر چھوٹے سے منہ سے اتنی بڑی بات نکل گئی تو اس کے والدین مار مار کر اس کی شکل بگاڑ دیں گے۔ فہد بھی بس سوچتا ہی رہ جاتا تھا کہ کبھی مناسب موقع پا کر ماں سے بات کرے گا' ابا کو وہ خود راضی کرلے گی۔

''بابا خیر دین فلموں کا بے حد رسیا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز آ دھمکتا۔ فہد کے گھر کی ڈور بیل بجاتا' فہد کو اُس کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ تھی لیکن چونکہ وہ اس کی کمزوری بھانپ گیا تھا اس لئے مرتا کیا نہ کرتا' فوراً ہی سائیکل نکالتا اور چپ چاپ اُس کے ساتھ ہو لیتا تھا۔

نمکین غزل

تعریف گر کرے کوئی تو جان وار دو
تم کو بُرا کہے کوئی تو لات مار دو
آنکھوں میں جس کے پیار ذرا سا بھی دیکھ لو
ہونٹوں سے تم بھی پیار اُسے بے شمار دو
وہ گھورتی ہے' گھور کر ہی دیکھتی رہے
گر ہو سکے تو تم بھی اُسے آنکھ مار دو
یہ کیا کہا کہ ایک ہی سے پیار ہے تمہیں
محبوب دو ہزار لو' دِل دو ہزار دو
گالی ہو یا سلام ہو یا اعتبار ہو
گر ایک بار دے کوئی تو بار بار دو
زردہ پکانا فن ہے مرے دوست' آج کل
چینی اگر نہیں ہے تو گڑ کا بگھار دو
کھولی ہے گر دکان محبت کے شہر میں
سارے حسین لوگوں کو اکبر اُدھار دو

✿ اکبر بخاری
موبائل: 0301-7560073
akber.bukhari@yahoo.com

ایک روز ماں گھر کے دالان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ فہد نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی۔

''نہیں، ماں! اب تم بوڑھی ہوگئی ہو، میں تمہیں کام کرتے دیکھتا ہوں تو میرے دل میں ہوک سی اُٹھتی ہے۔''

''ہاں بیٹا! اب مجھ سے بھی گھر نہیں سنبھالا جاتا ہے مگر یہ تکلیف اب کچھ دنوں کی ہے، پھر جب اس گھر میں بہورانی آجائے گی، نا! تو میں آرام سے کھاٹ پر بیٹھ کر حکم چلایا کروں گی۔ بس یہ گرمیاں نکل جائیں تو میں گاؤں جاؤں گی تیری پھوپھو سے بات کرنے، اس کی بیٹی جیراں لاکھوں میں ایک ہے۔''

''ماں! وہ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایک ہے لیکن اللہ میاں کی وہ گائے مجھے ایک آنکھ بھاتی۔''

''بیٹے! اپنی دوسری آنکھ کا علاج کرالو نا!'' ماں نے مشورہ دیا۔

''ماں! تم پھوپھو کے گھر نہ جانا، یہ اپنے پڑوس میں منشی جی ہیں، نا! اُن کے گھر چلی جانا۔''

''منشی جی کے گھر کیوں؟'' ماں نے دریائے حیرت میں ٹُبی (غوطہ) مار کر پوچھا۔

''اس کی بیٹی دُردانہ بہت اچھی، بہت ہی سگھڑ اور رج کے سوہنی ہے۔'' فہد نے اپنی تمام ہمت مجتمع کرکے کہہ ہی ڈالا۔

ماں ہکا بکا ہو کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اس کا بیٹا نہ ہو بلکہ کوئی ایسا گدھا ہو جس کے سر پر سینگ نمودار ہوگئے ہوں۔

''توبہ کر، بیٹا! توبہ--- ناک سے لکیریں نکال لے---'' اس نے فہد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تیرے باپ کو پتا چلے گا تو وہ تو تجھے چیر کے رکھ دے گا۔''

''ماں! مجھے پتا ہے کہ سب فتور تیرے سر میں ہے، ابا تو شریف بندہ ہے۔ وہ تجھ سے یوں ڈرتا ہے جیسے کوا غلیل سے۔ اگر تو مان جائے تو اس کو چٹکیوں میں راضی کرسکتی ہے۔''

''بیٹا! شاید تجھے خبر نہیں ہے کہ وہ ذات کے کمہار ہیں اور ہم جولاہے---'' ماں نے عذر پیش کیا۔ ''منشی اینٹوں کے بھٹے پر منشی ہے اور تیرا ابا پ فائر بریگیڈ میں نوکر ہے۔ بھلا آگ اور پانی کا بھی ملاپ ہوا ہے، تو کیوں اپنے ہی گھر کو آگ لگانے پر تُل گیا ہے؟''

''ماں! عشق، ذات پات نہیں پوچھتا ہے۔''

''ہاں، بیٹا! جو عشق تو کر رہا ہے، نا! اس میں گھوڑے گدھے سب ایک ہو جاتے ہیں اور خچر پیدا ہوتے ہیں لیکن بیٹا تو مجھ پر اور اپنے بوڑھے باپ پر اور اس گھر پر ترس کھا، ہم نے تجھے پال پوس کر اس لئے بڑا کیا ہے تاکہ تو اپنی زندگی بنائے اور ہمارے بڑھاپے کا سہارا بھی بنے اس لئے نہیں کہ تو شیدائی بن کر منشی کی بیٹی کے پیچھے پھرتا رہے۔''

ماں نے غصے سے کہا اور اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین کر مصروف ہوگئی۔ فہد کا دل ٹوٹ گیا۔ اتنے میں ڈور بیل بجی، بابا خیر دین تھا۔ اسے آج پھر سینما جانا تھا، فہد دانت پیس کر رہ گیا۔ اس نے سائیکل پکڑی اور باہر نکل گیا۔

ایک روز فہد اور دُردانہ چڑیا گھر میں بندروں کے جنگلے کے عین سامنے ایک میدان میں بیٹھے تھے۔ فہد کچھ چنے، مونگ پھلیاں اور پکوڑے لایا تھا۔ دُردانہ مرونڈا، اُبلے ہوئے انڈے اور جوس کے ڈبے لائی تھی۔ وہ ان لوازمات سے شغل مغل کر رہے تھے۔ بندروں نے انہیں پیٹ پوجا کرتے دیکھا تو وہ اُچھلنے کودنے لگے۔ وہ انہیں عجیب عجیب منہ بنا کر دکھا رہے تھے، چیخ و پکار کر رہے تھے۔ جنگلے کے تاروں میں سے ہاتھ باہر نکال کر پھیلا رہے تھے اور التجائیں کر رہے تھے کہ آج ہمیں بھی عنایت کردو---مگر فہد اور دُردانہ پر ان کی داد و فریاد کا ذرہ بھر اثر نہ ہو رہا تھا۔ عشق کرنے والوں کو عشق کے سوا سوجھتا ہی کیا ہے؟ انہیں دُنیا و مافیہا اور بندروں کی خبر ہی نہیں تھی، وہ تو بس ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

''فہد! آج کل میرے رشتے کی بات چل رہی ہے---'' دُردانہ نے ایک دھماکا کیا۔ ''اس سے پہلے کہ مجھے ڈنڈا ڈولی کرکے ڈولی میں بٹھا دیا جائے اور میں ہیر کی طرح چیخیں مارتی ہوئی بابل کے گھر سے رُخصت ہو جاؤں، تمہیں کچھ کرنا ہوگا۔ اپنے ماں باپ کو راضی کرو۔ جلدی ہوسکے انہیں ہمارے گھر بھیجو ورنہ ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔''

''جانِ من! میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکا ہوں، بہت مشکل ہے'' فہد نے بے بسی سے کہا۔

''اچھا، اگر یہ نہیں کرسکتے تو مجھے بھگا لے جاؤ۔''

نہیں، جانو! میں یہ بھی نہیں کرسکتا--- بعد میں اگر پولیس وا[لوں] کے ہتھے چڑھ گیا تو مار مار کے میرا کچومر نکال دیں گے۔''

''بُزدل کہیں کے---'' دُردانہ نے طعنہ دیا اس کی گدی پر گھونسا جڑ دیا۔ اس کی گدی جھنجنا اُٹھی۔ ''مرد کی ذات تو ہوتی ہی [illegible] ہے۔'' وہ کربناک آواز میں چلائی۔ ''مجھ جیسی سیدھی سادھی لڑکی کو پٹھی بنایا، پھر مطلب نکل جانے پر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ گدھا کہیں کا!''

یہ کہہ کر وہ سسکنے لگی۔ فہد اپنی تکلیف کو بھول کر اس کی دل جوئی [illegible] لگ گیا۔

مصروف تھے۔ فہد نے میدان صاف دیکھا تو ان کے پاس جا بیٹھا۔ مولوی صاحب دُعا کے بعد اُس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"بیٹا جی! کوئی مسئلہ ہے؟" انہوں نے ملائمت سے دریافت کیا۔

"ہاں' استادِ محترم! بہت گھمبیر مسئلہ ہے---" فہد نے کہا۔ "لیکن پہلے آپ وعدہ فرمائیں کہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے بھئی' وعدہ رہا کہ میں تمہاری بات کسی سے نہیں کہوں گا۔" مولوی صاحب نے اسے اطمینان دلایا۔

"جناب! میں بہت اُمیدیں آپ کے پاس لے کر آیا ہوں۔"

"اُمیدیں پوری کرنے والی ذات رب کی ہے---" مولوی صاحب نے شہادت کی اُنگلی سے اوپر کی جانب اشارہ کیا۔ "مسئلہ بیان کرو۔"

"استادِ محترم! مجھے ایک لڑکی سے پیار ہو گیا ہے---" فہد نے اپنا سارا حوصلہ مجتمع کر کے کہہ ہی ڈالا۔

"لاحول ولا---" مولوی صاحب بولے۔ "میں سمجھا تھا کوئی دینی مسئلہ ہے۔"

"جناب! وہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو اپنانا چاہتے ہیں لیکن ہمارے والدین راضی نہیں ہیں۔"

"اچھا تو' بیٹے! مجھے بتاؤ' میں اس بارے میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"جناب! آپ باقاعدہ نماز پڑھتے بلکہ پڑھاتے ہیں۔"

"ہاں' بیٹے! میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں' کسی پر احسان نہیں کرتا ہوں۔"

"آپ روزے بھی پورے رکھتے ہیں؟"

"ہر مسلمان کو رکھنے چاہئیں۔"

"گزشتہ سال آپ حج بھی کر آئے ہیں؟"

"ہاں' بیٹا! اللہ پاک نے کرم فرمایا ہے اور مجھ بندۂ حقیر و پر تقصیر کو یہ سعادت حاصل کرنے کی توفیق دے دی ہے لیکن اس سب کا تمہارے مسئلہ سے کیا واسطہ ہے؟"

"جناب! آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں' اللہ اپنے ایسے ہی بندوں کی سنتا ہے۔ آپ مہربانی فرمائیں اور مجھے کوئی ایسا تعویذ لکھ دیں کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔"

مولوی صاحب دنگ رہ گئے۔

"مگر' بیٹے! میں تو تعویذوں کا کام نہیں جانتا ہوں' تم کسی پیر فقیر کے پاس جاؤ۔"

"اُستادِ محترم! میں ایک پیر کو جانتا تو ہوں۔ پیر جنگلی عرف چکوروں چکورنیوں والی سرکار کو مگر وہ تو بڑا ہی ظالم پیر ہے جی' اس کے جھاڑ پھونک سے ہرے بھرے درخت سوکھ جاتے ہیں۔ دَم ایسا ٹکا کر کرتا ہے کہ بندے کا دَم ہی نکل جاتا ہے۔ جو بھی گلے میں اُس کا تعویذ آویزاں کر لے' وہ ہی (He) رہتا ہے' نہ شی (She) بلکہ اِٹ (It) بن کر تالیاں بجاتا اور ٹھمکے لگاتا پھرتا ہے--- شاہد اطہر جی کے دل کی دھڑکن اور "چاند" کے چکوروں کی جان' سیما جان کا بیڑا بھی اُسی نے غرق کیا ہے۔ بے چارے شاہد اطہر جی اب خون کے آنسو روتے ہیں' ان کے دل کی حسرتیں ان کے دل میں ہی رہ گئی ہیں۔"

مولوی صاحب حیرت سے اس کی اُوٹ پٹانگ باتیں سن رہے تھے۔

"یہ پیر جنگلی کون ذات شریف ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"شریف مت کہیں' جناب! وہ بڑا "وہ" ہے۔ تیس روزہ "چاند" میں مغز مار خصوصی کے عہدہ پر زبردستی قبضہ جما رکھا ہے اس ذاتِ شریف نے۔ وہ شادی کے بالکل خلاف ہے' خود نے تو درجنوں بیویاں اور لونڈیاں پال رکھی ہیں' کسی اور کی بغل میں ایک کو بھی دیکھ لے تو بلبلا اُٹھتا ہے--- کچھ عرصہ قبل وہ اپنی الٹی سیدھی باتوں اور حرکتوں سے اپنے ارد گرد ماہ جبینوں کا میلہ لگائے رکھتا تھا۔ جونہی اس کا کوٹہ پورا ہوا' منظرِ عام سے یوں غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ' صرف فوٹو باقی بچا ہے۔ سنا ہے آج کل اپنے حرم پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔ بیگمات اور لونڈیات (لونڈی کی جمع) کی باری مقرر کر رکھی ہے۔ اسے تو وضو کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی ہے۔ ایسے پیر کو بھلا میرے مسئلے سے کیا سروکار ہو گا؟"

"اچھا تو' برخوردار! کوئی اور پہنچا ہوا پیر ڈھونڈ لو۔" مولوی صاحب نے مشورہ دیا۔

"نہیں' جناب---!" فہد نے قطعی انداز میں کہا۔ "میری جان لبوں پر آئی ہوئی ہے۔ اب مجھ میں سکت نہیں ہے کہیں اور جانے اور ہر ایک سے اپنا دُکھڑا بیان کرنے کی' میرے لئے بس آپ ہی پہنچے ہوئے پیر فقیر اور درویش ہیں۔"

"بیٹے! میں اللہ کا عاجز بندہ ہوں' کوئی خاص ہستی نہیں ہوں۔ مجھے گناہ گار مت کرو۔" مولوی صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

فہد نے ان کی سنی اَن سنی کر دی اور ان کے گھٹنے تھام کر بولا۔

"استادِ محترم! آپ کو اللہ کا واسطہ ہے' کچھ کیجئے۔"

مولوی صاحب عجیب شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ ان کی پیشانی پر

سوچ کی گہری شکنیں تھیں۔ پھر وہ اٹھے' دیوار گیر الماری کھولی' ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالا اس پر قلم پھیرا اور پھر اسے لپیٹ کر فہد کے حوالے کر دیا۔

"بیٹے! میں نے تمہارے بے حد اصرار پر تعویذ بنایا ہے۔ استعمال کر کے دیکھ لو اور ہاں' اسے کسی بھی حالت میں ہرگز مت کھولنا۔" انہوں نے تاکید کی۔

"اچھا' جناب---!" فہد نے سعادت مندی سے کہا۔

مولوی صاحب نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

"اے اللہ! میں جانتا نہیں اور یہ مانتا نہیں۔ مولا تو بڑا رحیم و کریم ہے' اس کے حال پر رحم فرما۔"

فہد نے بھی ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے اور "آمین' آمین" کہہ رہا تھا۔

فہد نے تعویذ کو چاندی کی پتری میں بند کروایا' پھر اسے کالے دھاگے میں پرو کر گلے میں آویزاں کر لیا۔ اب وہ مطمئن تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب و کامران ہو جائے گا۔ اب وہ اس انتظار میں تھا کہ کب کوئی کرشمہ نور ظہور پذیر ہوتا ہے---دُردانہ کا احتجاج تا حال جاری تھا۔ اس کے رویے میں وہی رُوکھا پن' سرد مہری' بے رُخی اور بے اعتنائی تھی۔ وہ دُردانہ جو کبھی اس پر جان چھڑکتی تھی' اس قدر بدل جائے گی' فہد نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اب سوچتا اور کڑھتا تھا۔

اُس کی دیوانگی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی راتوں کی نیند اُڑ گئی تھی' دن کا چین لٹ گیا تھا کھانے پینے سے رغبت جاتی رہی۔ نہانے دھونے اور ڈھنگ سے پہننے کا ہوش نہ رہا۔ وہ ہر لحہ اپنی محبوبہ کے حسین خیالوں میں غرق رہنے لگا۔ اِسی دُھن میں اُس کی صحت تیزی سے گرتی چلی گئی۔ گال اندر کو دھنس گئے' آنکھوں میں وحشت سما گئی' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ داڑھی اور مونچھیں جھاڑ جھنکاڑ کی مانند بڑھ گئے' سر کے بال بھی چڑیا گھر کے گھونسلے جیسے ہو گئے تھے۔ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا تھا کہ وہ نشہ کرنے لگا ہے یا اُس پر کسی بھوت پریت کا سایہ ہو گیا ہے۔ اب تو بابا خیر دین بھی اس سے کترانے لگا تھا۔ وہ پیدل مارچ کرتا ہوا سینما کو چلا جاتا تھا۔ والدین کی پریشانی سوا تھی' وہ بھی اسے مریض سمجھنے لگے تھے۔ انہوں نے اسے بارہا ہسپتال یا کسی عامل کامل کے پاس لے جانا چاہا مگر وہ اَڑی کر جاتا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں' مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔" وہ بگڑ کر کہتا اور چیخنا چلانا شروع کر دیتا تھا۔

وہ کٹ کر رہ جاتے تھے' انہیں اس کے حال پر بے حد قلق تھا۔

ایک روز فہد گھر کے صحن میں ایک جھلنگا سی چارپائی پر اوٹانٹی کھٹوانٹی پڑا آسمان کو تکے جا رہا تھا' ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا اور ایک درد بھرا گیت گا رہا تھا---

"مائے نی میں کینوں آکھاں"

ماں نے جو اس کی یہ کیفیت ناگفتہ بہ دیکھی تو آبدیدہ ہو گئی۔ وہ بے اختیار اسے چومنے لگی۔

"میرے بیٹے' میرے لال' میرے جگر کے ٹکڑے! ابھی تو کینو کا موسم نہیں ہے' کہاں سے لا کر دوں میں تجھے کینو؟"

"ماں! میں کینو نہیں مانگ رہا ہوں' گانا گا رہا ہوں۔" فہد نے کہا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگا۔

"کوئی پیڑ (درد) ہے؟" ماں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"ہاں' ماں! پیڑ تو ہے۔"

"کہاں ہے---؟" ماں تڑپ اُٹھی۔ پھر اسے ٹٹولنے لگی۔ "تیرا تو جسم بھی تپ رہا ہے' بخار ہے کیا؟"

"ماں! اسے لوریا کہتے ہیں۔ یہ عشق کا بخار ہے' چڑھ جائے تو جان لے کر ہی ٹلتا ہے---" اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر سینے پر بائیں جانب رکھا اور بولا۔

"ماں یہاں درد ہے۔"

ماں کو پسلیاں چبھنے لگیں۔ "کوئی پسلی کریک ہوئی ہے یا پھیپھڑوں میں پانی چلا گیا ہے؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"نہیں' ماں! ان ابھری ہوئی پسلیوں کے نیچے دل ہوتا ہے' وہی دُکھتا رہتا ہے۔" فہد نے بتایا۔

"ہائے میں مر گئی' چل میرے ساتھ ہسپتال چل' میں تیرا اچھی طرح چیک اَپ اور علاج کراؤں گی۔" ماں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

مَیں مَیں

مَیں اور میری بکری اکثر یہ باتیں کرتے ہیں۔ کیا باتیں کرتے ہیں آپ کو بتا دوں تو آپ کو شرم آ جائے گی لیکن مجھے نہیں آئے گی۔ لہٰذا میں بتا دیتا ہوں۔ بکری مجھ سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

"ٹارزن جی! یہ تو بتائیں کہ آج کے ہر انسان میں لفظ "مَیں" بہت پایا جاتا ہے۔ مثلاً مَیں سب سے بڑھ کر ہوں' مَیں سب سے اچھا ہوں' مَیں سب سے بڑا عالم ہوں' مَیں نمبر ون ہوں--- اگر یہ اِنسان ہو کر "مَیں مَیں" کرتے ہیں اور مَیں جانور (بکری) ہو کر "مَیں مَیں" کرتی ہوں تو پھر انسان اور جانور میں فرق کیا؟ بلکہ اِنسان تو ایک قدم اور آگے ہے کہ "تو تو مَیں مَیں" بھی کرتا ہے۔"

اب آپ ہی بتائیں کہ مَیں کیا جواب دوں؟

ٹارزن 421

''نہیں، ماں! میرے اس درد کا علاج کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس نہیں ہے۔''

''تو پھر کس کے پاس ہے؟''

''دُردانہ کے پاس ہے، ماں! مجھے دُردانہ کے پاس لے چل، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' وہ مچل کر بولا۔

یہ سن کر ماں ہتھے سے اُکھڑ گئی۔ اس نے جوتا اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''دُر فٹے منہ تمہارا بھی اور اس بے درد دُردانہ کا بھی، آئندہ میرے سامنے اس ڈائن کا نام بھی مت لینا۔'' ماں نے جوتا ہوا میں لہرایا۔

فہد رو پڑا وہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''ماں! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ مجھے نہ ملی تو شہدائے عشق میں میرا نام سرفہرست لکھا جائے گا۔ تم میرے کفن دفن کا بندوبست کر لو اور میری میت پر پچھاڑیں کھانے اور سینہ کوبی کرنے کی تیاریاں کر لو۔''

جوتا ماں کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا، وہ بے اختیار فہد سے لپٹ گئی۔

''ماں صدقے، ماں واری---'' وہ اس کا منہ چومتے ہوئے بولی۔ ''نہیں میرے لال! میں تجھے حرام موت ہرگز نہیں مرنے دوں گی تو حوصلہ رکھ، میں آج ہی تیرے باپ سے بات کروں گی۔'' وار کاری پڑتا دیکھ کر فہد کا دل باغ باغ ہو گیا۔ ''لیکن، بیٹا! تو بھی میری ایک بات مان لے---''

''ماں! تو نے میری بات مانی ہے، نا! اب تو حکم کر، پھر دیکھ تیرا تابعدار بیٹا تیرے لئے کیا کچھ نہیں کرتا ہے۔'' فہد نے ترنگ میں آ کر کہا۔

''بیٹا! اب چارپائی کی جان چھوڑ دے---'' ماں بولی۔ ''اپنی یہ جنوں، بھوتوں والی شکل بھی ٹھیک کر لے اور پھر سے انسانی جون میں آ جا۔''

''ماں! تیرا حکم سر پر---'' فہد نے نیازمندی سے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ حجامت کرانے کے لئے نائی کی دکان کی جانب جا رہا تھا۔

سب سے پہلے محلے کی ایک کائیاں عورت مائی پھاپھاں کو سن گن لینے کے لئے بھیجا گیا۔ مائی پھاپھاں جس وقت پہنچی، منشیانی جی گھر میں اکیلی تھی۔ وہ مسور کی دال کو ایک بڑے سے تھال میں پھیلا کر اس میں سے کنکر چن رہی تھی۔ مائی پھاپھاں علیک سلیک کے بعد کنکر چننے میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی، ساتھ ساتھ دونوں گفت وشنید بھی جاری تھی۔

''منشیانی جی! کُڑی (لڑکی) کے دِن رکھے کہ نہیں؟''

''کیسے دن رکھیں، پھاپھاں! وہ بڑے لالچی لوگ ہیں، جہیز میں عجیب عجیب کی فرمائشیں کر رہے ہیں۔''

''وہ کیا منشیانی جی؟''

''کہتے ہیں زیور دو، کپڑے دو، فرنیچر دو، پانچ مرلے کا مکان دو، ایک لاکھ روپے نقد دو اور ایک زیرو میٹر موٹر سائیکل بھی لے کر دو تا کہ دُولہا راجہ دفتر آتے جاتے ہوئے بسوں اور ویگنوں میں نہ دھکے کھاتا پھرے۔''

''اچھا تو لڑکا دفتر میں کام کرتا ہے، کوئی وڈا افسر ہوگا؟''

''بڑا تو نہیں ہے پر بڑے سے کم بھی نہیں ہے۔ ایک سرکاری دفتر میں چپڑاسی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ جس نے بھی بڑے افسر سے ملنا ہوتا ہے، پہلے اس سے ملتا ہے۔ ساڑھے تین ہزار تنخواہ ہے، کھا پی کر دس بارہ سو بچا لیتا ہے۔''

''وہ بس سامان ہی مانگتے ہیں یا کڑی بھی؟''

''ابھی تو فرمائشیں ہی فرمائشیں ہیں، پھاپھاں! بڑا عجیب زمانہ آ گیا ہے۔ لڑکی بھی دو اور ان کی فرمائشیں بھی پوری کرو۔ شرم ہی نہیں آتی ایسے لوگوں کو بھاڑ سا منہ کھولتے ہوئے۔''

''ایسوں کو کوئی چھتر (جوتے) مارنے والا جو نہیں ہے۔''

''میں اور منشی جی تو دن رات اسی فکر میں گھلے رہتے ہیں کہ بیٹی کو کس طرح عزت سے رخصت کریں اور کس طرح ان کے ناجائز مطالبے پورے کریں۔''

''میری مانو تو اس رشتے کو ٹھکرا دو۔''

''تو کیا لڑکی کو ساری عمر گھر بٹھائے رکھیں؟''

''منشیانی جی! تمہاری کڑی بڈھی نہیں ہو گئی ہے جو تم اس قدر فکرمند ہو رہی ہو؟ ابھی وہ پڑھ رہی ہے اور اس کے لئے یہ کوئی آخری رشتہ نہیں ہے۔ تمہارے گھر میں بیری ہے، وٹے تو بار بار آتے رہیں گے۔ کسی مناسب رشتے کا انتظار کر لو۔''

منشیانی جی اس کی باتوں کی کچھ کچھ قائل ہو گئی تھی۔ مائی پھاپھاں نے وہاں سے لوٹ کر جب فائر مین حق نواز اور بیگم فائر مین کو ہری جھنڈی دکھائی تو وہ منشی جی کے گھر پر دھاوا بولنے کے لئے پر تولنے لگے۔ منشی جی کے گھر میں خوب رونق تھی، صحن میں چند چارپائیاں پڑی تھیں۔ ایک چارپائی پر فائر مین حق نواز اور بیگم فائر مین بیٹھے تھے جبکہ دوسری پر منشی جی، منشیانی جی اور ان چھوٹا بیٹا کاکا بیٹھے تھے۔ دُردانہ باورچی خانے

میں تھی۔ چولھے پر ایک پتیلی میں چائے کے لئے پانی اُبل رہا تھا اور وہ اس سے بے نیاز کھڑکی کی جھری سے کان لگائے باہر کی باتیں سننے میں مگن تھی۔ اس کا رواں رواں مسرت سے سرشار تھا اور دل بلیوں بلونگڑوں اُچھل کود رہا تھا۔

''منشی جی! فہد ہمارا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا ہے--- ہمارے بیٹے میں اور بھی بے شمار گن ہیں۔ بہت ہی خوبصورت، پڑھا لکھا اور تابعدار لڑکا ہے۔''

''ماشاء اللہ ماشاء اللہ--- اگر تم لوگوں کا لڑکا اتنا نیک اور شریف ہے تو کم ہماری لڑکی بھی نہیں ہے۔ شرم وحیا کی پتلی ہے پتلی--- آپ کا بیٹا کوئی کام وام بھی کرتا ہے یا نہیں؟''

''فی الحال تو فارغ ہے۔ بی۔اے کر چکا ہے، ٹرائی کر رہا ہے، آگے اللہ مالک ہے۔''

''میں چونکہ بھٹے پر منشی ہوں، اس کام میں میری کافی لوگوں سے دعا سلام ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اسے بھی کسی بھٹے پر منشی رکھوا دوں، تنخواہ بھی معقول ہوگی۔''

''بھائی صاحب! اگر تم یہ احسان کر دو تو ہم عمر بھر تمہیں اور تمہارے بچوں کو دعائیں دیں گے--- فی الحال تو ہم اپنے نیک اور ہونہار بیٹے کے لئے آپ کی دُختر نیک اختر کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔''

''مگر بھائی صاحب! ہماری بیٹی کا نام تو دُردانہ ہے۔''

''منشی جی! ذرا جواب جلدی دینا' نہ جانے کب اور کہاں آگ بھڑک اٹھے اور مجھے اس پر پانی ڈالنے کے لئے جانا پڑے۔''

''آپ کے بیٹے کی نوکری تو سمجھو ہو گئی ہے پکی لیکن ہم اس کے لئے اپنی بیٹی کا ہاتھ ہرگز نہیں دیں گے---'' یہ سن کر فائر مین حق نواز اور بیگم فائر مین کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ منشیانی جی بھی گھبرا گئی۔

''بلکہ پوری کی پوری بیٹی ہی دے دیں گے۔'' منشی جی نے اپنے بات پوری کی تو سب کے چہرے کھل اُٹھے۔

''لیکن اس کے لئے ہماری ایک شرط ہے۔'' منشیانی بولی۔

''تم لوگ زیادہ جہیز کی اُمید مت کرنا۔''

''بھائی صاحب اور بہن جی! تم لوگ ہمیں شرمندہ نہ کرو۔ ہمیں تو بس دُردانہ بیٹی چاہئے۔ ساتھ میں جو تم ماڑا موٹا سامان دو گے، ہم وہی قبول کرلیں گے۔''

''مجھے یقین ہے کہ ہمارے نیک، شریف اور شرمیلے بچوں کی جوڑی خوب جچے گی۔''

یوں ان بچوں کا رشتہ بخوبی طے پا گیا۔ منشی جی اور فائر مین حق نواز چارپائیوں سے اُترے اور آپس میں گرم جوشی سے بغل گیر ہو گئے۔ منشیانی جی اور بیگم فائر مین نے بھی ان کی تقلید کی۔ ایک دوسری کو بھینچ بھینچ کر ملیں اور خوب زور آزمائی کی۔ دُردانہ ٹرے میں چائے اور بسکٹ لے آئی تھی جو اس نے چارپائی کے درمیان پڑی میز پر رکھ دی۔ وہ بھی چائے اور بسکٹوں سے انصاف کرنے لگے۔ فائر مین نے جیب سے سو روپے کا ایک مُڑا تُڑا نوٹ برآمد کیا اور کاکے کو تھما دیا۔

''بیٹا! ذرا لپکتا جھپکتا ہوا حلوائی کی دکان پر جا اور مٹھائی کا ڈبا پکڑ لا۔''

کاکے نے نوٹ مٹھی میں دبوچا اور باہر کی سمت دوڑ لگا دی۔

''ڈبا خالی مت لے آنا---'' منشی جی نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ ''اس میں مٹھائی بھی ہونی چاہئے۔''

حلوائی کی دکان تھی ہی کتنی دور، آن کی آن میں مٹھائی آ گئی۔ مٹھائی پر بھی ٹڈیدوں کی مانند ٹوٹ پڑے۔ فائر مین حق نواز نے ابھی برفی کی ایک ڈلی منہ میں رکھی ہی تھی کہ ڈور بیل بج اُٹھی۔

سپریم انکوائری

✿ جس لڑکے کی کوئی محبوبہ نہ ہو وہ ایکٹریس کی تصویروں پر ہی گزارہ کرتا ہے--- مس فتنہ
☆ کیوں جی! کسی غریب کی ذرا برابر خوشی بھی آپ کو ہضم نہیں ہوتی؟
✿ مرد ایک ذمہ دار ڈرائیور ہے جو گھر کی گاڑی کو اپنے خون پسینے سے چلاتا ہے--- مدثر خان
☆ اِسی لیے تو بیگم بھی اِس کے ساتھ ڈرائیور جیسا سلوک ہی کرتی ہے۔
✿ جھوٹ عورت کا ہتھیار ہے جو آج کل مردوں کے قبضہ میں ہے--- عینی خان
☆ یہ عورتوں کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ اپنے ہتھیاروں کی بھی حفاظت نہ کر سکیں۔
✿ وہ غنڈے جو پولیس سے نہ ڈرتے تھے' اَب وہ برقعہ پوش لڑکی کو دیکھتے ہی بھاگ جاتے ہیں--- شاہد اطہر
☆ دراصل اُنہیں خدشہ صرف یہی ہوتا ہے کہ کہیں کوئی خودکش حملہ آور ہی نہ ہو۔
✿ پہلے لڑکیاں دل مانگتی تھی' اَب بیلنس مانگتی ہیں--- مدثر خان
☆ آپ بھی محمود گیلانی کی طرح ایک موبائل شاپ کھول لیں۔
✿ موبائل پر ایزی لوڈ مانگنا ہر لڑکی کا پیدائشی حق ہے--- مسٹر ڈبکلاں
☆ اور اِس کا مطالبہ پورا کرنا آپ کا پیدائشی فرض!
✿ مَیں نے بیگم کے ہاتھ سے شہد پیا تو وہ بھی زہر بن گیا۔
☆ کوئی بات نہیں' اَب محبوبہ کے ہاتھوں زہر پی کر دیکھ لیجئے۔
✿ ان لڑکیوں کے کالے رنگ پر سرخ میک اپ' کیا عجیب منظر پیش کرتا ہے--- بدر سعید
☆ ایک اُداس شام کا منظر! جیسے کوئی اپنے گدھے گھوڑے بیچ کر گھر واپس جا رہا ہو۔
ہم تو دفتر جا کر بھی گھر اور باورچی خانہ سنبھال سکتی ہیں' اپنی کہئے--- (ایک لڑکی)
☆ محترمہ! یہ تو بتایئے کہ اپنا یا باس کا؟

ممتاز علی بخاری (سپر مین)

کاکے نے دروازہ کھولا' سامنے فہد کھڑا دِکھائی دیا۔ اسے اندر بلا لیا گیا۔ فہد کی نگاہ سب سے پہلے دُردانہ پر پڑی اور پھر جم کر رہ گئی۔

دُردانہ کے منہ میں موتی چور کا لڈو تھا۔ وہ لڈو کھانا بھول گئی اور دُزدیدہ نظروں سے فہد کو دیکھنے لگی۔ یوں ہی کچھ دیر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے' پھر اچانک ہی دُردانہ شرما گئی اور غڑاپ سے کمرے میں جا گھسی۔ فہد گڑبڑا گیا۔ اس نے سب کو سلام کیا۔ بیگم فائر مین اور منشیانی جی نے اُٹھ کر اس کی بلائیں لیں' وہ کچھ حواس باختہ لگ رہا تھا۔

''ابا جی --- !'' اس نے فائر مین حق نواز کو مخاطب کیا۔ ''ابھی ابھی فائر اسٹیشن سے فون آیا ہے کہ فائر اسٹیشن ہی کو آگ لگ گئی ہے' آپ کو فوراً بلا لیا گیا ہے۔''

''یہ اسی نامراد ٹیلی فون آپریٹر کی کارستانی ہوگی جو سگریٹ پی کر ٹوٹا اِدھر اُدھر پھینک دیتا ہے۔ دوسری بار ایسا ہو رہا ہے' کسی روز خود بھی جل مرے گا ---'' فائر مین حق نواز نے خود کلامی کی پھر فہد سے کہنے لگا۔

''بیٹا فہد! تمہارے مقدر کے بند دروازے یکا یک کھل گئے ہیں۔ تمہیں چھوکری مل گئی ہے وِد نوکری۔ تم اِدھر بیٹھ کے منہ میٹھا کرو' میں تو چلا آگ سے لڑنے۔''

''بھائی منشی جی! اور بہن منشیانی جی! رَبّ راکھا --- !'' اس نے باہر کو لپکتے ہوئے کہا۔

''رَبّ راکھا --- !'' منشی جی اور منشیانی جی نے یک زبان ہو کر کہا۔

یوں چند ہی روز میں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔ ناممکن' ممکن ہو گیا تھا۔ فہد سمجھ رہا تھا یہ سب کچھ تعویذ کی بدولت ہوا ہے۔ اس نے دُردانہ کو بھی یہ بات بتائی اور وہ بھی قائل ہو گئی تھی۔

''دعوتِ ولیمہ میں مولوی صاحب بھی شریک تھے لیکن شادی کے ہنگاموں میں فہد اُن سے مل بھی نہیں پایا تھا۔ دو دن بعد وہ مسجد میں ہی اُن سے جا کر ملا۔ اُس وقت وہ بچوں کو قرآن کا درس دے رہے تھے۔ اُس نے اُنہیں مٹھائی کا ڈبہ پیش کیا۔

''اُستادِ محترم! اب اس تعویذ کا کیا کرنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بیٹا! اسے سنبھال کر رکھ لو ---'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شاید پھر کبھی ضرورت پیش آجائے۔''

اُن ہی دِنوں آفتاب کا ماموں زاد بھائی بجھا بجھا رہنے لگا۔ اس کی کیفیت بھی بالکل ویسی ہی ہو گئی تھی جیسی کچھ عرصہ قبل فہد کی ہوا کرتی تھی۔ فہد نے اسے ایک روز اُسے ٹٹولا تو بھید کھلا کہ وہ بھی محبت کا مریض ہے' وہ بھی کسی طرح دار حسینہ کی گھنیری زلفوں کا اسیر بن گیا ہے۔ اس کا کام بھی اَٹکا ہوا ہے اور اب جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

''ارے یار! گھبراتے کیوں ہو ---'' فہد نے اسے ڈھارس دی۔ ''تم نے پہلے بتایا ہوتا تو اب تک ہنی مون بھی منا چکے ہوتے۔ میرے پاس ایک کمال کی چیز ہے' اسے آزماؤ اور پھر دیکھو کہ کیا معجزہ ہوتا ہے؟''

اُس نے تعویذ آفتاب کے حوالے کر دیا۔ آفتاب نے تعویذ گلے میں ڈال لیا۔ کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ وہ بھی بامراد ہوا۔

ایک روز آفتاب مع اپنی دُلہن ان کے ہاں دعوت پر آیا ہوا تھا۔

''یار! یہ تو واقعی کمال کی چیز ہے ---'' آفتاب نے تعویذ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہا۔ ''سارے بگڑے کام اپنے آپ سنورتے چلے گئے۔ اسے کھول کر دیکھنا چاہئے کہ اس آخر اس میں کیا راز پوشیدہ ہے؟''

''نہیں' نہیں ---'' فہد نے اسے روکا۔ ''اُستادِ محترم نے اسے سختی سے کھولنے سے منع فرمایا تھا۔''

''لیکن میں تو اسے ضرور کھولوں گا۔'' آفتاب اپنی ضد پر جم گیا۔

فہد کے روکنے کے باوجود اس نے وہ تعویذ کھول ڈالا۔ تعویذوں میں عام طور پر عامل لوگ آڑی ترچھی لکیریں' عجیب و غریب اعداد اور اُلٹے سیدھے نام وغیرہ لکھتے ہیں مگر اس تعویذ میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کاغذ کا ایک صاف ٹکڑا تھا' اس پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ ان دونوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

اُسی شام دونوں نے مسجد میں نماز مغرب ادا کی' مولوی صاحب سے ملے۔ انہیں ان کے تعویذ کی بدولت آفتاب کی بھی کامیابی کا بتایا۔ مولوی صاحب کافی حیران ہوئے پھر بولے۔

''آپ لوگوں نے مجھے خواہ مخواہ بانس پر چڑھا دیا ہے۔ سارے کام کرنے والی اللہ کی ذات ہے' میں تو اس کا ایک عام سا بندہ ہوں۔ آپ اللہ کا شکر ادا کریں جس نے آپ کے دل کی آرزوئیں پوری کی ہیں۔''

''جناب! ہمیں آپ سے ایک غلطی کی معافی بھی مانگنی ہے۔'' فہد نے کہا۔

''معافی کس بات کی؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

جناب! ہم نے آپ کے منع کرنے کے باوجود وہ تعویذ کھول کر پڑھ لیا تھا۔'' آفتاب بول پڑا۔

''جاؤ' معاف کیا۔'' مولوی صاحب نے فراخ دِلی سے کہا اور مسکرا دیئے۔

☆☆

واہ بھئی، واہ

☆ بابو جان

آفس کے سینئر افسر مسٹر A.D (اللہ دِتہ صاحب) اپنے آفس میں میٹنگ کر رہے ہیں۔ انکے سامنے مسز شائستہ، شاہد جمال، افتخار صاحب وغیرہ بیٹھے ہیں' میٹنگ جاری ہے۔ مسٹر A.D مسکرا کر سب کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"آپ لوگوں کے لئے ایک خوشخبری ہے۔"

"کیا آپ کے ٹرانسفر کے آرڈرز آ گئے؟" شائستہ نے بہت خوش ہو کر پوچھا۔

مسٹر AD ابھی شائستہ کو غصے سے گھور ہی رہے تھے کہ شاہد جمال بے صبرے پن سے بولے۔

"سر! آپ کی جگہ کون صاحب آ رہے ہیں؟"

مسٹر AD دیدے پھاڑے حیرت اور غصے سے ان سب کی باتیں سن رہے تھے۔ افتخار صاحب کو دیکھتے ہوئے مسٹر AD کہنے لگے۔

"آپ کیوں خاموش ہیں' آپ بھی کوئی ریمارکس پاس کریں؟"

افتخار صاحب نے سینہ پھلاتے ہوئے منہ کھولا۔ "سر! آپ جہاں جا رہے ہیں' مجھے بھی وہاں لیکر چلیں۔"

"کیا آپ نے ان سے نکاح کر لیا ہے۔" شائستہ نے افتخار کی اس بات پر جل کر کہا (پھر نقل اتارتے ہوئے) "سر! آپ جہاں جا رہے ہیں۔ مجھے بھی وہاں ہی لے چلیں۔"

"مانا کہ ہم لوگ کافی تیزی سے ترقی کر رہے ہیں لیکن اب بھی گوروں سے کافی پیچھے ہیں۔" شاہد جمال نے مسکراتے ہوئے شائستہ بیگم سے کہا۔

اُن کا یہ کہنا تھا کہ مسٹر A.D غصے سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ "بالکل غلط' یہ صرف آپ لوگوں کا Infirity Compere ہے کہ ہم گوروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ آپ خود دیکھیں کہ میرے رینک کا گورا افسر یو کے میں بمشکل ایک 3 کمروں کے اپارٹمنٹ میں رہتا ہے جبکہ میں ڈیفنس میں 3000 ہزار گز کے بنگلے میں رہتا ہوں۔"

شاہد جمال (ڈر کر) "نہیں' نہیں--- میرا یہ مطلب نہیں تھا سر!---الحمدللہ' یہ مملکت خداداد ہے۔ یہاں ہذا من فضلِ ربی کی برکتیں جگہ جگہ برس رہی ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ہم لوگ شادی و نکاح کے معاملے میں اب تک یورپ سے خاصے پیچھے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" شائستہ نے تجسس اور حیرت سے پوچھا۔

شاہد جمال نے قابلیت جھاڑتے ہوئے شائستہ کو شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"وہ آپ نے کہا نا کہ کیا افتخار صاحب نے سر سے نکاح کر لیا ہے تو اس پر میں نے تصحیح کی کہ مردوں کی مردوں سے شادی گوروں کے ملک میں تو جائز ہے لیکن ہم اس معاملے میں کافی پس ماندہ ہیں۔"

A.D غصے سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ اپنی بکواس بند کرو۔"

افتخار بہت زیادہ خوش آمدی انداز سے۔ "ہاں' سر! آپ بولیں؟"

"تم لوگ اپنی چونچیں لڑانا بند کرو گے تو میں کچھ بولوں۔" A.D نے کہا اور مسکراتے ہوئے ایک کاغذ اٹھا کر فخریہ انداز سے لہراتے ہوئے اور تجسس کو ختم کرتے ہوئے۔ "یہ ہے ملازمتوں پر سے پابندی اٹھائے جانے کا نوٹیفکیشن---!"

یہ سننا تھا کہ سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سب مل کر اس خوشی کے موقع پر لڈی، بھنگڑا ڈالتے۔

"اوہ' ویری گڈ--- بہت دنوں سے پراڈو جیپ کا سوچ رہے تھا۔ اب تو آئی' آئی" شاہد جمال نے خوشی سے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''اور میں نے گذشتہ دنوں ایک بہت خوبصورت سیٹ دیکھا تھا۔'' شائستہ نے بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

افتخار صاحب سپنے بننے میں کسی سے کم نہیں تھے' وہ فوراً بولے۔

''سر! میں نے تو کلفٹن شاپنگ مال پر ایک دوکان کا بیعانہ دے دیا تھا اور اس فکر میں تھا کہ کہیں سے بندوبست ہوجائے تو---''

A.D نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بس' اَب آپ سب کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے لیکن میرٹ کا خاص خیال رکھنا ہے۔ میرٹ کا مطلب تو سمجھتے ہیں نا' آپ لوگ---؟''

''سر! پرانے سرکاری افسر ہیں ہم' میرٹ کا مطلب خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔''

شاہد جمال نے چاپلوسی سے کام لیتے ہوئے مسکہ لگایا تو افتخار صاحب بولے۔ ''سر! آپ فکر نہ کریں' کسی قسم کی کوئی یاری دوستی یا رشتہ داری اور تعلقات نہیں چلیں گے۔ ہر سیٹ پر کھلا Compitition ہوگا جو بڑی سے بڑی بولی دے گا' سیٹ اسی کی ہوگی۔''

A.D۔ ''گڈ' ماشاءاللہ سے آپ سب لوگ خاصے سمجھدار ہیں۔ بس اتنا خیال ضرور رکھ لیجئے گا کہ اس اولین میرٹ میں کچھ حصہ اوپر والوں کا بھی ہے۔''

اوپر والوں کا نام سن کر شائستہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''سر! یہ اوپر والوں کے پیٹ کتنے بڑے ہیں۔ اتنا کماتے ہیں پھر بھی ہوس نہیں مٹتی۔ ہم غریبوں کے حصے میں اگر تھوڑا بہت کچھ آجائے تو اس میں سے بھی سب کو حصہ چاہیے۔''

A.D ایک ٹھنڈی سانس لے کر۔ ''شائستہ بی بی! یہ سب سسٹم کی خرابی ہے۔ سسٹم کے خلاف تو نہیں جاسکتے' نا!''

ابھی میٹنگ جاری ہے اور میٹنگ روم کے باہر دفتر میں دینو جو کہ دفتر میں ایک اہم ترین ڈیوٹی' یعنی چپراسی کے عہدے پر فائز ہے، کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک ڈبہ ہے اور وہ بہت زور کا ٹھمکا لگا کر

''اوہ' بلے بلے--- کھل گئی ساڈی تقدیر' ہن موجاں ای موجاں۔''

آفس میں موجود سب خوش ہوکر دینو کی طرف دیکھتے ہیں۔ ادریس جو کہ اپنی نیند پوری کرنے میں مصروف تھے' دینو کی اس ہلڑ بازی سے پہلے تو دینو کی طرف بڑے غصے میں دیکھا مگر جب مٹھائی کے ڈبے پر نظر پڑی تو مٹھائی کو دیکھ کر منہ میں آئے پانی کو پیتے ہوئے کہنے لگے۔

''کیا بات ہے' دینو! بڑے خوش ہو' کیا کوئی لڑکی شادی پر تیار ہو گئی؟''

دینو مٹھائی کا ایک ٹکڑا رس ملائی وغیرہ ڈبے میں سے نکال کر ادریس بھائی کے منہ میں ٹھونستے ہوئے۔ ''ادریس بھائی! اب ایک کیا درجن تیار ہوجائیں گی۔''

کاوش صاحب نے چہکتے ہوئے اپنا ٹکا لگایا۔ ''کیوں بھئی' کیا لاٹری نکل آئی تمہاری---؟''

دینو نے خوشی سے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب کی نکل آئی' نوکریوں پر سے بین اٹھ گیا ہے۔''

سب خوش ہوکر ایک ساتھ بولے۔ ''سچ---؟''

دینو اَب رازدارانہ انداز سے۔ ''ہاں بالکل سچ--- میں ابھی سر کے کمرے میں چائے دے کر آیا ہوں' وہاں بڑی زبردست پلاننگ ہو رہی ہے' کاوش!''

''کس بات کی؟''

دینو: ارے' بنگلے بنوانے کی، دوکان خریدنے کی، پراڈو جیپ اور سونے کا سیٹ خریدنے کی---نوٹیفکیشن جو آگیا ہے۔

☆☆

دوسرے دن انوشے ریسپشن کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ہے۔ کان میں اس کے ایئرفون کا اسپیکر لگا ہوا ہے' چہرے پر بہت زیادہ غصہ ہے۔ طنزیہ انداز سے گردن ہلا کر کسی سے فون پر باتیں کر رہی ہے۔ سامنے دروازے سے مظلوم پاکستانی اندر داخل ہوتا ہے۔ ایک طائرانہ نظر آفس پر ڈالتا ہے' پھر ریسپشن پر معلومات لکھا دیکھ کر کاؤنٹر کی طرف خوش ہو کر بڑھتا ہے۔ انوشہ فون پر ہی مصروف ہے' دوسری طرف سے انکل کہہ رہے ہیں۔

''انوشہ! وہ دراصل تھوڑی سی غلطی میری بھی ہے۔''

عین اس وقت پر مظلوم پاکستانی کاؤنٹر کی طرف بڑھتا ہے اور مسکرا کر بولا۔

پاکستانی: ایکسکیوزمی!

انوشہ مظلوم پاکستانی کو دیکھتے ہوئے مگر فون پر بات کرتے ہوئے۔

''Excuse کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

مظلوم پاکستان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوتے ہیں وہ غور سے انوشہ کو دیکھتا ہے۔ انوشہ بظاہر اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکے سے مسکرا کر لیکن بات وہ فون پر کر رہی ہے۔

''انکل! یہ تو آپ کا حق بنتا ہے کہ آپ جو چاہیں انفارمیشن حاصل کریں۔''

مظلوم پاکستانی بہت خوش ہوتے ہوئے اپنے آپ سے بات کرتا ہے۔

''سب غلط رپورٹنگ کرتے ہیں، ہمارے سرکاری محکموں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دیانت دار اور ہمدرد---''

انوشہ ہاتھ کے اشارے سے مظلوم پاکستانی سے پوچھتی ہیں کہ وہ کیوں آئے ہیں' دوسری طرف سے فون پر انکل کی آواز آتی ہے۔

''انوشہ! میں چاہتا ہوں کہ تم رات کو ثاقب کے گھر آجاؤ' وہاں آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہو جائے گی۔''

مظلوم پاکستانی کچھ کہہ رہا ہے لیکن انوشہ کا سارا دھیان فون پر ہی اس لئے صرف اس کے ہونٹ ہلتے نظر آرہے ہیں اور وہ بات فون والے کی سن رہی ہے۔انوشہ ہاتھ کے اشارے سے مظلوم پاکستانی کو ایک طرف جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ،اور مسکرا کر فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔

''آپ وہاں پہنچیں' میں بھی یہاں سے فارغ ہو کر پہنچتی ہوں۔''

پاکستانی: شکریہ کہہ کر بہت خوش خوش انوشہ کے ہاتھ کے اشارے کی طرف بڑھتا ہے اور خود ہی سوچتا جا رہا ہے کہ میں اپنی رپورٹ میں اس لڑکی کا خاص طور پر ذکر کروں گا جو آؤٹ آف وے جا کر لوگوں کی مدد کرتی ہے۔ اس کا کام صرف انفارمیشن فراہم کرنا ہے لیکن یہ تو خود میرے ساتھ آجائے گی تاکہ مجھے اپنی بات دہرانا نہ پڑے۔واہ بھئی واہ..... پاکستان زندہ باد!

انوشہ فون پر اسی طرح باتوں میں مشغول ہے۔

☆☆

ایک اور صاحب کی ٹیبل جو اپنی میز پر بہت انہماک سے کمپیوٹر پر مصروف ہیں' انوشہ نے ان کی طرف ہی اشارہ کیا تھا۔ان کی میز پر شاہد جمال صاحب کا نام لکھا ہوا ہے۔مظلوم پاکستانی وہاں کھڑا دیکھ رہا ہے کہ شاہد صاحب فارغ ہوں تو وہ ان سے بات کریں لیکن شاہد صاحب کمپیوٹر پر بہت مصروف ہیں۔ایک نظر اٹھا کر مظلوم پاکستانی کی طرف دیکھتے ہیں اور دوبارہ اپنے کمپیوٹر پر مصروف ہو جاتے ہیں۔

پاکستانی: کتنا مصروف ہے یہ نوجوان اپنے کام میں' اسے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں حالانکہ اسے کیا خبر کہ شاہد صاحب کمپیوٹر گیم میں مصروف ہیں۔

پاکستانی: (بہت خوش ہو کر) پاکستان کا مستقبل تابناک ہے۔واہ بھئی' واہ پاکستان زندہ باد!

چند سیکنڈ بعد کمپیوٹر پر شاہد صاحب اپنا گیم ہار جاتے ہیں' تھوڑے

تخیلاتی قلابازیاں

شادی سے پہلے

گھونگھٹ کے ساتھ ہی کھلا ''جھاکا'' زبان کا
وہ شعلہ رُو ضرور تھی' آتش فشاں نہ تھی
قینچی سے تیز چلتی ہے جس کی زبان آج
شادی سے پہلے اِس قدر تو بدزباں نہ تھی

اعزاز

اظہارِ عقیدت کا یہ انداز تو دیکھو
خاوند کو دیا بیوی نے اعزاز تو دیکھو
''ٹٹ پونجیا'' کہہ کر وہ بلاتی ہے خصم کو
''شعلہ سا لپک جائے ہے' آواز تو دیکھو''

رانگ نمبر

پانچویں عقد کی جو ''آفر'' کی
شیخ جی نے کسی عفیفہ کو
بولی' حضرت! یہ رانگ نمبر ہے
آپ تاڑیں کسی ضعیفہ کو

گزارش

مجھے ' ڈاکٹر جی! نہ سمجھو غلط
یہ خدمت میں حاضر ہیں منہ مانگے دام
میری انتہائی گزارش ہے' بس
نہ لکھئے کڑوی دواؤں کے نام

پسند اپنی اپنی

ڈھونڈھ لیتا ہوں ''نیٹ کیفے'' کو
مجھ کو مسجد نظر نہیں آتی
یوں تو میری بصارت ''اوکے'' ہے
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

اور مانگے ہے

حد کی زد میں کہیں نہ آجائے
یہ تمنا کہ غور مانگے ہے
کیا تنوع پسند ہے زاہد
چار کر کے بھی اور مانگے ہے

نعیم نیازی' کلور کوٹ ضلع بھکر

سے بددِل ہو کر مظلوم پاکستانی کو دیکھتے ہوئے۔

''جی مَیں مظلوم پاکستانی ہوں۔''

شاہد: وہ تو پورے سولہ کروڑ ہیں۔

پاکستانی: جی نہیں' میرا نام ہی مظلوم پاکستانی ہے۔

شاہد: وہ تو شکل سے ہی لگتا ہے --- خیر' بولیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

پاکستانی: وہ --- آپ کے محکمے کی طرف سے جو اشتہار شائع ہوا تھا نوکریوں کے لئے میں اسی لئے حاضر ہوا ہوں۔

شاہد: (پاکستانی کو اوپر سے نیچے تک دیکھ کر پھر کچھ سوچ کر) آپ تشریف رکھیں۔

مظلوم پاکستانی بہت خوش خوش سامنے بیٹھ جاتا ہے۔

شاہد: دیکھئے' آپ مجھے ایک شریف آدمی نظر آتے ہیں۔

پاکستانی: جی' جی --- وہ تو مَیں ہوں۔

شاہد: (فخریہ انداز سے) وہ تو میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔ شکل سے ہی مظلومیت، بیچارگی اور بیوقوفی جو ٹپک رہی ہے۔

پاکستانی: (حیرت سے) جی ---!

شاہد: (ہنس کر) بھئی' آپ تو برا مان گئے حالانکہ میں تو آپ کے فائدے کی بات کر رہا تھا۔ آپ سرکاری ملازمت حاصل کرنے آئے ہیں تو تھوڑی سی تو ہوشیاری پکڑنا پڑے گی' نا!

پاکستانی: (اِدھر اُدھر دیکھ کر سامنے کی طرف جھکتے ہوئے) تو مجھے کچھ گائیڈ کریں' نا! --- کوئی مشورہ دیں۔

شاہد: مشورے کی تو فیس ہوتی ہے۔

پاکستانی: (حیرت سے پوچھا) کتنی فیس؟

شاہد: کیونکہ آپ چہرے سے شریف آدمی لگ رہے ہیں اس لئے زیادہ نہیں' صرف دو ہزار دے دیں۔

پاکستانی جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ پرس نکال کر اس میں سے ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال کر خاموشی سے شاہد جمال کی طرف بڑھاتا ہے۔

شاہد: (مسکراتے ہوئے کہتے ہیں) یہ فیس کی بھی عجیب کہانی ہے۔ میری والدہ کی طبیعت بہت دنوں سے خراب چل رہی تھی۔ میں نے انہیں ایک ہارٹ اسپیشلسٹ کے پاس لے گیا۔ دو ہزار فیس دے کر اور ڈاکٹر صاحب نے صرف ڈیڑھ منٹ میں فارغ کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ میری والدہ کو دل کی کوئی بیماری نہیں' ان کا جگر خراب ہے اور کسی جگر کے اسپیشلسٹ سے رجوع کرنا پڑے گا۔

پاکستانی: اور فیس واپس کر دی؟

شاہد: (نوٹوں کو جیب کے اندر رکھتے ہوئے) مشورہ کی فیس بھی کبھی واپس ہوتی ہے؟

پاکستانی: جی' جی --- یہ تو ہے۔ خیر' مجھے مشورہ دیں کہ اس سرکاری ملازمت کو حاصل کرنے کے لئے کیا کروں؟

شاہد: (ایک اور صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) نئے اپائنٹ منٹس کو افتخار صاحب ڈیل کرتے ہیں' آپ ان کے پاس چلے جائیے۔

شغل + مغل

☆ اُس کے بیک وقت دس افیئر چل رہے ہیں! اسی لئے دوستوں میں وہ ''پھنے خان'' مانا جاتا ہے --- نازیہ ناز نازی

✿ اور جن کے ساتھ افیئر چل رہے ہیں' اُن کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟

☆ جہاں بھی دو چار لڑکے اکٹھے ہوں' اُن کا موضوع صرف لڑکی ہی ہوگا --- نازیہ ناز نازی

✿ اور جہاں دو چار لڑکیاں اکٹھی ہوں' وہاں کون سا محفل نعت شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں بھی تو لڑکوں کا ہی ذکر ہوتا ہے۔

☆ نازیہ ناز نازی کی عمر کا اندازہ اس سے لگالیں کہ تین مصنوعی دانت تک ٹوٹ چکے ہیں --- بابو جان

✿ آپ کے تو مصنوعی بال تک گر چکے ہیں۔

☆ یہ بھی خوب ہے کہ عورت سے ساری عمر ڈر کر زندگی گزارو ورنہ جابر و ظالم کہلاؤ --- پرنس کشمیری

✿ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں کہ آپ اولذکر میں شامل ہیں یا آخرالذکر میں؟

☆ پاکستانی عورتوں کا سب سے اہم راز --- اُن کی عمر! --- محمد عباس

✿ اور پاکستانی مردوں کا سب سے اہم راز --- اُن کا بینک بیلنس!

☆ ''ایک عورت اپنی دو کمسن بیٹیوں کو ہلاک کر کے آشنا کے ساتھ فرار'' ایک خبر --- یہ ہے آج کل کی ماں! --- پرنس کشمیری

✿ اب آئی بے چارے آشنا کی شامت!

☆ بیگم کا ستایا ایک اور شخص جنگلوں میں بھاگ گیا۔ یقین نہ آئے تو ٹارزن 421 کو دیکھ لو --- سعید بدر

✿ اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟

☆ ''آئی لو یو'' --- ایک بہت بڑا جھوٹ جو ہر لڑکے کی زبان پر ہوتا ہے --- نازیہ ناز نازی

✿ اور ہر لڑکی یہی سننے کے لئے بے چین کیوں نظر آتی ہے؟

☆ مرنے کے بعد جب تک میرا میک اَپ نہ کیا جائے' کسی کو چہرہ دیکھنے کی اجازت نہ دینا --- ایک عورت کی وصیت --- سعید بدر

✿ کہ کہیں چہرہ دیکھ کر لوگ ڈر ہی نہ جائیں۔

☆ سگریٹ موت کی طرف لے کر جاتی ہے' شاید اسی لئے شوہر حضرات زیادہ پیتے ہیں --- بدر سعید

✿ حالانکہ بیوی ہی ''موت'' کے لئے کافی ہوتی ہے۔

☆ سچا عاشق دن میں کئی بار مرتا ہے --- ایزی لوڈ کرواتے وقت --- محمد محبوب ملک

✿ ہمیں آپ کے ''تجربے'' پر اعتبار ہے' بھائی!

محمد صابر مغل عبدو پوری

پاکستانی: لیکن میرے دو ہزار؟

شاہد: (مسکراتے ہوئے) وہ تو مشورہ دینے کی فیس تھی کہ آپ غلط آدمی کے پاس آگئے ہیں، میں تو پینشنز کے کیسز ڈیل کرتا ہوں۔

پاکستانی: صرف اتنی سی بات بتانے کے دو ہزار لے لئے آپ نے؟

شاہد: کل ہارٹ اسپیشلسٹ صاحب نے بھی اتنی سی بات بتانے کے مجھ سے دو ہزار وصول کئے، اب آپ خود سوچیں نا، کہ میں چھوٹا سا سرکاری ملازم مختصر سی تنخواہ سے دو ہزار انہیں کیسے ادا کر سکتا ہوں؟

پاکستانی: لیکن میں کیسے---؟

شاہد اس کی بات کاٹتے ہوئے۔ ''جب آپ کو نوکری مل جائے گی تو میں یہ ترکیب بھی بتا دوں گا کہ آپ دو ہزار کس طرح کما سکتے ہیں۔ فی الحال مجھے کام کرنے دیں، میں سرکاری آدمی ہوں اور ڈیوٹی کے دوران میں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔''

یہ کہہ کر دوبارہ اپنے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

☆☆

افتخار صاحب کی میز۔ دینو میز کی صفائی کر رہا ہے۔ مظلوم پاکستانی اس کے پاس پہنچ کر دینو سے کہتے ہیں۔

''افتخار صاحب کہاں ہیں؟''

دینو ایک نظر ان کی طرف دیکھتا ہے، کوئی جواب نہیں دیتا بلکہ برا سا منہ بناتا ہے اور پھر میز پر کپڑا مارنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

مظلوم پاکستانی جھنجھلا کر۔ ''بھئی، افتخار صاحب کہاں ہیں؟''

دینو پھر اس کو دیکھتا ہے اور دوبارہ کپڑا مارنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ مظلوم پاکستانی اب پھر اس کی طرف دیکھتا ہے اور زیادہ جھنجھلا کر۔

''تم بہرے ہو کیا؟''

دینو پھر شریف صاحب کو دیکھتا ہے اور گردن نفی میں ہلا کر دوبارہ کپڑا مارنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

پاکستانی: (بہت زیادہ جھنجھلا کر) پھر جواب کیوں نہیں دیتے کہ افتخار صاحب کہاں ہوں گے؟

دینو زبان نکال کر دکھاتے ہوئے۔ ''بول سکتا ہوں۔''

پاکستانی: تو پھر بتاتے کیوں نہیں کہ افتخار صاحب کہاں ہیں؟

دینو: میں چپراسی ہوں۔ میرا کام صاحب لوگوں کی میزوں کی صفائی کرنا اور فائلیں ادھر سے اُدھر کرنا ہے، معلومات دینا ان کا کام ہے۔

یہ کہہ کر کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پاکستانی: اس لڑکی نے ہی تو مجھ کو (شاہد صاحب کی طرف اشارہ کر کے)

شغل + مغل

میں اور میری گرل فرینڈ شادی کر رہے ہیں۔
بڑے خوش قسمت ہو، شادی کب ہے؟
میری بیس جنوری کو اور اُس کی پچیس جنوری کو۔

☆

اگر کار چلاتے ہوئے اچانک راستے میں شیر آجائے تو تم اپنا بچاؤ کیسے کرو گے؟
یہ تو کوئی مشکل کام نہیں میں دائیں جانب کا اشارہ دے کر بائیں جانب مڑ جاؤں گا۔

☆

مجھے کوئی مہنگی سی چیز سونے کی لے کر دیجئے نا! بیوی نے شوہر سے کہا۔
''اچھا پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ میں تم کو تکیہ لے کر دیتا ہوں۔''

☆

احمق: سرکاری ہسپتال کتنے بجے تک کھلا رہتا ہے؟
آدمی: چوبیس گھنٹے!
احمق: نیا ٹائم یا پرانا ٹائم؟

☆

ایک دیوار پہ لکھا تھا۔ ''دیکھنے والا الو ہے۔''
ایک آدمی نے دیوار پر یہ لکھا دیکھا تو اُسے بہت غصہ آیا اور اسی عبارت کے نیچے لکھ دیا۔
''لکھنے والا الو ہے۔''

☆

ایک شخص (دوسرے سے): اگر میں دیکھوں کہ ایک آدمی اپنے گدھے کو بے دردی سے مار رہا ہے اور اگر میں ایسے کرنے سے روکوں تو اس جذبے کو کیا کہیں گے؟
دوسرا شخص: برادرانہ محبت!

☆

ایک آدمی رات کے دو بجے تہجد پڑھ کر دُعا مانگ رہا تھا۔
''اے میرے پروردگار! باقی سب سوئے ہوئے ہیں اور میں تیری عبادت میں مصروف ہوں۔''
''کمینے! ہماری کیوں شکائتیں لگا رہے ہو، اپنی بات کرو نا!'' ساتھ والی چارپائی سے آواز آئی۔

☆

بیٹا: پڑوسی کی لڑکی کو انگلش بالکل نہیں آتی۔
باپ: تمہیں کیسے پتہ چلا؟
بیٹا: میں نے کہا آئی لو یو اور اُس نے گال پر تھپڑ جڑ دیا۔

☆

شوہر بیگم سے: اگر میں آپریشن کے دوران مرگیا تو آپریشن کرنے والے ڈاکٹر سے شادی کر لینا۔
''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟'' بیگم نے پوچھا۔
''اُس سے بدلہ لینے کے لیے۔'' شوہر نے جواب دیا۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

ان صاحب کے پاس بھیجا۔ اور انہوں نے دو ہزار لے کر یہ مشورہ دیا کہ افتخار صاحب سے رابطہ کرلوں۔

دینو: آپ نے مشورہ لینے کے پیسے تو دے دیئے' اب اصل آدمی سے ملانے کے لئے بھی تو کچھ خرچ کریں۔

پاکستانی: (حیرت سے) کیا؟

دینو: سیدھی سی بات ہے۔ میں چپراسی ہوں' انفارمیشن دینا میری ڈیوٹی میں شامل نہیں بلکہ یہ ایڈیشنل ڈیوٹی ہے اور اس ایڈیشنل ڈیوٹی کی تنخواہ حکومت مجھے نہیں دیتی۔

پاکستانی: اوہ' یہ بات ہے۔

دینو: (اب ذرا قریب آکر) آپ شریف آدمی لگتے ہیں۔ میں نہ صرف یہ انفارمیشن دوں گا کہ افتخار صاحب کون ہیں بلکہ آپ کی ان سے میٹنگ بھی کرادوں گا لیکن اس کی فیس ہوگی۔

شریف پاکستانی: کتنی---؟

دینو: ویسے تو یہ دو کام ہو گئے' پہلے تو یہ بتانا کہ افتخار صاحب ہیں کون اور پھر ان سے ملانا لیکن آپ کیوں کہ شریف آدمی ہیں اس لئے آپ سے رعایت کرلیتا ہوں صرف پانچ سو میں۔

پاکستانی: او۔کے۔ یہ لو۔

یہ کہہ کر پانچ سو کا نوٹ نکال کر دینو کے حوالے کرتا ہے۔ دینو نوٹ لیکر جیب میں رکھتا ہے۔

''آج افتخار صاحب چھٹی پر ہیں کل آئیں گے۔''

پاکستانی: کیا---؟

☆☆

دوسری طرف A.D کے آفس میں A.D صاحب کی میز پر بے تحاشہ ناشتہ کا سامان رکھا ہوا ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے کھانے میں مصروف ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے اور شائستہ اندر جھانکتی ہیں۔ A.D صاحب آنکھ کے اشارے سے ان کو اندر آنے کو کہتے ہیں۔ شائستہ میز پر رکھی اتنی ساری چیزوں کو دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہتی ہے۔

''ماشاءاللہ' کھاتے خوب ہیں آپ۔''

A.D کچھ کہتے ہیں لیکن وہ سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ منہ پوری طرح بھرا ہوا ہے مضحکہ خیز سی آواز نکلتی ہے۔

''غو---غوں---غوں۔''

شائستہ: کھائیں' کھائیں۔ آپ نے کون سے پیسے دینے ہیں۔''

A.D صاحب اب منہ میں جو کچھ ہے' وہ نگل کر بوتل سے ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہیں۔ ایک ڈکار زور کی لیتے ہیں۔ شائستہ برا سا منہ بناتی ہے۔ A.D پیٹ پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے۔

''جتنا بھی کھائیں' ایک ہلکی سی ڈکار اور سب ہضم کیجئے۔ آپ بھی کھایئے۔''

یہ کہہ کر سامنے رکھی کیک کی پلیٹ میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکال کر شائستہ کی طرف بڑھاتے ہیں۔

شائستہ: بس اتنا سا---!

A.D: (غصے سے) گریڈ 20 کی پلیٹ سے گریڈ 16 کے ملازم کو اتنا ہی مل سکتا ہے۔ شکر کر کے یہ لے لیجئے ورنہ---!

یہ کہہ کر پلیٹ دوبارہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ شائستہ جلدی سے بڑھ کر کیک کی پلیٹ ان کے ہاتھ سے لے لیتی ہے۔

A.D: اب بتایئے کیا مسئلہ ہے؟

شائستہ: سر جی! مسئلہ کوئی نہیں' ایک چھوٹی سی گزارش تھی۔

A.D: (شاہانہ انداز سے) پیش کی جائے۔

شائستہ: سر جی! وہ آپ نے بھرتیوں کا سارا کام افتخار صاحب کے حوالے کر دیا ہے۔ اس طرح ان پر لوڈ بہت زیادہ ہو جائے گا' مجھے ڈر ہے کہ شاید وہ ہینڈل نہ کر سکیں۔

A.D: یہ پرابلم ان کی ہے۔ میری تو ان سے ڈیل ہو چکی ہے۔ دس ہزار روپے فی سیٹ!''

شائستہ: (بہت حیران ہو کر) دس ہزار روپے فی سیٹ؟

A.D: (فخریہ انداز سے مسکراتے ہوئے) دیکھا آپ نے گریڈ 20 تک میں ایسے ہی نہیں پہنچ گیا' افتخار میں بڑی صلاحیتیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ بہت سمجھدار آدمی ہے۔

شائستہ: (منہ بنا کر) جی' جی---وہ بہت سمجھدار آدمی ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی سمجھدار جبکہ آپ اس کے بالکل برعکس!

A.D: (غصے سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے) کیا مطلب ہے آپ کا؟

شائستہ: پانچ ہزار روپے فی سیٹ کا چونا' آپ کو سیدھا سیدھا۔

A.D: کیا (پھر کچھ سوچ کر) بھئی' ٹھیک ہے۔ دس ہزار ہمیں دے گا تو خود بھی تو کچھ کمائے گا' نا! بھئی' بیوی بچوں والا آدمی ہے۔

شائستہ: (اسی انداز سے منہ بنا کر) ہاں کمائے گا بیچارہ پندرہ ہزار روپیہ فی سیٹ۔

A.D: کیا---پندرہ ہزار روپیہ فی سیٹ۔

شائستہ: جی ہاں' مارکیٹ میں یہی بھاؤ کھلا ہے۔ پچیس ہزار روپیہ فی سیٹ---اگر آپ یہ کام مجھے دے دیتے تو پندرہ ہزار فی سیٹ میں

دے دیتی آپ کو۔
A.D: اچھا یہ بات ہے تو۔
(یہ کہہ کر گھنٹی بجاتے ہیں)

☆☆

ریسیپشن پر انوشہ اسی طرح فون پر بات کرنے میں مصروف ہے۔ مظلوم پاکستانی آتا ہے، آفس کے اندر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے انوشہ سے مخاطب ہوکر جو اپنے موبائل پر دوسری طرف سے بات سن رہی ہے۔ موبائل کے دوسرے اینڈ پر اس کا بوائے فرینڈ۔

(فرینڈ کی آواز فون پر) انوشہ! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

پاکستانی: میڈم! سنیے۔

انوشہ جو اپنے بوائے فرینڈ سے بات کر رہی ہے لیکن دیکھ مظلوم صاحب کو رہی ہے۔

"مجھے کچھ نہیں سننا۔"

مظلوم پاکستانی بہت حیرت سے انوشہ کو دیکھتا ہے جو دیکھ تو ان کو رہی ہے لیکن کان اور توجہ موبائل پر اپنے بوائے فرینڈ کی بات پر لگے ہوئے ہیں۔

(فرینڈ کی آواز فون پر) اچھا' انوشہ! غصہ تھوک دو اور یہ بتاؤ کہ شام کو کہاں مل رہی ہو؟

پاکستانی: دیکھیں' مجھے دینو صاحب سے ملنا ہے' وہ کہاں ملیں گے؟

انوشہ بہت غصے سے اپنے فرینڈ کو جواب دیتے ہوئے لیکن مظلوم صاحب کو دیکھتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے آفس کے اندر کی طرف جانے کا کہتے ہوئے۔

"جہنم میں---"

(فرینڈ کی آواز فون پر): پلیز' انوشہ! بتاؤ نا شام کو کہاں مل رہی ہو؟

پاکستانی: جی---؟

انوشہ جواب فرینڈ کو دے رہی ہے لیکن ہاتھ کے اشارے سے شریف پاکستانی کو اندر جانے کا کہتے ہوئے۔

"کہہ تو دیا کہ جہنم میں---تمہاری سمجھ میں بات نہیں آتی؟"

پاکستانی بہت حیران اور شرمندہ سے ہوکر ہاتھ ہلاتے ہوئے۔

"یہ تو اتنی سی بات پر ناراض ہوگئیں؟ واہ بھئی' واہ۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہاں اس کو دینو نظر آتا ہے' اسے دیکھ کر زور سے آواز دیتا ہے۔

پاکستانی: دینو صاحب---!

آفس کے سب لوگ چونک کر دینو کی طرف دیکھتے ہیں۔ دینو تھوڑا سا شرمندہ ہوکر مسکرا کر اپنے لوگوں خاص کر ادریس اور کاوش بھائی کو دیکھ کر۔

کاوش: ادریس بھائی! سنا کچھ تم نے؟

ادریس: بھائی! ہم سے تو اچھا یہ چپراسی ہے جو صاحب کا منہ چڑھا ہے۔

دینو: (آگے جا کر پاکستانی کے کان میں) شریف بھائی! تم تو بالکل ہی---چ---ہو۔"

لطیفے

معصومیت

الیکشن ہونے والے تھے۔ اُمیدوار گھر گھر جا کر ووٹ مانگ رہے تھے۔ ایک اُمیدوار نے ایک دروازے پر دستک دی تو ایک چھوٹی سی بچی نے دروازہ کھولا۔

اُمیدوار: "ہیلو' بیٹا! تمہارے ابو پیپلز پارٹی میں ہیں یا مسلم لیگ میں؟"

بچی: (معصومیت سے) "جی' وہ باتھ روم میں ہیں۔"

صلاحیت

(ایک فرم کا مالک اُمیدوار سے) آپ نے یقیناً اِس آسامی کے لیے ساری شرائط پڑھ لی ہوں گی۔ ہمیں ایک ایسے افسر کی ضرورت ہے جو انتہائی تحمل مزاج اور زبردست برداشت کی قوت کا مالک ہو۔

امیدوار: اِس آسامی کے لیے آپ کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں مل سکتا۔

فرم کا مالک: ثبوت دو؟

امیدوار: پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ میری دس بیویاں ہیں' دوسرا یہ ثبوت ہے کہ دونوں کی مائیں ہفتے میں دو بار میرے گھر آتی ہیں۔ تیسرا ثبوت یہ ہے کہ میرے دس بچے ہیں' چوتھا ثبوت یہ ہے کہ میرا پڑوسی گزشتہ پانچ سال سے پکا راگ سیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور آخری ثبوت یہ ہے کہ میں سات سال سے ایک دیوانی مقدمہ لڑ رہا ہوں۔

فرم کا مالک: بس' بس آج سے اپنے آپ کو ملازم سمجھیں۔

محنت

ایک آدمی اپنے بچے کو سکول میں داخل کرانے گیا تو اُستاد نے پوچھا۔

"کیا اِسے پڑھنے کا شوق ہے؟"

اِس شخص نے جواب دیا۔ "جی' ماسٹر صاحب! اِسے پڑھنے کا اِتنا شوق ہے کہ دو جماعت میں کم از کم تین سال لگاتا ہے۔"

زہر

چرچل کے بہت سے دُشمن تھے۔ ایک مرتبہ ایک میٹنگ کے دوران ایک عورت نے اِن سے کہا۔

"اگر آپ میرے شوہر ہوتے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے آپ کو زہر دیتی۔"

اِس پر چرچل مسکرایا اور کہا۔ "نہیں' محترمہ! اگر آپ میری بیوی ہوتیں تو میں خود زہر کھا کر مر جاتا۔"

پرانا مریض

ڈاکٹر ملازم سے: دیکھو دروازے پر کون آیا ہے؟

ملازم: کوئی مریض ہوگا۔

ڈاکٹر: معلوم کرو نیا ہے یا پرانا؟

ملازم: نیا ہوگا' پرانا تو کبھی واپس نہیں آیا۔

شاہد رؤف' کلور کوٹ

پاکستانی: (بہت غصے سے) کیا مطلب ہے تمہارا "چ" سے؟
دینو: "چ" سے مطلب چغد۔ شریف بھائی! یہاں آفس میں پولیٹکس بہت ہے، بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔
پاکستانی: اچھا اچھا اب یہ بتاؤ کہ افتخار صاحب کہاں ہیں؟
دینو: (افتخار صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہ بیٹھے ہیں، تم ایک منٹ یہاں ٹھہرو، میں صاحب سے بات کر کے آتا ہوں۔
پاکستانی ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ دینو چلتا ہوا افتخار صاحب کے پاس آتا ہے۔
دینو: صاحب! ایک پارٹی گھیر کر لایا ہوں، کتنا کمیشن ملے گا؟"
افتخار: پارٹی کیسی ہے؟
دینو: صاحب! نوکری کے لئے کمیشن طے کر لیں تو ڈائریکٹ کر دوں گا۔
افتخار: اچھا ایک ہزار روپے دوں گا، اگر کام ہو گیا تو۔
دینو: صاحب دو ہزار کر دیں۔
افتخار: بس ہزار کافی ہیں تو نے ادھر سے بھی لیا ہو گا کچھ؟
دینو: نہیں، صاحب! ادھر سے کچھ نہیں ملا، اچھا پانچ ہزار اور بڑھا دیں۔
افتخار: چل ٹھیک ہے، ملاؤ پارٹی سے۔
اسی وقت پر A.D صاحب کے کمرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ دینو بُرا سا منہ بنا کر اس گھنٹی کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔
دینو: بج گئی گھنٹی صاحب کی۔ خیر میں پارٹی کو آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔

☆☆

پاکستانی افتخار صاحب کے سامنے بیٹھا ہے۔
افتخار: دس ہزار روپے ایڈوانس اور پندرہ ہزار کام ہونے کے بعد۔
پاکستانی: افتخار صاحب! یہ زیادہ نہیں ہیں۔
افتخار: آپ کو زیادہ لگ رہے ہیں تو ایک پیسہ بھی نہ دیں اور اپلائی کر دیں اور جواب کا انتظار کریں۔
پاکستانی: نہیں، نہیں۔ میں دس ہزار کل لا کر دے دوں گا۔

☆☆

دوسرے دن مظلوم، پاکستانی، شائستہ کی میز پر بیٹھا ہے اور بہت حیران اور پریشان ہیں۔ شائستہ مسکرا رہی ہے۔
پاکستانی: (ناقابل یقین اور بہت غمزدہ سے انداز سے) لیکن، میڈم! میں تو پچیس ہزار میں بات کر چکا ہوں۔
شائستہ: بھئی، وہ بات پرانی ہو گئی۔ اب ریٹ بڑھ چکا ہے۔ یہاں لوگ لائن لگا کر چالیس ہزار دینے کو تیار ہیں لیکن آپ شریف آدمی نظر آتے ہیں اس لئے آپ سے پینتیس ہزار لے لوں گی۔ پندرہ ہزار ایڈوانس اور بیس کام ہونے کے بعد۔
پاکستانی: لیکن میں تو دس ہزار ایڈوانس دے چکا ہوں۔
دینو: وہ تو افتخار صاحب کو دیا تھا۔
شائستہ: (بہت خوش ہو کر) لیکن اب بھرتیوں والی سیٹ ان کے پاس رہی نہیں، وہ تو میرے پاس آ گئی۔
پاکستانی: لیکن میرے ایڈوانس کا کیا ہو گا؟
شائستہ: اس کے لئے آپ دینو سے بات کریں اور ذرا سائیڈ میں جا کر بات کریں، مجھے کچھ اور بھی کام کرنا ہیں۔
یہ کہہ کر فائلیں اٹھا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔ دینو مظلوم پاکستانی کا ہاتھ پکڑ کر ایک کونے میں لیجاتا ہے، مظلوم صاحب حیران و پریشان ہیں۔
دینو: (سرگوشی کرنے والے انداز میں) شریف صاحب! رشوت کا پیسہ واپس تو نہیں ملتا لیکن آپ شریف آدمی ہیں اس لئے میں صاحب کی خوشامد کر کے آپ کے پیسے آپ کو واپس دلوا دوں گا۔
مظلوم: (بہت خوش ہو کر) بہت بہت مہربانی ہو گی تمہاری دینو بھیا! تم میرے پیسے واپس دلوا دو۔
دینو: شریف صاحب! خالی خولی مہربانی سے کام نہیں چلتا، اس کام کے بھی پیسے ہوتے ہیں۔
شریف پاکستانی: (مردہ سی آواز میں) کتنے؟
دینو: ویسے تو اس قسم کی سیٹنگ میں آدھا آدھا ہوتا ہے لیکن آپ کے لئے خاص رعایت کر دوں گا۔ روپے میں صرف پچیس پیسے لوں گا اور پچھتر پیسے آپ۔
پاکستانی: (ٹھنڈی سانس بھر کر) چلو، دینو بھائی! بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی بھلی---میرے پیسے دلوا دو۔
دینو: تو نکالیے---!
یہ کہہ کر ہاتھ آگے بڑھاتا ہے۔
پاکستانی: وہ کس بات کے؟
دینو: آپ کے پیسے واپس دلانے کے۔ دیکھیں شریف صاحب دس ہزار کے ڈھائی ہزار بنتے ہیں۔ ایک ہزار ایڈوانس اور پندرہ سو کام ہونے کے بعد۔
پاکستانی: (چہرے پر انتہائی حیرت کے تاثرات ہاتھ ہلاتے ہوئے) واہ بھئی، واہ---!

☆☆

اس طرح تو ہوتا ہے

☆ عبدالقیوم اسد

مرزا عبدالغفار جب کام پر جانے کے لئے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے تو محلے بھر میں یا جب روڈ پر نکلتے تو پورے رحیم یار خان کی سڑکوں پر جیسے بھونچال سا آ جاتا۔ بچے اپنے اپنے گھروں میں اور بڑے اپنے آپ میں دبک جاتے...... جب وہ گلشن اقبال سے اپنی موٹر سائیکل پر سفر کا آغاز کرتے تو ان کی موٹر سائیکل کی ''پھٹ پھٹاک'' سن کر بڑے بڑوں کی سٹی گم ہو جاتی جو ان کے گزر جانے کے بعد ہی ملتی۔ جیسے ہی ان کی یا ماہا قسم کی سوزوکی موٹر سائیکل جس کی ٹینکی پر انہوں نے پینٹر سے ''ہیرو'' لکھوا رکھا تھا' خان پور روڈ پر چڑھتی، اقبال نگار سے لے کر شی پل تک کی سڑکوں پر اچھی بھلی ہلچل مچ جاتی اور راستہ یوں صاف ہو جاتا جیسے چھلکا اترنے کے بعد کیلا...... یہ ان کی خاندانی موٹر سائیکل تھی جو ان کے دادا حضور نے کسی میراثی کو ایک بوری چاول دے کر خریدی تھی۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے دادا کو اس موٹر سائیکل سے اتنی محبت تھی کہ مرتے دم تک انہوں نے موٹر سائیکل کو خود سے جدا نہیں کیا۔ یعنی جب وہ موٹر سائیکل سے گر کر جاں بحق ہوئے تب بھی ان کا ایک ہاتھ موٹر سائیکل کے ہینڈل پر ہی تھا جو کہ بعد میں کچھ لوگوں نے جدوجہد کر کے علیحدہ کیا...... دوسرا واقعہ ان کے باپ کے زمانے میں پیش آیا جب ایک رات چور ان کے گیراج میں داخل ہوا اور اس نے موٹر سائیکل چوری کی۔ پھر وہ جب اپنی قسمت سے بے خبر ہو کر جیسے ہی سٹارٹ کرنے لگا' پورا محلہ لرز اُٹھا۔ جس کی وجہ سے چور بوکھلا کر واپس بھاگ گیا۔ موٹر سائیکل کو بعد میں محلے کے چوکیدار نے ان کے حوالے کیا۔ پس اس واقعے سے ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ کوئی مائی کا لال یہ موٹر سائیکل چوری نہیں کر سکتا۔

اس موٹر سائیکل کو بڑے بڑے طرم خان خرید کر واپس کر چکے تھے تا کہ وہ رات کو سکون سے سو سکیں۔ اکثر اوقات جب لوڈ شیڈنگ ہوتی تو مرزا صاحب موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹس جلا کر اپنے گھر کے کام انجام دیتے البتہ جب وہ ہیڈ لائٹس جلا کر باتھ روم جاتے تو بچوں پر اس طرف آنے پر پابندی لگ جاتی تھی۔ اگر پھر بھی ان کا کوئی بچہ اس طرف آ تا تو باتھ روم میں بیٹھے مرزا صاحب کی حالت دیکھ کر خود ہی بھاگ جاتا۔ کئی بار اس موٹر سائیکل کی بولی لگ چکی تھی۔ ایک کباڑیئے نے تو ستر روپے فی کلو کی پیشکش بھی کر دی جسے مرزا صاحب نے سختی سے مسترد کر دیا۔ بقول ان کے، میں اپنے باپ دادا کی نشانی کو خود سے الگ نہیں کر سکتا...... اس کے بعد پھر مرزا صاحب تھے یا ان کی موٹر سائیکل۔

آج یہ لاکھوں شہریوں کے دلوں کی دھڑکن' موٹر سائیکل نے اس وقت نخرے دکھانے شروع کر دیئے جب مرزا صاحب اپنی شادی کے پانچویں روز اپنی نئی نویلی دُلہن صائمہ بیگم کو اپنے ساتھ لئے محو سفر تھے۔ مرزا صاحب چونک گئے کیونکہ موٹر سائیکل دو تین جھٹکے کھانے کے بعد اچانک رُک گئی تھی۔ مرزا صاحب نے مجبوراً اپنی دُلہن کو نیچے اُتار کر موٹر سائیکل کو سڑک کے کنارے یوں بٹھا دیا جیسے قصائی بکرے کو ذبح کرتے وقت لٹاتے ہیں۔ پھر جب تھوڑی دیر کے بعد اسے کھڑا کر کے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو وہ ''پھس پھس'' کی عجیب سی آوازیں نکال کر خاموش ہوگئی۔ مرزا صاحب نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''بیگم! یہ تو بہت شرارتی ہے، کئی بار ایسا کر چکی ہے۔''

''ایسی لاڈلی موٹر سائیکل کو آپ بیچ کیوں نہیں دیتے جو کسی کو دیکھے بغیر سڑک کے درمیان شرارتیں شروع کر دیتی ہے؟'' صائمہ بیگم نے شدید گرمی میں دھوپ کی وجہ سے آیا ہوا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''بیگم! یہ میری غیرت کو چیلنج ہے، میں ابھی اسے اسٹارٹ کرتا ہوں۔''

مرزا صاحب نے اسے اپنی انا کا مسئلہ سمجھتے ہوئے کہا اور پھر اپنی

''جان پر کھیل'' کر اسے دوبارہ اسٹارٹ کرنے شروع کر دیا لیکن نتیجہ وہی۔

''بیگم! لگتا ہے' آج ہماری لاڈلی مذاق کے موڈ میں ہے۔''

مرزا صاحب نے دل ہی دل میں موٹر سائیکل کو ایک ناقابل اشاعت گالی دے کر دانت نکالتے ہوئے اپنی بیوی صائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ صائمہ کچھ کہتی، ایک طرف سے مجنوں صورت نوجوان ہاتھ میں لیمن سوڈے کے دو گلاس پکڑے ان کے پاس آ گیا۔

''لیجئے' جناب......!''

نوجوان نے پہلا گلاس مرزا صاحب کو زبردستی تھما کر دوسرا گلاس صائمہ کی طرف کرتے ہوئے بڑے پیار بھرے انداز سے کہا۔

''یہ کیا ہے؟'' مرزا صاحب نے اس نوجوان سے پوچھا جو ابھی تک صائمہ کو ہی دیکھے جا رہا تھا۔

''لیمن سوڈا......!''

اس نے مڑ کر مرزا صاحب کو بتایا اور دوبارہ صائمہ کی طرف دیکھنے لگا جبکہ اسی اثنا میں ایک قلفیوں والا بھی اپنی ریڑھی کو دھکیلتا ہوا وہاں آ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ صاف کیا اور جلدی سے دو قلفیاں نکال کر مرزا صاحب اور صائمہ کی طرف بڑھا دیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' مرزا صاحب غصے سے چیخے۔

''سرکار! اِن سے گرمی کم ہوتی ہے۔''

قلفیوں والے نے فخر سے کہا اور پھر اس نے مزید ایک قلفی نکالی اور خود بھی کھانے لگا۔ ''جناب! کیا ہم آپ کی موٹر سائیکل کو دھکا لگائیں؟''

قلفیوں والے نے مرزا صاحب سے کہا تو لیمن سوڈے والے کو بھی جوش آ گیا۔

'''ارے' اس کام کے لئے تو میں اکیلا کافی ہوں...... کیوں' صاحب؟'' اس نے مرزا صاحب نے جیسے تصدیق کرنے کے لئے کہا۔

'''بھائی! میں کیا کہوں' تم دونوں اپنی بہن سے پوچھ لو' جیسے وہ کہہ دے۔'' مرزا صاحب نے گویا اُن کی نظر بازی کو سمجھتے ہوئے کہا۔

''اچھا' جناب! میں چلتا ہوں میرے گاہک آ گئے ہیں۔'' لیمن سوڈے والے نے جلدی سے کہا اور پیسے لئے بغیر ہی چلتا بنا۔

''اچھا' جناب......!'' قلفیوں والا اپنی ریڑھی دھکیلتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بھی ابھی کئی جگہوں پر جانا ہے۔''

اور وہ بھی آگے بڑھ گیا۔ ان دونوں سے فارغ ہو کر مرزا صاحب کی توجہ ابھی موٹر سائیکل کی طرف ہونے بھی نہ پائی تھی کہ غباروں والا ایک خان نازل ہو گیا ''پاں، پاں، پاں'' اس نے فل زور لگا کر باجا بجایا۔

'''کیوں' صاحب! آپ غبارے نہیں لیں گے؟''

اُس نے مرزا صاحب سے پوچھا لیکن اُس کی نظریں بھی صائمہ کی طرف تھیں۔

''ہم تمہیں بچے نظر آتے ہیں؟'' مرزا صاحب گرمی سے تپ کر بولے۔

''آدمی چاہے جتنا بھی بڑا ہو جائے' ماں باپ کی نظروں میں بچہ ہی ہوتا ہے۔'' خان صاحب نے فلسفہ جھاڑنے کی مکمل کوشش کی۔

''میں تمہاری زبان کاٹ کر رکھ دوں گا' سمجھے؟'' مرزا صاحب نے بے بسی اور غصے سے ملے جلے لہجے میں کہا۔

''مم......مم......میرا مطلب تھا کہ آپ اپنے بچوں کے لئے غبارے خرید لیں۔''

خان صاحب نے بوکھلا کر کہا۔ یہ لڑائی تماشا دیکھ کر راہ جاتے ہوئے تین چار لفنگے بھی ان کے قریب آ گئے۔

''بھائی جی! کیا کہتا ہے آپ کو خان کا پٹھا؟ ذرا مجھے اجازت تو دیجیو' پھر دیکھنا یہ کیسے سیدھا ہوتا ہے۔''

ایک بھیا ٹائپ نوجوان خود کو ''جیکی چن'' سمجھ کر پان چباتے ہوئے مرزا صاحب سے مخاطب ہوا تو مرزا صاحب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی خان رفو چکر ہو چکا تھا۔

''بھیا! کیا مسئلہ ہوا ہے آپ کے ساتھ، شاید پٹرول ختم ہو گیا ہے؟''

بھیا ٹائپ نوجوان نے صائمہ کی طرف سے پیار سے دیکھتے ہوئے مرزا صاحب سے پوچھا جبکہ دوسرے نوجوان بھی نظر بازی کرنے میں مصروف تھے جس کی وجہ سے صائمہ بھی خاصی کنفیوز ہو گئی تھی اور خود مرزا صاحب کی حالت بھی پتلی تھی۔ وہ دِل ہی دل میں پہلے موٹر سائیکل کو' پھر موٹر سائیکل بنانے والوں کو اور آخر میں خود کو کوس رہے تھے کہ اس سے تو اچھا تھا کہ رکشے میں ہی سفر کر لیتے۔ گلشن اقبال سے کون سا گلشن عثمان زیادہ دور تھا۔ اسی وقت ایک مولانا جو کوئی امام مسجد تھے' وہ بھی ان کے پاس رک گئے جن کو دیکھ کر مرزا صاحب کو قدرے حوصلہ ہوا۔

''بیٹا! کیا بات ہے' کیوں پریشان ہو؟''

انہوں نے پوچھا تو مرزا صاحب نے اُن کو ساری بات بتا کر موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کر دیا۔ مولوی صاحب نے قریب جا کر موٹر

سائیکل پر ہاتھ پھیرا اور خوب ٹھونک بجا کر دیکھنے کے بعد اس کے پچھلے پہیے کے قریب بیٹھ گئے۔

''یہ آپ کیا کرنے لگے ہیں؟'' مرزا صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''بیٹا! میں اس کو دَم کر کے دیکھتا ہوں' شاید یہ ایسے چل پڑے۔'' مولوی صاحب نے کہا تو لڑکوں کے منہ سے بے اختیار قہقہے نکل گئے۔

''لو اگر ایسے موٹر سائیکل چلنے لگ گئی تو پھر ہو گئی ٹریفک کنٹرول۔'' ایک لڑکے نے کہا تو ایک بار پھر سب ہنس پڑے۔

''مولوی صاحب! آپ کو تو کسی پٹرول پمپ پر ہونا چاہیے تھا یا کہیں روڈ پر دوکان کھول کر باہر لکھوا لیں کہ ''موٹر سائیکل پر دَم کروا کر چلائیں' ایک دَم سے چلے اَسی کلومیٹر فی گھنٹہ!''

دوسرے منچلے نے کہا تو مولوی صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور کپڑے جھاڑ کر بغیر دُعا سلام کئے مسجد کی طرف چلتے بنے۔ مرزا صاحب کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ یہ حادثہ زندگی میں پہلی بار پیش آیا تھا اور وہ بھی فوراً شادی کے بعد' جس کی وجہ سے اب انہیں ازدواجی زندگی بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کچھ سوچنے کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب موٹر سائیکل کو کسی گدھا ریڑھی پر رکھ کر ہی گھر لے جائیں اور خود کسی رکشے میں بیٹھ کر گھر چلے جائیں۔ یہ سوچ کر ابھی وہ موٹر سائیکل کی طرف بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ ایک آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو ان سے کچھ فاصلے پر ایک چلتا پھرتا عجوبہ نما آدمی کھڑا تھا جس کے منہ میں سگریٹ کی دبی ہوئی تھی اور کپڑے بھی پھٹے پرانے تھے۔ وہ اپنی بے نور سی آنکھوں سے مرزا صاحب کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھا۔

''جناب! میں موٹر سائیکل کا مکینک ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو ٹھیک کر دوں؟''

اس چرسی ٹائپ نوجوان نے مرزا صاحب سے پوچھا تو مرزا صاحب نے کچھ دیر اس کو دیکھنے کے بعد سر ہلا دیا۔ وہ نوجوان موٹر سائیکل کے قریب آ گیا۔

''ویسے' جناب! آپ کے خیال میں یہ کیوں خراب ہوئی ہے؟'' نوجوان نے سگریٹ کا لمبا کش بھرتے ہوئے پوچھا۔

''اس لئے کہ یہ پہلے ہی خراب تھی اور اب مزید خراب ہو گئی ہے..... ویسے میرے خیال میں اس کا پلگ شارٹ ہو گیا ہے۔'' مرزا صاحب نے جواب دیا۔

''شارٹ......'' چرسی کے منہ سے نکلا اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی بے نور آنکھوں میں خوف سا اُمڈ آیا تھا۔ ''نہ' جناب! نہ' میں خطرناک کام کر کے بھری جوانی میں نہیں مرنا چاہتا۔''

اُس نے ''بھری جوانی'' کا لفظ صائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر مرزا صاحب کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس نے صرف موٹر سائیکلوں والی دوکان پر صرف دو دن ہی کام کیا تھا اور مالکوں کو جواب دے دیا تھا کیونکہ وہ دو دِن سے اس سے صرف موٹر سائیکل کے وہیل ہی دھلواتے رہے تھے لیکن آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میں اسے دیکھتا ہوں۔ چرسی نے کہا اور نئے سرے سے موٹر سائیکل کو چھیڑنا شروع کر دیا اس نے پہلے پچھلا وہیل گھمایا، ہینڈل کو اِدھر اُدھر کیا

Milk اینڈ بٹر

✿ جسے بازار میں کوئی نہ دیکھے وہ اِس بات کا غصہ گھر آ کر شوہر پر اُتارتی ہیں---مدثر علی خان

☆ تو آپ اپنی بیوی کو بازار جانے سے منع کر دیا کریں' نا!

✿ مور ایک خوبصورت پرندہ ہے مگر مورنی عام سی بڑی مرغی---- پھر بھی مور' مورنی کا ہی دَم بھرتا ہے---سیدزاہد حیدر

☆ کوئی بات نہیں پیارے' ہم آپ کے لئے ''کوئل'' لے آئیں گے۔

✿ پہلے سستے زمانے میں اِنسان چار شادیاں نبھا سکتا تھا مگر اَب چار بچے ہی پالنا مشکل ہے---نایاب رضوی

☆ آخر آپ ایسے مرد سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہیں جو پہلے ہی تین شادیاں کر چکا ہے۔

✿ وائس چینجر سے لڑکے بھی لڑکی بن کر کارڈز اور بیلنس مانگ رہے ہوتے ہیں۔ کیا کمال کے کرتوت ہیں---نایاب چودھری

☆ ہمیں افسوس ہے' پھر آپ کا کیا ہوتا ہوگا؟

✿ اندھا' بہرہ اور گونگا شوہر بھی شک سے لبریز ہوگا---یمنٰی احمد

☆ کس نے کہا تھا ایسا شوہر منتخب کرنے کو؟

✿ عمر ستر سال اور خواہش کہ بیوی ہو سترہ سال کی---یمنٰی احمد

☆ والد صاحب سے کہہ کر رشتہ کینسل کر دو' نا!

✿ مشرقی عورت صابر اور مشرقی مرد جابر ہوتا ہے---3N

☆ عورت اور صابر---؟ غلط فہمی ہوئی ہوگی آپ کو' وہ تیسری جنس ہوگی۔

✿ ''مجھے چاہے دس جوتے مارو مگر خدارا' اپنا سم نمبر دے دو''--- ایک لڑکے کی التجا---مس ملکہ

☆ پھر آپ نے کیا کیا؟

✿ محبوبہ پر ہزاروں روپے لٹانے والا' بیوی کو جوتا تک نہیں خرید کر دے سکتا---نایاب چودھری

☆ چلو جوتا ہم آپ کو خرید کر دے دیں گے' اَب خوش؟

✿ محبوبہ سے ناراض ہو کر غصہ بیوی پر نکالنا' مرد کی فطرت میں شامل ہے---حمیرہ عیسٰی

☆ آپ کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے۔

مسٹر ایلفا اینڈ اومیگا' حضرو

سگریٹ سلگائی، کش لگایا' پھر ہینڈل سمیت پچھلا وہیل گھمایا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں' جناب! یہ میرے بس سے باہر ہے لیکن آپ مجھے بتایئے تو سہی پلگ کسے کہتے ہیں اور کہاں پایا جاتا ہے؟'' وہ مرزا صاحب سے مخاطب ہوا۔

لفنگے لڑکے جا چکے تھے اور صائمہ بھی نزدیک کے درخت کے نیچے بیٹھی یہ تماشا دیکھ کر اپنی قسمت پر غور کر رہی تھی۔ پھر مرزا صاحب نے بہتے ہوئے پسینے کے ساتھ جب پلگ کی افادیت پر لیکچر دیا تو جیسے چرسی کی سمجھ میں آ گیا۔

''بس، جناب! میں سمجھ گیا کہ پلگ وہ چیز ہے۔ وہ جو کسی چیز کو چلنے کا حوصلہ دیتی ہے۔'' وہ بولا۔

''بالکل، بالکل......'' مرزا صاحب خوش ہو کر بولے۔

''تو پھر اسے آپ اپنی خوش قسمتی سمجھئے کہ میری جیب میں ایک فالتو پلگ بھی پڑا ہے جو میں نے کسی ایسے ہی وقت کے لئے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔''

چرسی نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا اور پھر تھوڑی جدوجہد کے بعد جیب سے ایک سگریٹ نکال کر خود سلگائی اور دوسری مرزا صاحب کے ہاتھ میں تھما دی جو شاید پلگ نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''میں اس کا کیا کروں؟'' مرزا صاحب حیرت سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سگریٹ دیکھ کر بولے۔

دیکھیں، جناب! آپ نے کہا کہ پلگ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز چلتی ہے سمجھیں یہ بھی ایک پلگ ہے۔ میں جب میں صبح گھر سے چلنے لگتا ہوں تو چلنے کو دل نہیں کرتا بلکہ چکر آنے لگتے ہیں لیکن جیسے ہی میں اس پلگ کے دو تین کش لیتا ہوں تو یقین کریں، مجھ میں ایک دم ہی اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ میرا دل کرتا ہے کہ دوڑنے لگوں اور ساری زندگی دوڑتا ہی رہوں...... اگر آپ کو یقین نہیں تو یہ دیکھیں۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک لمبا کش بھر لیا اور دھواں مرزا صاحب کے منہ پر چھوڑ کر ایک طرف بھاگنا شروع کر دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مرزا صاحب نے اُسے ایک زوردار مردانہ قسم کی گالی دے کر سگریٹ نیچے پھینکا اور ایک گدھا ریڑھی والے کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا جو قریبی سی، این، جی پمپ پر کوئی سامان چھوڑ کو واپس آ رہا تھا۔ ریڑھی والا قریب آ کر رک گیا۔

''جی' جناب! حکم......؟'' اُس بوڑھے ریڑھی والے نے صائمہ کو دیکھ کر فدویانہ لہجے میں مرزا صاحب سے پوچھا تو انہوں نے موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا۔

''اِسے اُٹھا کر ریڑھی پر رکھو اور......''

''نہیں' جناب! میں اس مشین کا کیا کروں گا؟ خدا اسے آپ کے نصیب میں کرے۔'' ریڑھی والا مرزا صاحب کی بات کاٹ کر بولا۔

''ابے' اِسے میں نے گھر لے کر جانا ہے' گلشن اقبال۔'' مرزا صاحب غصے سے بولے۔

''اچھا، اچھا تو یوں کہئے نا، میں سمجھا کہ آپ مجھے یہ بخش رہے ہیں......'' اس نے کہا اور پھر ایک بار چاروں طرف سے گھوم کر موٹر سائیکل کا مکمل جائزہ لیا اور بولا۔ ''میں اس کو لے کر جانے کا رسک لینے کو تیار ہوں لیکن اگر یہ آپ کے گھر تک پہنچتے تک ادھوری رہ گئی تو مجھے مت کہئے گا۔''

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے......''

مرزا صاحب نے کہا اور پھر اسے اپنا ایڈریس سمجھا کر موٹر سائیکل اس کے حوالے کر دی اور پھر اسے روانہ کرنے کے بعد مرزا صاحب نے ایک رکشے کو رکوایا اور اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ دوسرے روز مرزا صاحب رکشہ پر ہی سسرال سدھارے۔ آج کل مرزا صاحب نئی موٹر سائیکل خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ پرانی ''ہیرو'' انہوں نے اپنی ڈرائنگ روم میں کھڑی کر رکھی ہے اور ساتھ ایک بورڈ لٹکا رکھا ہے جس پر جلی حروف میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

''یہ واقعی ہیرو تھا لیکن جیسے ہی ایک عورت نے اس تشریف رکھی، تب سے زیرو ہے۔''

اگر کسی کو یہ موٹر سائیکل دیکھنے کا تجسس ہو تو آیئے مرزا صاحب کے ڈرائنگ روم میں اور اسے جی بھر کر دیکھ لیں۔ چلیں اسی بہانے پاکستان کے پیارے شہر رحیم یار خان کی سیر بھی ہو جائے گی۔

☆☆

سلامِ عشق۔ عاشر نثار احمد' دادو

آج 14 فروری ہے یعنی ویلن ٹائن ڈے، محبت کا عالمی دن۔ یہ دن کیوں منایا جاتا ہے اور کب سے، یہ تو ایک لمبی کہانی ہے کہتے ہیں کہ سینٹ ویلن ٹائن نامی شخص کے نام سے یہ دن منایا جاتا ہے۔ محبت کا عالمی دن سال میں ایک مرتبہ آتا ہے اس دن کے لئے عاشق 364 دن تک انتظار کرتے ہیں اتنا انتظار تو عید کے لئے بھی نہیں کرتے۔

محبت کسی سے بھی ہو سکتی ہے ماں، باپ، بھائی، بہن، کسی بھی پیارے رشتے سے یا محبت دو دوستوں کے درمیان بھی ہوتی ہے مگر 14 فروری کا دن عاشقوں کے لئے ہوتا ہے اس لئے اسے

"Lovers Day" بھی کہتے ہیں۔ عاشق اس دن کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں ایسے جیسے اپوزیشن والے الیکشن کا انتظار کرتے ہیں۔ 13 فروری کی شام سے ہی تیاریاں عروج پر ہوتی ہیں۔ محبوب اپنی محبوبہ کو آنے والے سنہرے دنوں کے خواب دکھانے کی کوشش کرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ محبوبہ کو اس خواب سے دلچسپی کم اور اُس دن کی ٹریٹ اور گفٹ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ عاشق حضرات موبائل اور نیٹ پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے ہماری پولیس احتجاج کرنے والوں پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ موبائل فون کمپنیاں، پھول، چاکلیٹ، ٹی وی چینلز اور کارڈز والے اس دن خوب کماتے ہیں۔

پیار، عشق اور محبت نام تو الگ ہیں مگر بات ایک ہی ہے۔ پیارے لوگ پیار کرتے ہیں، سچے لوگ عشق کرتے ہیں اور باقی جو رہتے ہیں وہ محبت کرتے ہیں۔ محبت کرنے کے لئے سب سے پہلے یا سب سے ضروری چیز ہے کہ آپ کو کسی سے محبت ہو جائے۔ اگر آپ کو کسی سے محبت نہ ہو تو آپ محبت کر ہی نہیں سکتے۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ میں نیوٹن کا باپ تو نہیں اور نہ ہی وہ میرے رشتہ دار تھے مگر میں اُن سے متاثر ہوں۔ میرے دماغ میں ایک فارمولا ہے کہ اگر محبت ہو جاتی ہے اور کی نہیں جاتی تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ میں نے فلاں سے محبت کی ہے یا محبت کی تھی؟ ظاہری بات ہے کہ محبت کی تو نہیں جاتی، ہو جاتی ہے...... اگر آپ لوگ میری طرح ''جینیس'' ہیں تو میرا مشورہ ہے کہ محبت ضرور کریں۔ میرے خیال میں یہ پروپیگنڈہ ہے کہ محبت ہو جاتی ہے۔ یہ آپ کے دشمنوں کی چال ہے، افواہ ہے۔ محبت کیا نزلہ، زکام، یا بخار ہے کہ خود بخود ہو جائے؟ اگر آپ لوگ سمجھدار ہیں، پڑھے لکھے ہیں تو ان باتوں میں ہرگز مت آئیں اور کھل کر محبت کریں۔ محبت ہونے کے انتظار میں آپ بوڑھے بھی ہو سکتے ہیں سو پیار میں گرنے کے لئے خود ہی چھلانگ ماریں، اس سے پہلے کہ کوئی آپ کو دھکا دے دے...... اگر آپ کسی سے محبت کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلی بات کہ آپ کو ایک عدد لڑکی چاہیئے...... جی نہیں یہ کوئی ''کوکنگ پروگرام'' نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ''ریسیپی'' بتا رہا ہوں بلکہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ''میرا پیغام ہے محبت، جہاں تک پہنچے......'' ارے لڑکی ڈھونڈنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے، کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ گھر میں کزنز کی جو فوج موجود ہے۔ ایک دو کزنز بھی ہوں تو بھی کام چل سکتا ہے۔ سب سے پہلے خود میں کانفیڈنس پیدا کریں پرسنالٹی پیدا کریں اور کسی بھی اینگل سے لگے کہ آپ ایک سمارٹ لڑکے ہیں (ہونا ضروری نہیں ہے، لگنا ضروری ہے) ویلن ٹائن ڈے پر آپ

کزن کے پاس جائیں، اُس وقت جب وہ کچن میں اکیلی ہو۔ کزن کے بالکل پیچھے جا کر ''سینٹ ویلن ٹائن'' کو یاد کر کے چوری سے ہاتھ پکڑ لیں۔ اگر دل سے دل ملا تو وہ شرما کے ہنسے گی اور ڈرامہ سیریل ''محبت'' کی پہلی قسط ہٹ رہے گی اب آپ کو 13 اقساط تک اس ڈرامے کی کامیابی کو برقرار رکھنا ہے۔ اگر خدانخواستہ کزن شور مچائے اور چیخنے چلانے لگے تو دل پر پتھر رکھ کر آپ نے زور سے چلانا ہے کہ ''باجی ڈر گئی...... باجی ڈر گئی......''

کہتے ہیں کہ بخار بہت خراب ہے اور اگر بخار عشق کا ہو تو پھر تو بہت خراب ہے۔ اس بخار میں مبتلا مریض کو شروع میں تو کوئی پریشانی نہیں ہوتی البتہ رفتہ رفتہ ان کی جیب ہلکی ہوتی رہتی ہے اور بلآخر وہ خود ہی ہلکا ہو جاتا ہے...... کسی بھی بخار سے ڈاکٹرز کو ہی فائدہ ہوتا ہے مگر عشق کے بخار میں معشوقہ اور موبائل فون کمپنی کو ہی زیادہ فائدہ ہے...... دوستی محبت کی پہلی سیڑھی ہے اور اس سیڑھی پر چلنے والے چڑھتے چڑھتے ایسے گرتے ہیں کہ پھر آہستہ آہستہ ان کے بال بھی گرنے لگتے ہیں۔ نئے زمانے کی بات الگ ہے، پہلے کی بات اور ہے۔ اب اگر کسی پاکستانی لڑکی کو پھول پیش کریں گے تو وہ دیکھ کر گھورے گی اور کہے گی۔

''کاش! اِس پھول کی جگہ گوبھی کا پھول ہوتا تو رات کو میں آلو

عید مبارک

اے یار دل آزار! تجھے عید مبارک
اے مردِ سیہ کار! تجھے عید مبارک
جب آتا ہے یہ رحمت و برکت کا مہینہ
بن جاتا ہے بیمار، تجھے عید مبارک
چھپ چھپ کے ہی دوپہر کو کھا لیتا ہے روٹی
اے مردِ نابکار! تجھے عید مبارک
اک دن بھی الصلوۃ تراویح نہ کی قائم
برسوں کے گناہ گار! تجھے عید مبارک
تو لرزہ بر اندام تھا جس ماہ کے ڈر سے
وہ جا چکا اس پار، تجھے عید مبارک
انعامی یہ کہہ رہا ہے بانگ دہل تجھے
دوزخ کے سزاوار! تجھے عید مبارک

انعام فیض انعامی، ابنِ آوارہ بلی ٹنگوی، کوہاٹ
موبائل: 0313-9833535

گو بھی ہی پکا لیتی۔"

کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر کسی اندھے کو محبت کیوں نہیں ہوتی؟ محبت تو ویسے بھی اندھی ہوتی ہے تو پھر اندھوں کو یہ حق کیوں نہیں؟ ہم نے آج تک کسی اندھے کو محبت میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی خوبصورت لڑکی کو اندھے کی محبت میں سرشار دیکھا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ لڑکیوں کو اپنی تعریف سننے کی بہت عادت ہے اور اندھے تو ان کی تعریف نہیں کر سکتے' نا! فرض کریں اگر کوئی لڑکی اندھے کی محبت میں گرفتار ہو کر جب اس سے اپنی خوبصورتی کی تعریف کرے گی تو اندھے عاشق کا جواب یہی ہو گا کہ اگر تم اتنی خوبصورت ہوتی تو کیا آنکھ والے تمہیں میرے لئے چھوڑتے؟

اچھے عاشق وہی ہوتے ہیں جو کہ اچھے ہوتے ہیں اور جو اچھے نہیں ہوتے وہ رقیب ہوتے ہیں۔ اچھا انسان کبھی اچھا عاشق نہیں بن سکتا اور اچھا عاشق کبھی اچھا انسان نہیں ہوتا۔ اچھے عاشق اور بُرے عاشق میں ایک ہی فرق ہے کہ دونوں عاشق ہیں...... عشق کرنے کے لئے عاشق ہونا ضروری نہیں البتہ عاشق بننے کے لئے عشق ضروری ہے۔ پیار میں لوگ جان بھی دے دیتے ہیں' ہم نے کبھی نہیں مانا لیکن کسی عاشق سے جب ہم نے کہا کہ اپنی جان دے سکتے ہو؟ تو اُس نے اپنی محبوبہ کو ہمارے حوالے کر دیا۔ اُس دن سے ہم مان رہے ہیں کہ پیار میں لوگ، یعنی عاشق اپنی "جان" بھی دے دیتے ہیں...... یہ عشق ہی ہے جس میں لوگ جان دیتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ دنیا میں پہلا قتل عشق پر ہی ہوا ہے اس لئے محبت میں ہر چیز جائز ہے بشرطیکہ کوئی "چیز" ہو۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ محبت پانے کا نہیں کھونے کا نام ہے اس لئے ہم محبت میں اکثر کھوئے رہتے ہیں۔ محبت میں نیند اُڑ جاتی ہے' یہ بات ہم نے ایک عاشق سے پوچھی تو وہ کہنے لگے۔

"جی ہاں' یہ صحیح ہے کیونکہ نیند میں خواب دیکھنے سے بہتر ہے کہ جاگ کر حقیقت کی دنیا میں رہیں کیونکہ خواب کبھی بھی ٹوٹ سکتے ہیں۔"

دُنیا میں چار لوگ جاگتے رہتے ہیں' جن کی نیند پوری نہیں ہوتی۔ ایک عاشق' دوسرا چوکیدار، تیسرا اُلو، اور چوتھا بیمار...... اب اگر محبت میں نیند اُڑ جاتی ہے تو کیا چوکیدار، اُلو اور بیمار بھی چوٹی کے عاشقوں میں شمار ہوتے ہیں؟ کوئی چوکیدار اگر کسی کی محبت میں گرفتار ہو جائے تو وہ مظلوم اور معصوم عشق کہلائے گا کیونکہ وہ اپنی محبوبہ کو یہ یقین بھی نہیں دلا سکتا کہ وہ اُس کی محبت میں جاگ رہا ہے' ویسے بھی چوکیدار عاشق کم ہی ہوتے ہیں کیونکہ چوکیدار اکثر پٹھان ہوتے ہیں...... بیمار تو محبت کر ہی نہیں سکتے اور نہ ہی کریں تو بہتر ہے بیماروں کو فری مشورہ ہے کہ عشق سے یوں دور رہیں جیسے دوائیں بچوں کی پہنچ سے۔ بیمار عشق کر ہی نہیں سکتے البتہ عشق کرنے والے بیمار ہو سکتے ہیں۔

محبت اور دِل دو لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ محبت کی شروعات ہی دل سے ہوتی ہے۔ اگر آپ کے پاس دل ہے تو بھی آپ کامیاب عاشق ہیں کیونکہ عشق کے کالج میں داخلہ لیتے ہی آپ کا دل' آپ کا نہیں رہتا اور عاشق یہی گاتے رہیں گے کہ "یہ دل آپ کا ہوا"...... آپ کہیں گھومنے جائیں، کسی سے ملنے جائیں' میوزک سنیں کچھ بھی کریں' صرف اس لئے کہ آپ کا دل چاہ رہا تھا مگر محبت میں دل نہیں' وہی ہوتا ہے جو محبوبہ چاہے اور محبوبہ کے آگے تو دل بھی بزدل ہے' فوراً ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ پہلے کی بات اور تھی کہ پہلی نظر میں دل بے قرار ہو جاتا تھا، محبت ہو جاتی تھی' دل سے دل مل جاتے تھے۔ اب دل اگر ہاتھ میں لے کر صبح سے شام بازار کا چکر لگائیں تو کام نہیں بنتا۔ اکثر نوجوانوں پر بڑا ترس آتا ہے جو محبت بھرا دل رکھتے ہیں مگر کسی حسینہ کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

کہتے ہیں پہلے زمانے میں سچی، صاف ستھری محبت ہوتی تھی۔ پاکیزہ اور دیرپا محبت۔ خطوط لکھے جاتے تھے، کبوتروں کے ذریعے بھجوائے جاتے تھے، ایک دوسرے کی جھلک دیکھنے کے لئے مہینوں انتظار کیا کرتے تھے' وغیرہ وغیرہ۔ (اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟) اب زمانہ ترقی یافتہ ہے تو اس میں آج کل کے عاشقوں کا کیا قصور ہے؟ اب اگر آج کے دور کے عاشق اُس زمانے میں ہوتے تو وہی کرتے جو فرہاد، مجنوں، رانجھا، کیا کرتے تھے اور اگر وہ عاشق صاحب آج 2007 میں ہوتے تو قسم سے اُن کے ہاتھ میں موبائل فون ہی ہوتے اور رات بھر فری پیکیج کے مزے لوٹ رہے ہوتے۔

محبت آج بھی قربانی مانگتی ہے اور آج بھی محبت کرنے والے قربانیاں دیتے ہیں پرانے عاشقوں نے عظیم قربانیاں دیں' یہ بات ہم غلط ثابت کر سکتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں کہ سوہنی کچے گھڑے یا مٹکے میں بیٹھ کر دریا پار کرنا چاہتی تھی محبت میں حالانکہ آج کل تحقیقاتی اداروں نے یہ رپورٹ دی ہے کہ مٹکا بالکل صحیح تھا اس لئے سوہنی مٹکے پر خوشی سے بیٹھ گئی پر جلد بازی میں وہ چیک کرنا بھول گئی کہ مٹکے کے اندر رات کو بلی نے 6 بچے دیئے تھے۔ فرہاد بھی سخت محنت و مشقت سے دودھ کی نہر نکالتے مر گئے تھے حالانکہ CIA کی حالیہ رپورٹ میں یہ بات واضح ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہوا تھا۔ فرہاد نہر کو عام نہر سمجھ رہا تھا مگر جب اُس نے دیکھا کہ وہ نہر ایک ہل اسٹیشن پر واقع پہاڑی میں ہے تو اُس کے پسینے چھوٹ گئے مگر وہ شیریں سے وعدہ کر چکا تھا اس لئے ڈرتے ڈرتے پہاڑ

پر چڑھنے لگا مگر راستے میں اس کا پیر پھسل گیا اور وہ مر گیا۔ یہ خبر جب شیریں تک پہنچی تو وہ پریشان ہو گئی کہ فرہاد تو دودھ نہیں لا سکا اور دودھ کے بغیر چائے کیسے بنتی؟ شیریں سب کچھ سہہ لیتی تھی مگر چائے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی سو اُس نے خودکشی کر لی۔ کم بخت کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ بازار سے ''ملک پیک'' کا ڈبہ منگوا لیتی...... خیر، یہ تو تھیں پُرانی باتیں۔ میرا ایک دوست ہے، وہ کبوتروں کا عاشق ہے۔ ایک دن میں نے اُس سے پوچھا۔

''تم کبوتروں سے عشق کیوں کرتے ہو؟''

موصوف نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ میں جس لڑکی سے عشق کرتا تھا، وہ کسی اور کے ساتھ اُڑ گئی اور لوٹ کر نہیں آئی مگر کبوتر اُڑ کر جاتے ہیں تو واپس آ جاتے ہیں۔''

کسی کا کہنا ہے کہ زندگی کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دُنیا میں بے شمار خوبصورت عورتیں موجود ہیں مگر آپ کے پاس گنتی کے چند لمحے ہی ہیں...... میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ حسینائیں عام طور پر تین قسموں میں پائی جاتی ہیں ایک کو جوانی میں ''حسینہ'' کہتے ہیں، پھر جب وہ تیس سے اوپر ہوتی ہے تو ''حسی نا'' بن جاتی ہے اور تیسری شکل وہ ہوتی ہے جس میں اُسے دیکھنے والا بے اختیار ''ہنسی نا'' کہہ اُٹھتا ہے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کہتے ہیں کہ جتنے بھی بڑے عاشق گزرے ہیں، اُن کی محبوبہ سے شادی نہ ہو سکی اور ویسے بھی ظاہر ہے، شادی ہو جاتی تو وہ عاشق کی بجائے خاوند ہوتے...... کہتے ہیں کسی نے رومیو سے پوچھا کہ محبوبہ اور بیوی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ رومیو بولے۔

''چالیس پونڈ کا......''

ویلین ٹائن ڈے پر اکثر عاشق اپنا مدعا دِل مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ایک نوجوان نے اپنی محبوبہ کو رجھانا چاہا کہ اس کے دوست اونچے عہدوں پر ہیں۔ انہوں نے ایک دوست کا ذکر دلفریب انداز میں کر کے مستقبل کے سہانے سپنے دکھانے چاہے، اس پر موصوفہ نے محبوب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''مجھے اپنے دوست سے ملا دو...... ملا دو گے نا؟''

''محبوبہ سے ملاقات کے دوران اور بات کرتے وقت اصل مطلب اور موزوں ترین الفاظ استعمال کریں ورنہ نتائج کے ذمہ دار خود ہوں گے۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کو متاثر کرنے کے لئے بتا رہا تھا کہ اس کا چچا بڑا آدمی ہے اور دولت سے مالا مال ہے اور اس کے سوا چچا کی دولت کا کوئی وارث نہیں، اس کے مرنے پر تمام جائیداد اس کو ملے گی۔ لڑکی بہت متاثر ہوئی اور وہ ''دور اندیش'' دوسرے ہی دن نوجوان کی نئی چچی بن گئی...... دراصل کسی کی موت کا انتظار کرنا بدتہذیبی ہے اور وہ ''مہذب''، تعلیم یافتہ دوشیزہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''آج کل کچھ ایسے عاشق بھی ہوتے ہیں جو کچھ زیادہ ہی رومانٹک ثابت ہوتے ہیں اور جب ویلنٹائن ڈے پر کسی کینڈل لائٹ ڈنر کی ہلکی مدھم روشنی ہو تو پھر عاشق بے قابو ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی محبت کے عالمی دن پر ایک نوجوان کچھ حد سے زیادہ ہی رومانٹک ہو کر اپنی محبوبہ کی گھنی پلکوں کی چھاؤں میں پناہ، ریشمی زلفوں کی معطر فضاؤں میں سانس لینا چاہا اور جھیل سی گہری آنکھوں میں ڈوبنے کا ذکر چھیڑا تو دورِ جدید کی دِلدادہ محبوبہ کے کچھ پلے نہ پڑا۔ وہ اپنی مصنوعی پلکیں، بالوں کی وگ اور کانٹیکٹ لینز اُتار کر بولی۔

''''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اِن کا کیا کرو گے۔ اگر تمہیں یہ چیزیں واقعی درکار ہیں تو لے لو، میں اور خرید لوں گی......''

موبائل نے تو عشق کو اور سستا کر دیا ہے۔ اب تو 10 سال کے بچے اور بچی کے پاس بھی موبائل ہے۔ سارا دن اور ساری رات sms اور کالیں چلتی رہتی ہیں۔ فری پیکیج اور سستے پیکیج تو عاشقوں کے لئے غنیمت ہیں۔ کچھ عرصے پہلے انٹرنیٹ پر عشق کے بہت چرچے تھے اب یہ چیز موبائل عشق ہو گیا ہے۔ بس ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ آج کل جو حالات ہیں، ہر جگہ پریشانی، غم، ٹینشن ہے اِس لئے محبت ضرور بانٹیں، اپنوں کے ساتھ اور اپنے پیاروں کو یاد رکھیں۔ ہماری دُعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

☆☆

میرے بچپن کے دِن

آج مجھے گھر میں بیٹھے بیٹھے اپنے بچپن کے دن یاد آ رہے تھے۔ میرا کوئی اپنا گھر نہیں تھا، مجبوراً ماں باپ کے گھر پیدا ہونا پڑا۔ میں چھوٹی سی تھی، امی مجھے چارپائی پر سلا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی تھی۔ اگر میں رونا شروع کر دیتی تو امی باجی سے کہتی کہ چھوٹی کے ساتھ کھیلو۔ باجی میرے ساتھ اس طرح کھیلتی تھی جیسے کوئی فٹ بال کے ساتھ کھیل رہا ہو۔ پھر میں اللہ کے کرم سے بڑی ہوتی گئی۔ ہمارے ہاں لوگوں کا عجیب رویہ ہے کہ وہ پہلے بچوں کو کہتے ہیں کہ بولو اور جب وہ بولنا شروع کر دیتے ہیں تو ساری زندگی بچوں کو چپ ہی کرواتے رہتے ہیں۔ جب میں پانچ سال کی ہوئی تو اماں ابا نے مجھے سکول میں داخل کروانے کا فیصلہ کیا۔ لوگوں نے انہیں مشورہ دیا کہ اسے پاگل خانے داخل کرو۔ میں نے آخر کار سکول جانا شروع کر دیا۔ ہمارے سکول کی عمارت بہت بوسیدہ تھی۔ ایک دن وہاں کسی نے شرارت سے لکھ دیا کہ ''تالی زور سے بجانا منع ہے کسی وقت بھی عمارت گر سکتی ہے''۔ دوسرے سکولوں میں بچے تلاوت سے سکول کا آغاز کرتے تھے ہمارے سکول میں بچیاں ایک دوسرے کو بجا کر سکول کا آغاز کرتی تھیں۔

سیدہ شعبانہ گیلانی، باغ (آزاد کشمیر)

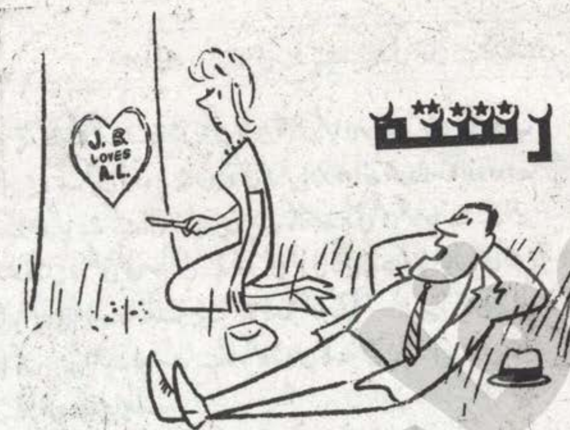

پیار کا اٹوٹ رشتہ

☆ طاہر جاوید مغل

میں ہمیشہ ریل گاڑی سے سفر کرتا ہوں لیکن اس دن کوئی ٹیکسی رکشہ اسٹیشن تک جانے پر رضامند نہ ہوتا تھا۔ ایک رکشہ سے ”یعنی رکشہ والے“ سے میں نے انتہائی لجاجت سے اس انکار کی وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ ریلوے روڈ پر پانی کھڑا ہے۔

”آخر کتنا پانی ہوگا؟“

ہم نے بات کو تول کر بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن ہمارے تولتے ہی تولتے ایک جھٹکے سے رکشہ آگے بڑھ گیا۔ جب ایک تانگے والے نے بھی انکار کیا تو ہم نے گھوڑے کی گردن کی اونچائی دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا کہ ”کافی“ پانی ہوگا۔

ہاں تو صاحب سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے جب ہم لاری اڈے میں داخل ہوئے تو دلہن کی طرح ہار کئے ایک بس نے نہایت دل آویز انداز میں آنکھیں مار مار کر ہمیں متوجہ کیا۔ سجی سجائی ایک دوکان تھی جس میں گاہکوں کی توجہ کے لئے ریکارڈ نہایت تیز آواز سے بج رہا تھا۔ اگر وہ بس لاہور جانے والی نہ ہوتی تو بخدا ہمیں اس میں نہ بیٹھ کر بہت افسوس ہوتا۔ بس میں داخل ہو کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ہم شڑاپ سے فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھے لیکن پھر کچھ سوچتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دراصل ہماری آنکھوں میں اخباروں کی وہ بے شمار سرخیاں ناچنے لگی تھیں جن کے آخری الفاظ ہوتے ہیں ”ہلاک و زخمی“ اس کے بعد ہم نے نہایت اطمینان سے دونوں طرف کی قطاریں گنیں اور عین درمیان میں ایک سیٹ تشریف رکھنے کے لئے چنی۔

بس میں قدم رکھنے والے ہم پہلے مسافر تھے اور اپنی انتہائی پسندی کی وجہ سے سیٹ چننے کا ہمیں پورا حق تھا۔ لہٰذا ارد گرد کی سیٹیں دبا دبا کر ہم نے اطمینان کر لیا کہ کہیں کوئی سیٹ عام سٹینڈرڈ سے زیادہ نرم نہیں۔ بس اطمینان سے ڈرن ڈرن کرتی رہی اور ہم اطمینان سے سگریٹ پیتے رہے لیکن ایک ہی گھنٹے میں ہمارا یہ اطمینان پوری طرح رخصت ہو چکا تھا۔ ہم اٹھ اٹھ بیٹھتے تھے لیکن بس تھی کہ چلنے کا نام نہیں لیتی تھی اور سواریاں تھیں کہ آتے آتے رہ جاتی تھیں۔ اب اچھی طرح ہماری سمجھ میں آگیا تھا کہ آتے ہی ہمارا ٹکٹ کیوں کاٹ دیا گیا تھا۔ اب تو بس ایک ہی چارہ رہ گیا تھا کہ ہم خود بھی باہر نکل پڑیں اور چیخ چیخ کر آوازیں لگائیں۔

”لاہور چلو، بھئی لاہور چلو، خدا کے لئے لاہور چلو۔“

اس سے پیشتر کہ کنڈیکٹر سے کوئی التجا کر کے ہم کوئی الٹی سیدھی بات سنتے، بس نے الوداعی طرز کا زوردار ہارن دیتے ہوئے ایک فرحت بخش جھٹکے سے حرکت کی لیکن پھر بریک لگ گئی۔ پھر وہی ڈرن ڈرن پھر وہی آوازیں۔ ”لاہور اے بھئی لاہور“ یوں کتنی ہی مرتبہ بس ہمارے دل سے کھیلی۔ ماسوائے ایک سیٹ کے سب سیٹیں پوری ہو چکی تھیں۔ کنڈیکٹر بار بار خالی سیٹ کی طرف دیکھ کر کر ”لاہور اے لاہور اے“ کی آوازیں دے رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس سیٹ کی وجہ سے بس کا توازن خراب ہے جب تک سواری نہیں بیٹھے گی بس نہیں چلے گی۔ ہم نے نہایت خلوص اور کرب سے اس سیٹ کے حق میں دعا مانگی۔ جب آنکھیں کھولیں تو بیک وقت دو خوشیاں ہماری منتظر تھیں۔ ایک تو سواری مل گئی تھی دوسرے بس کو رونق مل گئی تھی۔ وہ سواری ایک خوبصورت برقعہ پوش حسینہ کی شکل میں آئی تھی۔

اب بس کچھ دیر اور بھی ٹھہر جاتی تو ہمیں کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوتی لیکن بس بھی شاید بلاوجہ تاخیر کی قائل نہیں تھی اس لئے چل پڑی۔ ہم نے سائڈ کا شیشہ اس حد تک کھول دیا کہ چہرے پر گرد اور دھوئیں کی تہہ بھی نہ چڑھے اور بال بھی پیشانی پر جھولتے رہیں۔ اب ہم نے یوں گردن گھما گھما کر ”نظارے“ دیکھنے شروع کئے جیسے ایسا عجیب و غریب علاقہ آج تک ہماری نظروں سے نہ گزرا ہو لیکن اصل مقصد تو نقاب کے پیچھے چھپے ہوئے اس چہرے کو نظروں سے ٹٹولنا تھا--- شہری حدود سے نکلتے ہی ڈرائیور بھائی نے پھر چاروں سپیکر کھول دیئے۔ ہم ہمیشہ سے بسوں میں لگے ٹیپ ریکارڈر وغیرہ کے خلاف رہے ہیں لیکن اس وقت تو جیسے

ہماری کوئی دیرینہ تمنا پوری ہو گئی۔ ہم نے بے ساختگی سے نقاب سے پرے یوں دیکھا جیسے فرمائش وہاں سے آئی ہو اور گانا ہم نے لگایا ہو۔ اس بھونڈے سے انداز پر دو چمکتی آنکھوں نے ہمیں نقاب کے پیچھے سے گھورا اور ہم سہم کر دائیں بائیں دیکھنے لگے کہ کسی نے ہماری تا کا جھانکی کی نوٹ تو نہیں کیا۔ مطمئن ہو کر ہم نے اطمینان کی سانس لی لیکن ڈرائیور بھائی کے سر پر لگے شیشے پر نظر پڑتے ہی ہم ٹھٹک کر رہ گئے۔ بڑی بڑی مونچھوں والا ڈرائیور بھائی گہری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ کتنی ہی دیر ہم دم سادھے بیٹھے رہے۔ پھر دل نے کہا یہ بھی کیا بزدلی ہے سرسری نظر سے کسی کو دیکھ لینا کسی طور پر قابل گرفت جرم نہیں ہے اور پھر یہ نظر تھوڑا ہی ہے۔ وہ دوسری والی کھڑکی کے پاس متوازی بیٹھی تھی۔ ہم نے یونہی سے انداز میں لیکن بڑی باریک نظروں سے نقاب میں گھسنا چاہا لیکن گڑبڑا کر رہ گئے۔ نقاب ڈاکہ ڈالنے کے انداز میں نصف چہرے پر آ گیا تھا اور چمکدار نظروں کی فل لائٹ یوں ہمارے چہرے پر پڑی تھی کہ دل کا اسٹیئرنگ ڈولنے لگا تھا۔ ہم نے کچے میں اتر کر بلیوں اچھلتے

چاند میری زمیں

چاند میری زمیں، پھول میرا وطن
ہر جگہ خوف اور بھوک سایہ فگن

☆

میرے دہقاں یونہی ہل چلاتے رہیں
میرے کھیتوں میں سونا اُگاتے رہیں
یونہی اپنے لہو کو جلاتے رہیں
اور وڈیروں کی دولت بڑھاتے رہیں
یونہی کپڑوں سے عاری ہوں اِن کے بدن
چاند میری زمیں، پھول میرا وطن
میرے مزدور بھٹیوں میں جلتے رہیں
اِن کے سینوں میں ارماں مچلتے رہیں
اِن کی بستی میں فاقوں کے ڈیرے رہیں
اور بچے جہالت میں پلتے رہیں
بیٹیوں کا لٹتا رہے بانکپن
چاند میری زمیں، پھول میرا وطن

کے ایچ مجاہد

ہوئے دل کو بڑی مشکل سے بریکیں لگا کر ایک طرف کھڑا کیا، یہ دیکھنے کے لئے کہ ناب کھسکنے کے اس عمل میں جو محرک کارفرما ہے، وہ ہماری ذات سے متعلق ہے یا کوئی ہم سے بھی زیادہ سمارٹ نوجوان بس میں موجود ہے۔ چاروں طرف دیکھ کر ہمارے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ ہمیں اطمینان ہو گیا کہ یا تو ہماری وجہ سے نقاب کا اسٹائل بدلا گیا ہے یا ہوا کی وجہ سے۔

ہم نے سیٹ پر نیچے کو کھسکتے ہوئے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔ ''تری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے'' گانے نے کچھ اور سرشاری کی کیفیت طاری کر دی۔ ہم نے اونگھنے کی اداکاری کرتے ہوئے چہرے کو زیادہ سے زیادہ معصومیت بخشنے کی کوشش کی۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ گہری نظروں سے ہمارے چہرے کا طواف کر رہی ہو گی۔ یقیناً یقیناً ایسا ہی ہو گا۔ پھر بھی دل کی تسلی کے لئے ہم نے اچانک مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی، ہم اس کی پھرتی پر عش عش کر اٹھے۔

محبوب کے ناز و نخرے پر عاشق لوگ جوابی نخرے بھی دکھایا کرتی ہیں۔ ہم نے سوچا روٹھنے کے لئے یہ موقع مناسب ہے۔ ایک انداز کج ادائی سے ہم نے چہرہ کھڑکی سے باہر کر لیا لیکن گردن کچھ لمبی ہونے کے سبب شاید زیادہ آگے نکل گئی اِسی لئے پچھلے دروازے سے باہر لٹکتے ہوئے کنڈیکٹر نے گرج دار آواز میں کہا۔

''اوئے، سر کس کا ہے؟''

ہم جان گئے کہ اشارہ ہمارے سر ہی کی طرف ہے۔ ہم نے آہستگی سے سر اندر کر لیا لیکن اردگرد بیٹھے ہوئے بزرگ کہاں کہاں چھوڑنے والے تھے۔ حادثوں کی باتیں ہوئیں۔ نصیحتوں کی بارش ہوئی اور ہم کو خوب جھینپنے پر مجبور کیا گیا۔ ہم نے خود کو کچھ لاپرواہ ظاہر کرنے کے لئے اور کچھ تھرماس دکھانے کے لئے کافی انڈیلی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے کی کوشش کرنے لگے لیکن پہلی ہی چسکی پر ہمیں بس اور ٹرین کا فرق معلوم ہو گیا کیونکہ کچھ کافی ناک میں اور کچھ ٹھوڑی سے نیچے بہہ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے کپ تھام کر ہم کافی دیر کافی پینے کی کوشش کرتے رہے لیکن کافی اندرونی راستے کی بجائے گریبان کے راستے پیٹ تک پہنچتی رہی۔ ہمیں یقین ایسا ہی ہو گا پھر بھی شک نکالنے کو ہم نے دیکھا تو وہ ہماری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ہم بھی مسکرائے۔ وہ ہماری اداؤں سے لطف اندوز ہو رہی تھی لیکن اب ہم کافی سے کشتی کر کے اس کو مزید لطف اندوز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے ایک انداز سے سر ہلاتے ہوئے کپ باہر اُنڈیل دیا، پھر اچانک

ہی ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے جن صاحب پر چھینٹے پڑے تھے انہوں نے نہایت کسیلا منہ بنا کر ہماری بیہودگی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ہم نے نہایت شرمندگی سے معذرت کی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی اس ادا پر بے انتہا پیار آیا۔ شاید اس نے ہماری بے عزتی کو اپنی بے غرتی جانا تھا۔ ہم نے خوش کلامی سے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کا دل جیتنا چاہا لیکن ان سب کو نیند آ رہی تھی۔ اس دور میں اگر کوئی بااخلاق بننا چاہے تو کوئی اس کی مدد بھی نہیں کرتا۔

"جب پیار کیا تو ڈرنا کیا" آواز نے جذبہ تازہ کر دیا۔ ہم نے پھر اس کی طرف دیکھنے کا ارادہ کیا لیکن احتیاطاً ڈرائیور بھائی کے شیشے میں دیکھا تو وہ اسی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ ہم نے جلدی سے اس کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ بھی تو اس کی طرف نہیں دیکھ رہی لیکن پتہ نہیں چلا کہ وہ کس طرف دیکھ رہی تھی کیونکہ جب ہم نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہماری طرف دیکھنے لگی۔ نگاہیں ہیڈلائٹس کی طرح ٹکرائیں، جھپکیں پھر ٹکرائیں۔ سینے کا انجن زور سے چنگھاڑا اور محبت کا جذبہ سب خدشات کو "اوورٹیک" کر گیا۔ ہم نے انگوٹھے اور انگلیوں سے دل کی شکل بنا کر اسے دکھائی۔ ہمارا مطلب تھا ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔ اس نے نگاہیں جھکالیں۔ میرا خیال ہے اس کا مطلب تھا کہ "میں بھی کرتی ہوں۔۔۔" ہم اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کے مرمریں ہاتھ مضبوطی سے ایک دوسرے کے ساتھ بند ہو گئے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ "یہ پیار کا رشتہ اٹوٹ ہے۔"۔۔۔ ہم نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اسے الٹ پلٹ کر دکھائیں اس سے مطلب تھا کہ ہم آزاد ہیں، ہماری منگنی ونگنی نہیں ہوئی۔ وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ ہم نے اس کی انگلیوں کا بغور جائزہ لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری بھی منگنی بھی نہیں ہوئی۔ ہم نے کالج کے نبریز پر آویزاں نشان سے مٹی جھاڑی۔ ہم بتا رہے تھے کہ ہم ایک کالج سٹوڈنٹ ہیں۔ اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے بی اے کی ہوم اکنامکس نکالی اور سر جھکا کر پڑھنے لگی حالانکہ ہمیں علم تھا کہ اس سے پڑھا نہیں جا رہا یہ اس کی پیار کی نشانی تھی۔

اس خاموش گفتگو کو آگے بڑھانے کے لئے اب کیا کیا جائے۔ ہاں والدین کے متعلق پوچھا جائے۔ اب ہم نے سگریٹ کی ڈبیہ پر بڑا سا "والد" لکھا اور اس کو دکھانے کی پوزیشن میں رکھا لیکن اس نے کتاب سے سر نہیں اٹھایا۔ ہم نے بار بار کھنکار کر اس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے کتاب بند کی اور ہمارے سوال کی طرف دیکھ کر طویل سانس لی۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس کے والد اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ہم کتنی دیر سر جھکائے اس کے والد کی وفات پر اظہار افسوس کرتے رہے۔ تعزیت سے فارغ ہو کر ہم نے سوچا کہ ہمیں یہ سوال آخر میں کرنا چاہئے تھا کیونکہ اس کا موڈ آف سا ہو گیا تھا۔ کچھ انتظار کے بعد ہم نے ڈبیہ پر "مشغلہ" لکھ کر اسے دکھایا۔ اس نے کچھ توقف کے بعد بیگ سے فلمی رسالہ نکالا اور لاپرواہی سے ورق گردانی کرنے لگی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کبھی کبھار فلم سے شوق کر لیتی ہے۔ "اس کے علاوہ کوئی اور شغل؟" "سچ جانئے صاحب! یہ الفاظ زبانی کلامی سہارے منہ سے نکل گئے۔ دراصل ہم گفتگو میں یعنی اس تبادلہ خیالات میں گفتگو کی حد تک کھو چکے تھے۔ اس نے رسالہ بند کرتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ہمارا اندازہ ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ وہ جوڈو کراٹے کو بھی کچھ وقت دیتی ہے۔ اب ہمارا حوصلہ بڑھ چکا تھا، شاید اسی لئے دماغ میں عجیب و غریب خیالات کی یورش ہونے لگی تھی۔ ہم

شغل + مغل

(روحِ فراز سے معذرت کے ساتھ)

☆ محسوس ہو رہی ہے فضا میں اُس کی خوشبو، فراز
شاید کہ گٹر کا ڈھکن کسی نے اُٹھا لیا ہو

☆ ہم بھلا نہ سکے ایک پرخلوص کا پیار، فراز
جس نے بس میں میری جیب کاٹ لی

☆ کسی نے پوچھا مجھ سے میری بربادی کا سبب، فراز
نام میں نے اُسے اپنی بیگم کا بتا دیا

☆ ہم نہ بدلیں گے وقت کی رفتار کے ساتھ، فراز
ہم تو شوہر ہیں ہمارا یہی حال رہے گا

☆ ہر رات وہ میرے خوابوں میں چلا آتا ہے، فراز
کاش! حکومت خوابوں پر بھی ٹیکس لگا دے

☆ وہ ایسا تو نہیں تھا کہ مجھے اکیلا چھوڑ جاتا، فراز
ضرور اِس نے میرا بینک بیلنس دیکھ لیا ہوگا

☆ محبت کی حقیقت سے تو ہم خوب واقف تھے، فراز
قسمت اپنی خراب تھی کہ پھر کوئی چونا لگا گیا

☆ ہم تو تیری زندگی میں خوشبو کی طرح ہیں، فراز
سونگ سونگ کر جب تھک جاؤ تو بتا دینا

☆ محبت کا بھی عجیب جنون ہوتا ہے، فراز
جب تک سینکڑوں گالیاں نہ کھا لو سکون نہیں ہوتا

☆ تم مجھے موقع تو دو اعتبار بنانے کا، فراز
کنگلا نہ کر دیا تو میرا نام بدل دینا

☆ دل اِس کا بھی تھا، دل میرا بھی تھا فرق صرف اِتنا تھا، فراز
میرا دل پاس تھا اور اس کا بائی پاس

☆ کچھ تو اپنے مقدر میں اندھیرے ہی تھے، فراز
کچھ واپڈا والوں نے کسر نکال دی

محمد صابر مغل عبدوالہ

اس تک اپنے جذبات تفصیلاً پہنچانا چاہتے تھے۔ ان میں اس کا ایڈریس لینے کا جذبہ بھی شامل تھا۔ بس یہیں کوئی لیٹر ضروری ہو جاتا ہے۔ ہم نے لکھنا شروع کیا۔

''اے انجان لڑکی' اے بے نام آرزو!

تجھے خبر نہیں کہ تیرے عشق نے لمحوں میں ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔۔۔''

''جہلم بھئی جہلم'' کنڈیکٹر کی کان پھاڑ آواز ہمارے خیالات کو منتشر کر گئی۔ جہلم کی سواریاں اُتر گئیں اور آگے کے سوار ہو گئیں تو بس نے پھر حرکت کی اور اس کے ساتھ ہی ہمارے قلم کی حرکت آزاد ہو گئی اور وہ لفظوں کی بجائے کیڑے مکوڑوں کی شکلیں بنانے لگا لیکن بھلا ہو ڈرائیور بھائی کا کہ اس نے ساری بس کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر چپے چپے سے سواری اٹھا کر سامان لادلاد کر ہمیں خط مکمل کرنے کا موقع دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ایک تعویذ کی شکل میں خط کو مٹھی میں دبائے ہوئے تھے اور یہی وہ مرحلہ تھا کہ جہاں کئی عاشقوں کی جذبات سے اوورلوڈ گاڑیاں اڈے سے نکلتے ہی فیل ہو جاتی ہیں۔ یہ مرحلہ تھا خط پہنچانے کا لہٰذا دھڑکتے دل سے ٹکراتی پسلیوں کو سہارا دینے کے لئے ہم نے بایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور یہ مرحلہ آسان کرنے کو تیار ہو گئے۔ ہماری زبان ہونٹوں پر اور آنکھیں حلقوں میں مسلسل متحرک تھیں۔ کافی لوگوں کے سر آزادانہ ہل رہے تھے اور جو ابھی کچی نیند میں تھے وہ کبھی کبھار ایک جھٹکے سے ساتھ والے صاحب کے ساتھ والے صاحب کے ساتھ ٹکراتے' آنکھیں کھول کر غور سے ان کو دیکھتے اور پھر ان کو سوتا پا کر دوبارہ اچھل اچھل کر جھومنے لگتے۔ ایک سیٹ تو ہمیں بالکل ہی خالی نظر آئی۔ تھوڑا سا اٹھ کر دیکھا تو نہ جان نہ پہچان والے صاحبان بڑی بے تکلفی سے ایک دوسرے کے اوپر بازو پسارے سر گھسیڑے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ ایک صاحب کا سر یوں ہل رہا تھا جیسے وہ کوئی راز کی بات بتانے کے لئے ہمیں پاس بلا رہے ہوں۔ غور سے دیکھا تو ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ایک مولانا صاحب پشت سے نظر آئے جو زور زور سے ایک فلمی گانے پر سر دھن رہے تھے' شاید وہ اسے قوالی سمجھ رہے ہوں لیکن میرا خیال ہے وہ بھی اونگھ رہے تھے۔ ایک بچہ سر کے بل لٹک رہا تھا لیکن اس کی کمر کے گرد اس کے باپ کا ہاتھ مضبوطی سے لپٹا ہوا تھا۔ ایک نوجوان اپنی سیٹ پر اس حد تک کھسک گیا تھا کہ ویٹ لفٹنگ کے بیچ پر لیٹا دکھائی دیتا تھا۔ آہا! ایسا موقع کہاں ملے گا؟ لیکن اس سے بیشتر کہ ہم چھپاک سے خط منزل مقصود تک پہنچا دیتے' ہم نے پیچھے دیکھ لینا مناسب سمجھا کیونکہ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ پچھلی سیٹوں پر دھکے بہت لگتے ہیں اور ظاہر ہے جب کوئی مسلسل دھکے مار رہا ہو تو آدمی سو نہیں سکتا۔ ہمارا خدشہ درست تھا۔ سب سے پچھلی سیٹس پر دس آدمیوں کی پوری لائن شرابی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی لیکن گیارہواں آدمی ایسا بھی تھا جو ان دھکوں کے باوجود اچھل اچھل کر شیشے کو ٹکریں لگا رہا تھا اور یہ کنڈیکٹر تھا۔ کچھ تسلی ہوئی کہ اگر ایک آدمی سو سکتا ہے تو دوسرے بھی سو سکتے ہیں۔ ان کے نہ سونے کی وجہ یہی تھی کہ وہ دس کے دس ابھی پچھلے سٹاپ سے بیٹھے تھے۔ پھر بھی ہاضمی دھکوں کی بدولت ان کی آنکھیں بند ہوتے ہوتے دس پندرہ میل کا قیمتی سفر طے ہو گیا۔ کیا سنہری موقع تھا' جی چاہا کہ فی البدیہہ بات ہو جائے لیکن وہ کچھ محتاط تھی۔ ہم خط شو کرتے تو وہ سر گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی جیسے کسی جاگتے کو مدد کے لئے بلانا چاہتی ہو لیکن دراصل وہ ''سازگار حالات'' کا جائزہ لے رہی تھی۔ اَب کون سی ہچکچاہٹ تھی۔ اس کی ادا سمجھ میں نہیں آ رہی تھی' ایسی انمول گھڑی کہاں ملتی ہے۔ ساری بس پنگھوڑے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ہر طرف نیند کے پر پھیلے تھے۔ اب وہ متواتر سامنے دیکھ رہی۔ ہم نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تو کیا دیکھا کہ ڈرائیور بھائی اس کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے ہیں۔ دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ ایسے لوگ ہی حادثوں

ایک صارف کی التجا

ہم کو مشقِ ستم نہ بنا' واپڈا
چھوڑ دے اَب یہ جورو جفا' واپڈا
تیرا ہر فرد ہے بس اِسی تاک میں
کوئی آ کے کرے تک مکا' واپڈا
بل ہزاروں میں آتا ہے اِک بلب کا
کیجئے کچھ تو خوفِ خدا' واپڈا
اِس کو بجلی کے چوروں میں شامل کیا
تو ہوا جس کسی سے خفا' واپڈا
تیری وحشت سے لرزاں ہیں اہلِ وطن
بن گیا ہے تو اِک اژدہا' واپڈا
آج سے بس یہی فیصلہ ہے مرا
مَیں جلاؤں گا کل سے دِیا' واپڈا
ایک آوارہ ہی کو نہیں ہے گلہ
تجھ سے نالاں ہے خلقِ خدا' واپڈا

آوارہ بلی ٹنگوی' بلی ٹنگ (کوہاٹ)

کا سبب بنتے ہیں۔ خدا کے بندے! اگر سامنے نہیں دیکھنا تو تم بھی سو جاؤ۔ ہم نے جھلاتے ہوئے سوچا۔ دل کڑا کر کے ہم نے ڈرائیور بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں' کبھی تو سامنے دیکھے گا ہی۔ بس ہمیں ایک لحہ چاہئے تھا خط ٹھکانے لگانے کو لیکن یقین جانئے صاحب! کتنی ہی دیر تک ہم پہلو بدلتے رہے۔ آخر کسی سواری کے لئے ڈرائیور بھائی نے سامنے دیکھا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی زوردار بریکیں لگا دیں۔ جھٹکے سے کئی صاحبان بسم اللہ پڑھتے ہوئے جاگ گئے اور ہم دل مسوس کر رہ گئے۔ صبح کی سپیدی ظاہر ہو رہی تھی۔ اب جو اوورلوڈنگ شروع ہوئی ہے تو دنیا والوں کی ایک دیوار ہماری سیٹوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ وہ جان زندگی تڑپ گئی اور ہم اس طرف آہیں بھرتے رہے۔ اس کا عشق ستا تا رہا اور صورت نگاہوں میں پھرتی رہی مگر کیا مجال ہے کہ لاہور کے نواح تک اس موٹی دیوار میں کوئی شگاف پڑا ہو۔

ہم بار بار ٹانگیں کھولنے کے بہانے اترتے رہے لیکن گھوم کر دوسری طرف والی کھڑکی سے دیدار یار کرنے کی ہم میں ہمت نہیں تھی۔ دراصل بس کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ کبھی نہایت سکون واطمینان سے کھڑی رہتی تھی اور کبھی یکدم چھوٹ جاتی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ ہم صبر کریں اور یہ کٹھن گھڑیاں ان کے تصور سے دل بہلاتے گزار دیں۔ ان کا تصور جو فی الحال ادھورا تھا' یعنی ہونٹوں سے اوپر اوپر۔ ہم نے تخیل کا سہارا لے کر ان کی ناک میں خوبصورت سی نتھ لٹکا دی' ماتھے پر نفیس قسم کا جھومر لہرا دیا اور مانگ نادر قسم کے ستاروں سے بھر دی ایک نہایت ہی چھوٹا سا---''چھوٹا سا'' گھر بنایا جس کے آنگن میں انہیں ٹہلتا ہوا دیکھا۔ ''آنگن میں'' لیکن یہ برقعہ بار بار تصور کا بیڑہ غرق کر رہا تھا۔ کچھ بھی ہو صاحب! ہمارے دل کا بیڑہ مکمل طور پر غرقاب ہو چکا تھا اور اگر خدانخواستہ وہ شادی شدہ یا بیوہ نہیں تھی تو اس کو اپنا ہماری زندگی کا آخری مقصد بن چکا تھا۔ جس صورت کو ہمارے خیالات بیس برس سے ''متواتر'' تراش رہے تھے' وہ آج ہم نے پائی تھی۔

آخر روشنیوں اور ہنگاموں کا گہوارہ لاہور آ گیا۔ بس رکی' میرے سپنوں کی رانی' میری بقیہ زندگانی شرماتی لجاتی لڑکھڑاتی سیٹ سے اٹھی۔ چھوٹے چھوٹے قدموں سے نیچے اتری۔ اس نے اپنا بیگ ایک رکشے میں رکھا اور بیٹھ گئی۔ ہم نے پہلے سے ٹیکسی تاڑ رکھی تھی۔ ڈرائیور بولا۔

''کہاں صاحب!''

ہم نے خالص جاسوسی انداز میں ایک نوٹ اس کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ رکشہ جہنم تک جائے تو وہاں تک چلو۔''

اس نے یوں سر ہلایا جیسے ہمنے بڑے پتے کی بات کہی ہو۔

ٹیکسی لے کر ہم نے دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ دراصل ہمیں معلوم تھا کہ جینٹس سواری والا رکشہ کبھی بھی لیڈیز سواری والے رکشہ کا تعاقب نہیں کر سکتا کیونکہ لیڈیز سواری والے رکشہ کا انجن چھ ہارس کا ہو جاتا ہے۔ رکشہ غیر متوقع میرا مطلب ہے متوقع رفتار سے اڑا جا رہا تھا اور ہم ماہرانہ انداز میں ڈرائیور کو تعاقب کے لئے ہدایات دے رہے تھے۔ ہم اس وقت پورے پورے جاسوس بنے ہوئے تھے۔ اچانک ہم نے ڈرائیور کو بغلی سڑک پر گاڑی ڈالنے کو کہا۔

''لیکن جی' رکشہ؟'' ڈرائیور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''او ہو تم چلو تو رکشہ کا بس یہی ایک راستہ ہے اور ہم شارٹ کٹ لگا کر پھر اسی راستے پر پہنچ جائیں گے۔ ان چھوٹے چھوٹے چکروں سے تعاقب کرنے والے اپنے پر کیا جانے والا شک دور کیا کرتے ہیں۔ کیا سمجھے؟''

سب سمجھ گیا صاحب جی! لیکن---- خیر ہم تو حکم کے غلام ہیں' جی!''

گاڑی دوسری سڑک پر ہولی۔ تھوڑا چلنے کے بعد ہمیں گاڑیوں کی سرخ سرخ لائٹس نظر پڑیں۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا' یہ ٹریفک جام سا کیوں ہے۔ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ بورڈ پر نظر پڑی۔

''سڑک زیر تعمیر ہے۔''

گاڑی تقریباً کھڑی ہو چکی تھی۔

''ڈرائیور تیز چلو۔'' ہم نے چیخ کر کہا۔

''صاحب! یہاں سے تو سائیکل بمشکل گزر رہی ہے۔'' اطمینان سے جواب ملا۔

''واپس ٹرن کرو' جلدی۔''

''لیکن صاحب! پیچھے تو لائن لگ چکی ہے۔''

ہم نے ماتھا پیٹ لیا۔ قسم قسم کے ہارن ہماری بے بسی پر نوحہ کناں تھے۔ ہمارے مستقبل کے خواب سڑک پر بچھی روڑی کی طرح بکھر گئے تھے۔ حکم کا غلام سکون سے اسٹیرنگ سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس نے میٹر شاید ''ریٹ'' پر لگا رکھا تھا اور وہ ادھر ادھر پیسے پھینک رہا تھا۔ ہمیں جان بوجھ کر سڑک کی خرابی سے خبر رکھا گیا تھا لیکن اب ہم کیا کر سکتے تھے۔ ہم مکمل بیچارگی وبیکسی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاتھ مضبوطی سے ایک دوسرے کے ساتھ بند تھے۔ اس انداز پر ہمیں اس کی ادا یاد آ گئی جب وہ ہاتھ باندھ کر ہمیں دکھا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ''یہ پیار کا رشتہ اٹوٹ ہے۔''---- وہ یقیناً یقیناً ہم سے پیار کرتی تھی۔

☆☆

مظلوم خامہ

☆ مسٹر ڈبکلاں

ہم بہت چھوٹے تھے اور اپنے بڑے بھائیوں ارشد رضا اور تجمل عمران کے ہمراہ چھوٹی تختی اور ننھے سے قاعدے کے ساتھ کبھی کبھار اسکول جایا کرتے تھے۔ اچھی طرح یاد نہیں کہ تیسری یا چوتھی جماعت کی اُردو کی کتاب میں ایک سبق تھا ''دانے کی کہانی'' اپنے ٹوٹے پھوٹے جوڑ توڑ کے علم مبلغ سے ہم اس عنوان کو پڑھ لیا کرتے تھے لیکن ہمیں اِس کے مفہوم کا کوئی خاص آئیڈیا نہیں تھا۔ ہمیں ''دانے'' کے لفظ سے ذہن میں جو مفہوم سمجھ آتا تھا' وہ کوئی دیو' جن یا بلا کا تھا کیونکہ اس سبق کے پہلے صفحے پر گندم کے دانے کی ایک بڑی بیضوی اور عمودی تصویر دی ہوئی تھی۔ جس پر بڑی بڑی دو آنکھیں اور منہ ناک کے نشانات سے ایک عجیب وغریب اور خوفناک سی چیز ذہن کو ڈرا دیتی تھی اور قطعی یہ احساس نہیں تھا کہ اِس خوفناک مشکل کا تعلق کسی بھی طرح گندم کے دانے سے ہوسکتا ہے۔ ہم اِس تصویر کو دیکھتے ہی ڈر جایا کرتے تھے اور خوف کے مارے آنکھیں بند کر کے کانپنا شروع کر دیتے تھے۔ بھائی صاحبان کے کلاس فیلوز ہمیں پکڑ لیتے اور زبردستی ہمیں وہ تصویر دِکھایا کرتے تو ہم دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیتے تھے۔ آج قریباً تیس برسوں کے بعد ہم پر اِس دانے کی کہانی کے جو اسرار و رموز وا ہوئے ہیں' اُنہوں نے ہمارے دِل و دماغ کو اِس دانے بیچارے کے دُکھ درد اور مظلومیت کے احساس سے تڑپا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہمارا قلم اِس مظلوم ترین مخلوق کی آپ بیتی دُنیا بھر کے اکابرین کے سامنے دھاڑیں مار مار کر بیان کرنے کے لئے چل پڑا ہے۔ تو لیجئے' دانے کی کہانی' اُس کی اپنی زبانی!

☆☆

مجھے ہر طرف اندھیرے' ہڈیوں میں اُترتی ٹھنڈک اور تنہائی اور قید وحبسِ بے حساب کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اِس احساسِ مصیبت نے مجھے ہاتھ پاؤں چلانے پر مجبور کر دیا اور میں اِس گورکھ دھندے میں کسمسانے اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میں نامعلوم مدت تک مصروف سعی رہا اور تب آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اِس نامعلوم جہنم میں اکیلا گرفتار نہیں ہوں بلکہ میرے قرب وجوار میں ایسی بے شمار کاوشوں کی سرسراہٹیں ابھر اور معدوم ہو رہی تھیں۔ میں نے بہت جلد اِن ہمدردوں سے ناتا قائم کیا اور تب ہم سب نے اِس مصیبت سے نکلنے کے لئے اوپر نیچے' آگے پیچھے' دائیں بائیں زور لگانا شروع کر دیا۔ ہماری یہ کوشش شاید تین چار روز یا ہفتہ بھر جاری رہی کیونکہ اِس اندھیرے میں دن رات کا فرق تو معلوم نہیں ہو سکتا تھا--- بہر حال' ہماری کوششیں رنگ لانا شروع ہوئیں اور ہم آخر اپنے اوپر سے مٹی کی وہ بھاری تہہ ہٹا کر فضا میں سانس لینے اور کچھ دیکھنے کے قابل ہو ہی گئے جس نے ہمیں زندہ درگور کیا ہوا تھا۔ واہ' یہ کیا؟ دور دور تک ہموار میدان' گرم ونرم اور بھربھری مٹی' متوازی متوازی طویل لائنوں میں ہماری طرح کے ہزاروں بلکہ بے شمار ساتھی اپنی نرم نرم اور ہری ہری کونپلوں کی صورت میں زمین پر سر اُٹھائے چمکتے ہوئے سورج کو پہلی مرتبہ خوشگوار حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ہمیں اِس کی نرم وگرم کرنیں ہمارے درد ومصائب پر مرہم رکھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے نرم ولطیف جھونکوں نے ہمیں مسحور کر دیا۔ ہم لوگ مستی میں تھوڑا تھوڑا جھومنے گانے لگے اور دور و نزدیک تک ایک دوسرے کو سرسبز تاجوں میں سجے دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگے۔ جوش میں پورے کھیت میں ایک ہلچل اور شور مچا ہوا تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کو اپنی بے حساب کوشش کی کامیابی اور نئی زندگی کی شروعات کی مبارکباد دے رہے تھے۔ ہم نے مشرق سے چمکتے ہوئے سورج کو بڑے وقار سے اُبھرتے ہوئے دیکھا' گرم ونرم ہوا کو بڑے پیار سے اپنے سروں پر پیار کرتے گزرتے محسوس کیا۔ ہم نے زندگی کا نیا روپ آزادی کا نیا احساس پایا۔

گرم و نرم اور لطیف کرنیں قدرے تیز اور گرم تر ہوتی گئیں اور سورج ہمارے سروں پر آسمان کے بلند ترین مقام پر جا پہنچا۔ گرمی کی شدت نے پیاس کا احساس جگا دیا اور ہم نے گرم گرم بھربھری زمین میں پانی پانی پکارنا شروع کر دیا لیکن ہمارے قدموں میں ہی ضرورت کے پانی کی معقول مقدار موجود تھی۔ ہم اس سے سیراب ہونے لگے۔ اتنے میں آگ کا وہ گولہ جو آسمان پر سب سے بلند مقام پر جولانیاں دِکھا رہا تھا' آہستہ آہستہ مہربان ہونے لگا اور مغرب میں ڈھلنے لگا اور آخر غروب ہو گیا۔ ہم سب لوگ ننگے سر تھے اور سردی کی بڑھتی ہوئی شدت نے ہماری آنکھوں میں آنسو بھر دیئے جو دوسری صبح تک شبنم کی صورت اختیار کر گئے۔ دوسرے روز پھر سورج کی گرمی کے نتیجے میں موتی سمجھ کر شان کریمی نے چن لئے۔ سورج غروب ہونے کے بعد بڑھتی ہوئی تاریکی نے ایک بار پھر ہمیں ڈرا دیا لیکن تھوڑی دیر بعد روشنی کا ایک دوسرا گولہ اپنی چھوٹی چھوٹی چنگاریوں کے ساتھ جگمگ جگمگ کرنے لگا جسے چاند اور ستارے کہتے ہیں۔ آسمان پر ستارے چمکنے لگے اور چندا ماموں ہماری خیر خیریت دریافت کرنے خود تشریف لائے اور روشنی کو ہماری دِل جوئی کے لئے بھیجا۔

اتنا خوبصورت ماحول اور پیاری دُنیا' ایسا احساس تو دِن بھر کی سورج کی روشنی میں بھی نہیں تھا۔ ہم اِس قدر خوش ہوئے کہ ہمارے آنسوؤں نے شبنم کی صورت اختیار کر لی جو ہم نے دوسری صبح نکلنے والے سورج کی کرنوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے پیش کئے تو بے قیمت نظر آنے والے قطرے گہر آبدار کی طرح دمکنے لگے اور پورے کھیت پر کسی جواہر کی کان کا گمان ہونے لگا۔

تین چار روز اِس طرح کے معمولات کے بعد ہماری زبانیں ایک بار پھر خشک ہونے لگیں اور پانی کی زمینی مقدار ہمارے لئے ناکام ثابت ہونے لگی تو ہم لوگوں نے دیکھا کہ اِیک دِن کسان اپنے کندھے پر ''کسّی'' لئے آن پہنچا۔ وہ ہمیں دیکھ کر کچھ فکر مند دِکھائی دینے لگا اور ہم اُسے یوں اسلحہ سے لیس دیکھ کر ڈر سے گئے اور آپس میں سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کرنے لگے لیکن کسان اُنہیں کچھ کہنے سننے کی بجائے کھیت کے ساتھ منسلک کھال کو صاف کرنے میں جت گیا اور ہم اُس کی اِس خاموش کاروائی کو دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شور سا مچا اور تمام کھیت کے تمام ساتھیوں نے دیکھا کہ کھال میں سے پانی کا ریلا ہے جو بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ بہت سے بھولے بھالے ساتھیوں کو تو پتا بھی تب چلا جب پانی کا ریلا اُن کے سروں پر سے گزر گیا۔ ہم لوگوں نے جی بھر کر پانی پیا لیکن پانی اتنا زیادہ تھا کہ ہمیں اب ڈوبنے کا خوف لاحق ہونے لگا تاہم ہم نے اِس خوف کے باوجود آئندہ ضرورت کے لئے کافی پانی اپنی جڑوں اور زمین کے نیچے منتقل کرنا شروع کر دیا اور باقی میں گردن گردن ڈوب کر سر اُٹھا اُٹھا کر سانس لینے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر کسان نے جا کر پانی کا سلسلہ بند کر دیا تو زمین میں پانی جذب ہوتے ہوتے بھی گارے کی صورت رہ گئی۔

اگلے چند روز میں پانی دوبارہ محض ہماری جڑوں میں رہ گیا تھا اور بظاہر کھیت ایک بار پھر خشک ہو چکا تھا لیکن اِس سیرابی نے ہماری صحت اور قد میں بہت حوصلہ افزاء اضافہ کر دیا اور اب ہم پہلے سے زیادہ اونچے ہو کر زیادہ دور تک حالات کا جائزہ لینے کے قابل ہو چکے تھے' اِس کے ساتھ ہی متعدد ایسے دوسرے پودے بھی نمودار ہو چکے تھے جن کا تعلق کم از کم ہماری نسل سے ہرگز نہ تھا تاہم بہت جلد وہ ہم سے گھل مل گئے اور بعض تو اتنی تیزی سے بڑھے کہ ہمیں اپنے لئے خوراک' ہوا اور جگہ کی کمی محسوس ہونے لگی۔ کسان کو ہماری اِس مشکل کا احساس تھا چنانچہ کسان کے بچے اور خواتین کی ایک فوج ظفر موج درانتی لے کر کھیت میں داخل ہو گئی جنہوں نے بے دردی سے ہمارے اِن بن بلائے پڑوسیوں کو جڑوں سے اُکھاڑنا شروع کر دیا۔

دھوپ' پانی' ہوا اور کسان سب ہمارے مددگار اور بہی خواہ تھے۔ ہم خود کو دُنیا جہان کے خوش نصیب ترین لوگوں میں شمار کرتے تھے۔ کبھی ہمیں پانی دیا جا رہا ہے' کبھی ہمیں کھاد دی جا رہی ہے' کبھی کیڑے مکوڑے جو ہمیں تنگ کرتے تھے' اُنہیں تلف کیا جا رہا ہے۔ الغرض سو سو طرح سے ہمارے ناز نخرے اُٹھائے جاتے تھے۔ اِس قدر توجہ اور خدمت نے ہمارے غرور اور نخوت میں اتنا اضافہ کر دیا کہ ہم لوگ اور سے اور اُوپر ہواؤں میں رقص کرنے لگے اور پھر جب ہمارے سروں پر بالیاں اور پھول نکلنے لگے تو ہمارے سروں پر تاج سج گئے۔ کسان ہماری بالیوں کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا اور ہماری بلائیں لیتا نہ تھکتا تھا--- ہمارے اِن تاج نما بالیوں میں موتیوں کا وزن بڑھنے لگا اور ہمارا رنگ پہلے گہرا سبز تھا' پھر آہستہ آہستہ سارا بدن سنہری ہونے لگا اور پورا کھیت گویا سونے کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بن گیا جس میں ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ لہریں چلتی تھیں اور پھر اِسی دوران کچھ ایسا ہوا کہ ہمارے کچھ ساتھیوں کی قسمت پھوٹ گئی۔ کسان جو ہم پر جان چھڑکتا تھا' اُس نے اپنے پالتو مویشیوں کے لئے ہمیں قربان کرنا شروع کر دیا۔ ہمارے ہزاروں ساتھی آن کی آن میں مویشیوں کے چارے کے لئے مار دیئے گئے تاہم ایک بڑا حصہ ابھی محفوظ تھا۔

ہم لوگ اِس نئی ستم ظریفی پر اللہ میاں سے رو رو کر فریاد کناں ہو

گئے لیکن شاید جب بُرے دِن آتے ہیں تو سب سے پہلے دُعاؤں کا اثر ختم ہو جاتا ہے--- جوں جوں ہم نے سنہری رنگ اپنایا' ہمارے ساتھ وہی ہونے لگا جو ہد ہد کی نسل کے ساتھ سونے کے تاج کی وجہ سے ہوا تھا--- ہم نے بھی جب سنہرا رنگ اپنایا تو کسان کے بچے ہم پر مصیبت بن کر ٹوٹ پڑے۔ وہ ہماری بالیاں توڑ توڑ کر بھون بھون کر کھاتے لیکن ہم کیا کر سکتے تھے؟ یہ سلسلہ خدا خدا کر کے اِس وقت ختم ہوا جب ہماری بالیوں کے تمام دانے پک کر سخت اور خشک ہو گئے اور عام آگ میں بھوننے سے گرم گرم دانے کھانا کسان کے بچوں کے لئے ممکن نہ رہا۔

اب ہمارے تنے اور پتے خشک ہو گئے تھے اور ہم خود اپنی بالیوں کے بوجھ سے جھکے پڑے تھے۔ ہوا چلتی تو ہمارے جو ساتھی کھڑے نہ رہ سکتے تھے' زمین پر لیٹ جاتے تھے اور اکثر دوبارہ کھڑے نہ ہو سکے تھے۔ لگتا تھا کہ ہماری بدقسمتی اور مصیبت نے ہماری زندگی کا روپ دھار لیا تھا جو مرتے دَم تک ہمیں ستانے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ ہم نے اگرچہ کبھی کسان کو تنگ نہ کیا تھا' کبھی ہوا سے ہاتھا پائی نہیں کی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں سب ایک ایک کر کے بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک ہمارے دُشمن ہوتے گئے۔ سورج ہم پر پندرہ پندرہ گھنٹے آگ برساتا رہتا' ہوا دِن بھر لو کی صورت میں ہمیں جھلسائے دیتی' کسان ہمیں پانی کھانا تک بھول گیا' بادل اور بارش نے ہمارے علاقے کا رُخ کرنا چھوڑ دیا۔ جان کنی کا عالم کیسا ہوتا ہے' مرنے سے پہلے کے لمحات کیسے جاں گسل ہوتے ہیں' لوگ آخر زندگی کی مصیبتوں سے تنگ آ کر کیوں موت کی تمنا کرنے لگتے ہیں؟ یہ تمام اسرار آہستہ آہستہ ہم پر کھلنے لگے۔ ہر نیا دِن ہمارے لئے مزید خطرات کے سندیس لے کر طلوع ہوتا تھا اور ہر آنے والی رات ہمیں زندگی کی آخری شام لگتی تھی لیکن ہائے مجبوری اور بے بسی' ہم کہیں بھاگ بھی تو نہیں سکتے تھے۔ جس کھیت میں ہم پل کر جوان ہوئے' اُسے چھوڑ بھی تو نہیں سکتے تھے۔ ہمیں اِس ماں کی گود سے پیار بھی تو تھا' ہمارا اِس دُنیا میں اِس کھیت کے علاوہ کون تھا کہ اِس کی مٹی ہمیں کہیں جانے دیتی؟

آخر ایک دِن کسان اپنے ہتھیاروں درانتیوں' رسیوں اور دوستوں کی ایک فوج کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہو گیا۔ ہاں' وہی کسان جس نے ہمیں پہلے پہل ننھے پودوں اور کونپلوں کی صورت میں زمین سے برامد ہوتے دیکھ کر آسمان کی طرف دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا تھا' جس نے ہمیں دِن کی گرمی اور رات کی تاریکی میں پانی لگائے تھے' جو ہماری گوڈی کرتا' ہمیں کھاد دیتا اور کیڑوں جانوروں سے ہماری حفاظت کے لئے دن رات ہمارے آس پاس منڈلاتا رہتا تھا۔ اِسی کو نہ جانے کیا سوجھی تھی' اِسی کو نہ جانے کس نے بھڑکایا کہ اِس کو ہماری معصومیت اور بے گناہی پر ذرا بھی ترس نہ آیا اور اسی نے درانتیوں کے شور میں ہماری آہ و فغاں اور التجا کو دفن کر دیا--- دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے تمام ساتھیوں کو تہہ تیغ کر ڈالا گیا۔ اِس دوران جب دوپہر کو دھوپ اور تھکن نے اُسے نڈھال کر دیا تو وہ کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں جا بیٹھا اور دودھ لسی مکھن شکر سے اپنی جان بنانے لگا اور دَم لے کر پھر ہم پر پل پڑا۔

صبح سے دوپہر اور سہ پہر سے شام تک درانتیوں کی چنگھاڑیں اور ہماری دھاڑیں گونجتی رہتی تھیں۔ پھر شام سے پہلے چند دوسرے لوگ جو

دُعا یا دَغا

یہ معجزہ تو صرف الیکشن کی دیا ہے
لیڈر نے جو ووٹر کو ''مرے بھائی'' کہا ہے
پھر ووٹ کو لینے کے لئے آیا بھکاری
اِس دور میں لیڈر سے بڑا کون گدا ہے
کوتاہی مری ہو تو مجھے ڈانٹ پلائے
افسر جو غلط کام کرے' اُس کو روا ہے
اِک دَور میں انصاف کا چرچا تھا جہاں میں
دیکھا تو نہیں' ہم نے بزرگوں سے سنا ہے
بس ایک ہی نقطے نے بٹھایا مرا بھٹا
کہ لفظ ''دُعا'' کو جو ''دغا'' اُس نے پڑھا ہے
وہ ناچتی محفل میں ہے' وہ تالی بجائے
بیوی میں نہ غیرت ہے' نہ شوہر میں حیا ہے
''دُر فٹے منہ'' کہہ کے گئی شوخ حسینہ
اُلفت کا کبھی میں نے جو اظہار کیا ہے
آٹا نہیں ملتا ہے تو پھر کیک ہی کھاؤ
سرکار نے غربا کو یہی حکم دیا ہے
دس' بیس ہوں چھتر' تو پڑیں بیسیوں ڈنڈے
بیمارِ محبت کی یہی ایک دواہے
خودکش جو دھماکے ہیں' وہ ہے ''سام'' کی سازش
دُنیا میں ظریف اُن سے بڑا حشر بپا ہے

پروفیسر محمد ظریف خان' گوٹھ ماچھی
دستی ہاتف: 0321-2125603

ابھی ہمارے ساتھ اِس ظلم و درندگی سے پیش نہ آئے تھے‘ وہ آ گئے۔ اُنہوں نے بھی گویا اپنے نہ آ سکنے کا ازالہ کرنے کی قسم کھائی ہوئی تھی‘ اُنہوں نے ہماری مشکیں کس کر ہمیں گٹھوں کی صورت میں باندھ باندھ کر ڈال دیا۔ نہ جانے اُنہیں یہ خوف تھا کہ ہم رات کو کہیں بھاگ جائیں گے؟

دوسری صبح جب دِن نکلا تو سونے سے بھرا کھیت سونا سونا لگ رہا تھا۔ جابجا ہمارے ساتھی گٹھوں کی صورت میں بندھے ہوئے پڑے تھے جیسے میدانِ جنگ میں شام کے بعد لاشیں بکھری پڑی ہوتی ہیں۔ ظالموں نے اِس زور سے ہماری مشکیں کس کر باندھی تھیں کہ ہماری دائیں پسلیاں بائیں اور بائیں پسلیاں دائیں طرف نکل گئیں‘ آنکھیں اُبل پڑیں اور ان کے آنسو خشک ہو گئے۔ ہونٹوں پر تالے پڑ گئے‘ ہم فریاد کرنا بھول گئے‘ ہماری آہیں سرد ہو گئیں۔ بے بسی کے احساس نے ہمیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھانا شروع کر دیا۔ ہمیں ہماری جڑوں سے جدا کر کے ہمارے گھر سے جدا کر کے بھی ظالم کسان کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ ہمیں ہماری جنم بھومی وہ کھیت جہاں ہم جھوم جھوم کر لہرا لہرا کر پلے بڑھے جوان ہوئے تھے‘ سے جدا کرنے کا مرحلہ آن پہنچا۔ تو کیا ہمارے دِل اِس وقت اِس صعوبت پر نہ روئے ہوں گے جب ہمیں ہمارے اپنوں سے الوداع کہنے کا موقعہ بھی نہ دیا گیا؟

ہمیں سروں پر‘ چھکڑوں میں‘ ٹرالیوں میں‘ گدھوں پر لاد لاد کر دور کے ایک کھلے اور وسیع میدان میں جمع کر دیا گیا۔ صاحبو! شاید یہ میدانِ حشر تھا جہاں ہم ایک بار پھر جمع کر دیئے گئے تھے‘ جہاں کہیں ایک دوسرے کے ساتھ بیتی سے آگاہ ہونے کا موقعہ مل گیا‘ جہاں ہم نے رو رو کر ایک دوسرے کے گلے لگ کر اپنی اپنی بپتا ایک دوسرے کو سنائی۔ یہاں ہم دو تین دِنوں تک کچھ کھائے پیئے بغیر پڑے رہے۔ ابھی ہمیں کھولا نہیں گیا تھا اس لئے ہم حرکت بھی تو نہ کر سکتے تھے تا ہم وقت گزاری کے لئے ہم ایک دوسرے کو نم آنکھوں سے دلاسے دیتے رہے---اِس دوران بعض دوستوں نے بتایا کہ بہت سے احباب نے گٹھوں کی منتقلی کے دوران کسی نہ کسی طرح گٹھوں سٹوں سے کھسک کر کھیت میں ہی رہنا چاہا تھا لیکن کسان کے بچوں اور خاتونِ خانہ نے اِن کی یہ چال کامیاب نہ ہونے دی اور کھیت میں گرے پڑے اِن بدنصیبوں کو جھاڑو مار مار کر کھیت کے کونوں کھدروں اور دراڑوں سے بھی نکال لیا۔

اُدھر کی سنیئے۔ تیسرے چوتھے روز ایک بڑے بڑے ٹائروں والی خوفناک مشین ہمارے پاس آ کر غرانے لگی۔ اِس کے ساتھ ایک دوسرے ڈھانچہ کی طرح مشین کو پٹہ لگا کر منسلک کر دیا گیا جس میں متعدد پلیاں اور پہیے بے تحاشا رفتار سے گھومتے نظر آنے لگے اور یہ کوئی مشین تھی جس کے ظلم کا بیان کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ظالموں نے ہمیں نفسیاتی طور پر توڑنے کا کوئی بھی موقعہ ضائع نہیں کیا۔ اُنہوں نے ہمیں پانی پلا پلا کر مارنا جاری رکھا۔ مثلاً پہلے ہمیں گٹھوں سے کھول دیا۔ اتنے دِنوں کے بعد ہمیں تھوڑی آسودگی نصیب ہوئی تو ہم نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ شاید اب ہمارے بُرے دِن ختم ہوئے لیکن ظالموں نے ہمیں تھوڑا تھوڑا کر کے اِس ظالم سماج جیسی مشین کے منہ میں دینا شروع کر دیا اور اِس مشین نے نسیم حجازی صاحب کے ناول کی اکوی زیشن والی گلوٹین کے مظالم کو شرما دیا۔

سب سے پہلے اِس نے ہماری ہڈی پسلی ایک کر دی‘ پھر ہمارے کپڑے اُتار لئے۔ جیسے کوئی غریب مقروض کے کپڑے اُتار لے اور ہماری کھال اِس زور زبردستی سے اُتاری کہ ایسی زبردستی تو مشرف صاحب کی وردی اُتارنے میں بھی نہ ہوئی ہو گی۔ ہماری چیخ و پکار اور رونے دھونے کے ساتھ ہی اِس ظالم دیو کی چنگھاڑیں اور قہقہے اور بلند ہو جاتے تھے۔ لگتا تھا ہم پرانے وقتوں کے مجرم ہیں جنہیں کسی ناقابل معافی بھیانک سنگین جرم کی پاداش میں کولہو پلوانے کی سزا سنائی گئی ہو۔ اقبال نے شاید اِس پر ہی فرمایا تھا کہ---

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اِس مشین میں پردے کا انتظام تھا ورنہ اِس زور زبردستی میں ہمارے تو تمام کپڑے تک اُتار لئے گئے تھے جس پر شرم کے مارے مر جانے کو جی چاہتا تھا لیکن جہاں حمام میں سب ننگے پھرتے ہوں‘ کسی کو کسی پر اُنگلی اُٹھانے کی فرصت کہاں ہوتی ہے؟ لیکن پھر بھی ہم لوگوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں کہ شرم تو آتی ہی ہے--- پھر اچانک تیز روشنی نے ہمیں زبردستی آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ ہم نے دیکھا کہ مشین کے ایک طرف لگے ہوئے دہانے سے جو مسلسل جھوم رہا تھا جیسے بدمست شرابی نشے میں جھومتا ہے‘ ہمارے تمام دوست نیچے گرائے جانے لگے۔ وہ بھی قدرتی لباس میں اور سب لوگ بے حیاؤں کی طرح ہمیں ایک دوسرے پر گرتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے‘ جہاں ہمارے نیچے گرنے کی جگہ پر بالٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جب ایک بالٹی بھر جاتی تو اُسے ہٹا کر دوسری رکھ دی جاتی لیکن ظلم کی یہ داستان یہاں ختم نہیں ہوئی لیکن ظالموں کی تسلی ابھی نہیں ہوئی‘ مظلوموں کی خلاصی ابھی نہیں ہوئی۔

ہم مجبور و بے قصور مخلوق کے اِس حال پر کسان اور اُس کے ونگارو ساتھی ایسے حسرت کا اظہار کرتے پھر رہے تھے جیسے کوئی قابل فخر کارنامہ

انجام دے چکے ہوں۔ بھلا نہتے اور بے ضرر "دانوں" پر اِس قدر عرصۂ حیات تنگ کر دینا کون سی مردانگی کی بات ہے؟ ہمارا ایک ڈھیر لگا دیا گیا جیسے چنگیز خان کے ساتھی جنگ میں فتحیاب ہونے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کے سروں کے مینار بنا دیا کرتے تھے اور جس کا مینار جتنا بلند ہوتا' اُسے اُتنی عزت دی جاتی۔ ہمارے ساتھ یہ ظلم روا رکھنے والے بھی اپنی کامیابی کی پیمائش کرنا چاہتے تھے' اُنہوں نے ہمیں ڈھیر کی صورت میں انبار لگا۔نے کے بعد میں تولنا شروع کر دیا۔ ترازو لے کر میزانِ عدل کی طرح اِس میدانِ حشر میں میزانِ ظلم قائم کر دیا اور ہمیں تول تول کر بوریوں میں قید کر دیا گیا اور بوریوں کو اوپر سے کس کر سی دیا گیا۔ ہمیں یوں تاریک اور تنگ بوریوں میں ٹھونس دیا گیا کہ ایسا تو گوانتانا موبے کے قیدیوں کے ساتھ بھی نہ کیا گیا ہو گا جو افغانستان سے کنٹینرز میں بھر کر لے جاتے ہوئے دَم گھٹنے سے مر گئے تھے--- آہ' ظالم کسان نے کس بے پروائی سے ہمارے نوٹ کھرے کر لئے اور ہمیں بیوپاریوں کے ہاتھوں بیچ ڈالا۔

جس طرح ڈبے کو تنکے سے تحفظ کی اُمید لگ جاتی ہے' اِسی طرح ہمیں بھی یہ اُمید ہو چلی کہ جن لوگوں نے اپنی جیب سے ہمارے لئے خرچہ کیا ہے' وہ یقیناً ہمیں عزت و توقیر دیں گے اور بہتر سلوک کریں گے۔ یہی خوش فہمیاں ہی تو اُمید کا دامن چھوڑنے نہیں دیتی ہیں۔ اگرچہ خوش فہمیاں بہت جلد ہوا ہو جانے والی ہوتی ہیں لیکن جب اِن بیوپاریوں نے ہمیں آگے جا کر منڈی میں دکانداروں کو' مل والوں کو آڑھتیوں کو بیچ دیا تو گویا ہمارے بکنے اور بیچے جانے کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا تاہم بعض ایسے مواقعہ بھی آئے جب ہم میں سے بعض ساتھیوں کو اپنے ساتھ ہونے والے اِس مسلسل ظلم کا مداوا کرنے کا تھوڑا بہت چانس مل جاتا۔ مثلاً اگر کسی بیوپاری یا دکاندار کے گھر یا دکان سے اِس کے کسی بکرے دنبے نے ہمیں نگل لیا' اِسے ہم نے اندر ہی اندر اتنا بے قرار کیا کہ اُس نے دوڑ کر پانی کو جا منہ لگایا اور پانی ملتے ہی ہم نے اُس کے پیٹ میں پھول پھول کر اُس کو ابھارا کر دیا جس سے اکثر بکروں مینڈھوں کو چھری بھی نصیب نہ ہو سکی۔ اگرچہ یہ ہماری طرف سے اُن بے گناہ جانوروں کے ساتھ ظلم قرار دیا جائے گا لیکن ہم اِس لئے خود کو حق بجانب سمجھنے کے لئے یہ دلیل دیں گے کہ بکرے مینڈھے کا ہم نے کیا بگاڑا تھا جو اُس نے ہمیں کھا لیا اور پھر دکاندار یا بیوپاری یا کسان کے ظلم کا بالواسطہ جواب بھی تو دینا تھا۔ چنانچہ ہماری اِس خودکش کوشش کے نتیجے میں اکثر گھروں سے یہ فقرے فعل ماضی مکمل کے صورت میں سننے کو ملے کہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے بکرا مر چکا تھا' وغیرہ--- ہاں تو بات ہو رہی تھی دکان سے ہمارے گھروں میں منتقل کئے جانے کی۔ مثلاً دکاندار نے اپنے گھر بھجوا دیا یا کوئی خرید کر اپنے گھر لے گیا۔

اب یہاں پھر ایک ڈرامہ ہمارا منتظر تھا۔ نجانے اِن گھر والوں کو ہم سے کیا خار تھی جوان کی خواتین نے اوکھلی ڈنڈے سے پیٹنا شروع کر دیا۔ تب ہمیں اِس بات پر حیرت ہوئی کہ جو مائی خود اپنے سر سے دوپٹہ نہیں سرکنے دیتی تھی اور گلی میں کسی مرد کی آواز پر بھی جھٹ سے گھونگھٹ نکال لیتی تھی' اُس نے ہمیں اوکھلی میں پیٹ پیٹ ہمارے رہے سہے کپڑے بھی اُتار دیئے۔ اب بھلا ہم نے جہاں پہلے اتنے بے رحم

شغل + مغل

✿ بیس کلو کی لیدر کی جیکٹ پہننے والے مونچھوں کا وزن نہیں اُٹھا سکتے --- نازیہ ناز نازی
☆ حالانکہ صنفِ نازک ہونے کے باوجود لڑکیاں بیس بیس کلو میک اَپ کا وزن اُٹھائے پھرتی ہیں۔
✿ عورت اور موسیقی کبھی پرانے نہیں ہوتے --- (ایک دانشور) --- نازیہ ناز نازی
☆ اور دونوں دردِ سر کا باعث بھی تو ہوتے ہیں۔
✿ ہر مرد عقلمند نہیں ہوتا کچھ شادی شدہ بھی ہوتے ہیں۔
☆ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ اولذکر میں سے ہیں یا آخرالذکر میں؟
✿ اپنی بیوی کے سامنے جو اِک لفظ نہیں بول سکتے' وہ چاند میں عورتوں کے خلاف لکھتے ہیں --- نازیہ ناز نازی
☆ بیویاں کتنی ظالم ہوتی ہیں' اندازہ کیجئے۔
✿ بینک بیلنس بہت سے بدصورت لوگوں کو شادی شدہ بنا دیتا ہے --- بدر سعید
☆ ہماری طرف سے بھی شادی کی مبارک ہو۔
✿ بیوی کو سیدھا کرنے کا واحد حل --- مولا بخش یعنی ڈنڈا --- سیّد محمود گیلانی
☆ مگر فی زمانہ اِتنی بہادری دِکھائے کون؟
✿ جانے کیوں یہ مرد شوہر بن کر "ہلاکو خان" کیوں بن جاتے ہیں --- نازیہ ناز نازی
☆ بیویاں بھی تو "پھولن دیوی" بن جاتی ہیں' نا!
✿ فضول خرچی کی بچ پر عورت عمدگی سے بیٹنگ کرتی ہے --- توصیف احمد
☆ اور مرد بے چارہ باؤلنگ کروا کروا کر ہلکان ہو جاتا ہے۔
✿ اور یہ مرد جو اپنے ہر اُلٹے کام کو مجبوری کا نام دیتے ہیں --- نازیہ ناز نازی
☆ یہاں اُلٹے کام سے مراد "شادی" ہی ہے' نا!
✿ شادی سے پہلے مرد مہربان اور بعد پورا شیطان ہوتا ہے --- نازیہ ناز نازی
☆ بعد میں شیطان کی خالہ سے جو واسطہ پڑھ جاتا ہے۔
✿ شادی کے بعد ہر لڑکی نیک ہو جاتی ہے کیونکہ وہ شوہر کو دیکھ کر "استغفراللہ" پڑھتی رہتی ہے۔
☆ گویا تسلیم ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی بد ہوتی ہے؟
✿ فٹ بال کا کھیل اِس لیے ایجاد کیا گیا تاکہ مرد لاتیں مارنے کا شوق پورا کر لیں --- فرحین
☆ اور عورتوں نے مرد کو ہی فٹ بال سمجھ رکھا ہے۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

حالات دیکھی تھے وہاں اِن ظالم پتھروں سے کیا اُمید وفا رکھتے؟

آپ شاید سوچ رہے ہوں کہ اب دانے اور اِنسان کی یہ کہانی اب ختم ہوگئی؟ آخر آپ بھی ٹھہرے ایک اِنسان۔ ارے میاں! اِنسان کی دُشمنی اتنی جلدی کہاں ختم ہونے والی ہے؟ مسلمان مرنے والے کو دفنا کر اور ہندو جلا کر مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن حضرتِ اِنسان ہمیں پیس کر آٹا بنا دینے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں پیس کر ہڈیوں تک کو سرمہ بنا دیتا ہے اور اِس پر مطمئن نہیں ہوتا تو پھر ہمارے لاشے پامال کرتا ہے۔ ہمارے جوڑ جوڑ کو الگ کرتا ہے۔ آٹے سے چھان بورا جدا کر دیتا ہے، یہی نہیں، کچھ کا آٹا کچھ کی سوجی اور کچھ کا میدہ بنا دیتا ہے۔ بات یہاں بھی ختم ہو جاتی تو ہم ''خس کم جہاں پاک'' کہتے لیکن نہ جانے کون سا ایسا جرم ہمارے کھاتے میں لکھ دیا گیا تھا کہ جس کی سزا ابھی بھی مکمل نہیں ہو رہی تھی، کون سی کسر ابھی نکل نہ پائی تھی؟ جانے کس نے کہہ دیا تھا کہ ''ظلم جب حد سے گزرتا ہے تو مٹ جاتا ہے'' یہاں تو ظلم پر ظلم بڑھتا اور ترقی ہی کرتا جاتا تھا۔

ہم نے آٹا مشین کے اندر تاریک پتھروں کی غار میں ہنگامی میٹنگ میں یہ عہد کیا تھا، ایک قرارداد پاس کی تھی کہ جو بھی ہو، ہم اپنے اصل سے جدا نہ ہوں گے لیکن حضرتِ اِنسان کو ہمارے ایسے ہر ارادے سے چڑ تھی جس سے تھوڑی سی بھی بوئے بغاوت جھلک ہی آتی تھی۔ چنانچہ ہمارا آٹا گھروں میں لایا گیا اور کچن میں رکھا گیا۔ ڈرم میں ڈالنے سے پہلے ہمارے ماس کو ہڈیوں سے جدا کرنے کے لئے چھلنی چھلنی کر دیا گیا۔ ہمارا آٹا بھوسہ الگ کر دیا گیا۔ پھر ہمیں پرات میں پانی میں ڈال کر ڈبویا گیا۔ ہم ایک عرصہ سے ظلم و پیاس کا شکار تھے، ہمارے آٹے نے بھی پانی پینا شروع کر دیا اور پانی ڈالا گیا، ہم خوش ہوئے اور شکرانے کے دو بول ادا کرنے ہی لگے تھے کہ خاتونِ خانہ نے آستین چڑھالی اور ہم پر مکوں گھونسوں سے ٹوٹ پڑی۔ ہمیں رگید رگید کر رکھ دیا۔ ہمیں ایک دوست نے بتایا تھا کہ بعض جگہوں پر تو لاتوں سے بھی گریز نہیں کرتے۔ خیر، ہمیں اِس خاتونِ خانہ خراب نے اِس بے دردی سے پانی پلا کر مارا کہ ہماری ساری اکڑفوں ختم ہوگئی اور ہم نے لئی کی شکل اختیار کر لی۔ اِس مسلسل ورزش سے وہ خود بھی کچھ تھک سی گئی تو ہمیں دوسری پرات میں ڈھیر کر کے ہانڈی کی طرف متوجہ ہوئی اور ہمیں اِس طرح کچھ سانس لینا نصیب ہوا۔ اب ایک نیا کھیل شروع ہوا۔ ہمیں پیڑوں کی شکل دی گئی۔ پھر ہمیں تنور پر بھیجا گیا۔ وہاں ایک ظالم نے آگ جلا جلا کر جہنم تیار کیا ہوا تھا۔ ہم نے سمجھا کہ شاید آج تک ہم پر جو گزری ہے، وہ محض عذابِ قبر اور برزخ تھا۔ آج اصل قیامت اور آخر میں جہنم پر بات ختم ہونے والی ہے۔

تنور پر ہمارے پیڑوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں ہوا۔ یہی نہیں کہ ہمارے پیڑوں کو تھپیڑ مار مار کر پھلکا روٹی کر دیا گیا بلکہ جلتے جہنم تنور کی انگارہ دیواروں سے چپکا دیا۔ بعض پیڑوں کے پھلکے تپتے توے پر بھی دھرے گئے۔ اِن پر مزید طرح طرح کے گھی اور تیل ڈال کر انہیں تل دیا گیا۔ نیچے آگ کے الاؤ روشن شعلے لپک لپک کر ہمیں پکڑنے کو دوڑتے نظر آتے۔ ہم تنور کی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو رہے۔ شاید ایک طرف آگ اور دوسری طرف دیوار ایسے ہی موقعوں کے لئے بولا جاتا ہے؟---ہمارے بعض کمزور بہن بھائی تو زیادہ دیر دیوار سے چمٹ کر نہ کھڑے رہ سکے اور گر کر شعلوں کی نذر ہو گئے۔ باقی جو قدرے مضبوط اعصاب کے مالک تھے اُنہیں مائی نے خود سوئے کنڈی کی مدد سے باہر نکالا۔ اُدھر توے والی مائی جب ہمیں ایک طرف سے اچھی طرح جلا لیتی تو پھر دوسری طرف بھی جلانے کے لئے توے پر ہمیں پلٹنی دے دیتی اور اِس پر بھی بس نہیں صاحبو! ہمیں اخبار، کاغذ، شاپروں، رومالوں میں لپیٹ کر چھابڑیوں، چنگیروں میں ڈال کر بچوں گھر والوں اور مہمانوں کے آگے اِس طرح ڈال دیا جاتا جس طرح یونانی بادشاہ یا سندھ کے وڈیرے غریبوں کو شیروں یا کتوں کے آگے ڈال دیتے ہیں۔ کمزور بوڑھے، معصوم بچے، پڑھے لکھے نوجوان اور فیشن ایبل لڑکیاں اور خواتین جو بات بات پر ناک پر اُنگلی دھر کر ہر چھوٹے سے چھوٹے ظلم و زیادتی پر پریس کانفرنسیں بلا لیتے تھے، جو خلوص اور اَمن کے لیکچر دیتے نہ تھکتے تھے، جن کی اِس تبلیغ میں دانت تک گر چکے تھے سب کے سب دانہ دُشمنی میں ایک جیسے ثابت ہوئے۔ ہمارے لئے کسی نے جھوٹے منہ بھی ہمدردی کا ایک بول نہیں نکالا۔ سب جس قدر ممکن ہوا، ہم پر ٹوٹ پڑے اور ہمیں چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔

ہمارے کئے گئے ٹکڑوں سے مزید بدلہ لیتے ہوئے اور چھوٹے ٹکڑے کر دیئے اور منہ میں ڈال کر اپنے تیز دانتوں سے ہمیں کترنا شروع کر دیا۔ بوڑھے جن کے دانت نہیں تھے، وہ ہمیں اپنے پلپلے منہ میں پرانے مسوڑھوں سے ہی مشقِ ستم بنانے لگے۔ آخر جب خوب پیٹ بھر گیا تو بچے کھچے ٹکڑے کتے بلی اور مرغیوں کوؤں کو ڈال دیئے گئے تاکہ کوئی نفس ہماری موت کا ذائقہ چکھنے سے رہ نہ جائے لیکن ایک سوال ابھی بھی جواب طلب ہے جو ہم آپ سے کرتے ہیں کہ آخر ہمارا مقصد کیا تھا؟ ہم سے حضرتِ اِنسان اور اِس کی صحبت میں رہنے والوں کے اِس بے حد و حساب بغض اور عناد کا سبب کیا ہے؟

☆☆

پاپڑ کرارے

طلاق میلہ

نعیم نیازی

''آسٹریا میں ازدواجی زندگی سے اُکتائے طلاق کے خواہشمند جوڑوں کے لئے دُنیا کا پہلا ''طلاق میلہ'' ویانا میں منعقد ہوگا۔''

یہ خبر مغرب' یعنی گورے کے دیس سے آئی ہے جبکہ قاری مشرقی یعنی کالا ہے۔ چنانچہ کالا قاری اس خبر سے ششدر گیا ہے۔ اِس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ آیا اِس خبر پر خوشی کا اظہار کرے یا برہمی کا؟ --- یورپ کی بات اور ہے ہماری روایات اور بلکہ یہاں تو صورتحال یکسر مختلف ہے۔ ہمارے ہاں میلے ٹھیلے مسرت و شادمانی کا سمبل ہیں۔ روزمرہ زندگی کی یکسانیت جب بوریت میں بدل جائے تو اِس قسم کے ہلا گلا کا انتظام کیا جاتا ہے' بالفاظِ دیگر یہ سماجی ٹینشن دور کرنے کا ایک بہانہ ہیں۔ جہاں تک طلاق یا علیحدگی کا تعلق ہے تو ہمارے معاشرے میں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اگر کوئی من چلا یہاں پر ''طلاق'' انجوائے یا ''سیلیبریٹ'' کرنے کے لئے طلاق میلے کا انعقاد کی بات کرے تو سمجھو اُس کی شامت آگئی۔ لوگ اُسے احمق کہہ کر پکاریں گے اور کچھ اس پر ترنت فتوے کا میزائل دے ماریں گے۔

دیکھا جائے تو شادی کنوارگی کی ''رحلت'' ہے۔ پہلے پہلے تو فریقین کو اس رحلت میں بھی راحت ملتی ہے لیکن پھر جلد ہی یعنی رحلت کے چہلم تک یہ مسرت' اذیت میں بدل جاتی ہے۔ زمانہ تجرد والی بے فکری یاد آتی ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جی چاہتا ہے' نکاح کا بندھن توڑ کر پھر سے آزاد زندگی کے مزے لوٹیں لیکن مصلحتیں آڑے آجاتی ہیں چنانچہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتے ہیں۔ اپنے معاملات کی ڈور دستِ قدرت کو پکڑاتے ہیں اور تائید غیبی کے انتظار میں گھڑیاں گننے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ نسبتاً زیادہ خوش نصیب ہوتے ہیں۔ عائلی ہتھکڑی ان کے ہاتھ میں لگتی تو ہے لیکن جونہی بے زاری کی حد شروع ہوتی ہے' غیب سے امداد کا سامان مہیا ہو جاتا ہے اور ازدواجی ہتھکڑی ''چھن'' سے ٹوٹ جاتی ہے لیکن بیشتر ازلی بدنصیب ایسے بھی ہیں جو اس قسم کی تائید غیبی سے سالہا سال تک محروم رہتے ہیں۔

ایک صاحب ایسے ہی تھے۔ اِن کا ایک کلاس فیلو پانچ چھ سال بعد انہیں ملا تو اِس کی کھلی کھلی رنگت دیکھ کر ششدر رہ گئے' چھوٹتے ہی سوال کیا۔

''ارے میاں! کمال ہے۔ تم آج بھی تروتازہ لگتے ہو۔ بالکل کالج سٹوڈنٹ کی طرح --- مہ و سال نے تمہارا کچھ بھی تو نہیں بگاڑا؟''

''جی ہاں --- ہماری اس ہشاش بشاش طبیعت کا راز بے فکری میں پوشیدہ ہے۔''

''بے فکری سے کیا مطلب ہے تمہارا --- تم نے شادی وادی کر لی ہے یا ---؟''

''ففٹی ففٹی ---''

''یعنی ---؟''

''یعنی یہ کہ مابدولت آدھے کنوارے ہیں' آدھے شادی شدہ ---''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ --- پہیلیاں نہ بھجواؤ' یار! صاف صاف بتاؤ ---''

''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ منگنی ہوتی ہے' پھر ٹوٹ جاتی ہے ---''

''پھر تو بڑے نصیبوں والوں ہو' بھئی --- ایک ہم ہیں کہ گزشتہ دس گیارہ برس سے سزائے عمر قید کاٹ رہے ہیں' رہائی کا دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آتا ---'' دوست نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

ہمارے ہاں بھی طلاق کی شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے غریب کے بچوں کی طرح۔ اس کی وجہ اکثر اوقات ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی۔ اگر آپ خواتین کی طرف سے تنسیخ نکاح' یعنی خاوند سے حصول طلاق کے دعویٰ جات پر ایک نظر ڈالیں تو طلاق حاصل کرنے کی وجوہات میں یہی عنصر غالب نظر آئے گا۔ کسی زمانے میں دوسروں کی آنکھ میں دُھول جھونکنے کے لئے خواتین جو عذر لنگ تراشتی تھیں' اس میں خاوند کا نکھٹو ہونا اور بیوی پر تشدد کرنا وغیرہ شامل تھے لیکن اب یہ بہانے پرانے ہو گئے ہیں' اب تو نئے عذر تراشے جاتے ہیں۔ ایک بنتِ آدم نے طلاق حاصل کرنے کے لئے جو دعویٰ دائر کیا' اس میں بڑی دلچسپ وجہ تحریر کی۔ جو کچھ یوں ہے۔

''میرا خاوند اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ میں' میرا خاوند اور میرے ساس سر ایک ہی چھت تلے اکٹھے رہتے ہیں۔ میرے پاس جہیز میں ملنے والے ملبوسات' زیورات اور میک اپ کا کافی سامان موجود ہے لیکن میری ساس گھر میں آئینہ رکھنے کی شدید مخالف ہے۔ دراصل محترمہ خاصی بدصورت واقع ہوئی ہے' اوپر سے لقوے نے اِس کا منہ ٹیڑھا کر دیا ہے اسے آئینوں سے اتنی چڑ ہے کہ میں جو آئینے اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھی' وہ بھی ساس صاحبہ نے غائب کر دیئے ہیں۔ میں نے وقتاً فوقتاً شاپنگ کر کے خود بھی کئی بار آئینے خریدے ہیں لیکن گھر آتے ہی وہ آئینے ساس جی نے مجھ سے چھین لئے اور میری نظروں کے سامنے چکنا چور کر ڈالے۔ بیش قیمت ملبوسات' زیورات اور کاسمیٹکس کا استعمال بغیر آئینے کے ممکن ہی نہیں ہے۔ چنانچہ میں عملی طور پر آرائش و زیبائش کے حق سے محروم ہو چکی ہوں۔ اس جبری محرومی نے مجھے ذہنی مریضہ بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے اپنے خاوند سے نفرت ہو گئی ہے لہٰذا بربنائے خلع مجھے اپنے شوہر سے طلاق دلائی جائے۔''

اسی طرح ایک خاتون ایک نومولود بچہ اُٹھائے ایک وکیل کے دفتر میں آئی اور بولی۔

''وکیل صاحب! میں اپنے خاوند سے طلاق لینے کے لئے دعویٰ دائر کرنا چاہتی ہوں۔''

وکیل نے دعویٰ کا مسودہ تیار کرنے کے لئے

وجوہ پوچھیں تو خاتون کی آواز بھرا گئی۔

''میرا خاوند پرلے درجے کا بیوفا اور دھوکہ باز آدمی ہے' اس نے ہمیشہ میرے ساتھ فراڈ کیا ہے۔''

''اگر یہ بات سچ ہے تو پھر عدالت کا فیصلہ یقیناً آپ کے حق میں ہوگا۔''

''میں غلط نہیں کہہ رہی' اس نے واقعی میرے ساتھ چار سوبیسی کی ہے---''

''ذرا اس دھوکے کی تفصیل مجھے بتادیں تاکہ میں عدالت میں ٹھوس ثبوت پیش کرسکوں---''

''وکیل صاحب! فراڈ کا یہ ثبوت کیا کم ہے کہ وہ میرے اس ''بچے'' کا باپ نہیں ہے---''

طلاق صرف ارینجڈ میرج والے جوڑوں میں ہی نہیں ہوتی بلکہ ''لومیرج'' والے جوڑے بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں ہیں۔ ''لو'' یعنی محبت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اندھی ہوتی ہے۔ فلاسفر اس کہاوت پر اختلافی رائے رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ محبت دراصل نوزائیدہ پلے کی طرح ہوتی ہے۔ جس طرح ابتدا میں پلے کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور پیدائش کے چند دن بعد کھلتی ہیں تو اسی طرح محبت بھی شادی سے پہلے اندھی ہوتی ہے۔ شادی کے کچھ دن بعد جب آنکھیں کھلتی ہیں اور پریمی (اب دولہا دلہن) ایک دوسرے کا اصل روپ دیکھتے ہیں تو چلا کر پکار اٹھتے ہیں کہ ہائے' ہم نے یہ کیا کیا' یہ کس بدصورت بلا کو اپنے گلے کا طوق بنالیا؟ چنانچہ اپنی بھول کی تلافی کے لئے وہ طلاق کا راستہ اپناتے ہیں۔

بیشتر طلاقیں ایسی ہوتی ہیں جن کا محرک بدصورتی ہے' یعنی بیوی یا خاوند میں سے کوئی ایک بدصورت ہوتا ہے اور دوسرا خوبصورت۔ اگر دولہا دلہن دونوں بدصورت ہوں تو پھر کوئی ''رولا'' نہیں ہوتا بلکہ زوجین یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ بالفاظ دیگر---

قدر الو کی الو جانتا ہے
ہما کو کب چغد پہچانتا ہے

دولہا نے حجلۂ عروسی میں جونہی گھونگھٹ اٹھایا تو اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ دولہا کی بصارت 6x6 تھی۔ بیوٹی پارلر والے نصف درجن بیوٹیشنز کی محنتِ شاقہ بھی اس کی آنکھوں میں دھول نہ جھونک سکی۔ اس نے پہلی نظر میں ہی دلہن کے ناتناسب ''اوریجنل'' خدوخال بھانپ لیے۔ ایک آہ سرد کھینچی اور سرد مہری سے بولا۔

''ہائے ری قسمت' وائے رے نصیب--- ہمارے لئے ایسی واجبی صورت والی دلہن ہی رہ گئی تھی؟''

دلہن برابر کی چوٹ تھی۔ وہ پہلے ہی دزدیدہ نگاہ سے دولہا میاں کا درشن کرچکی تھی حالانکہ اس نے اپنا چہرہ سہرے کی لڑیوں میں چھپایا ہوا تھا۔ اس نے پھرتی سے ایک چھوٹا سا آئینہ اپنے چرمی پرس سے نکالا اور دولہا کو دکھاتے ہوئے بولی۔

''سرتاج! جوڑ برابر کا ہے۔''

یہ کھرا جواب سن کر دولہے میاں کا دماغ ٹھکانے آنا یقینی تھا۔ اس نے صورتحال کو بھانپ لیا اور شرمساری سے بولا۔

''ڈارلنگ! میرے خیال میں ایک دوسرے کی شکل وصورت پر ہمیں کمپرومائز کرلینا چاہئے۔''

فلاسفر کا خیال ہے کہ اگر طلاق سے بچنا ہے تو پھر یوں کریں کہ شادی سے پہلے متوقع جوڑے کے لئے آئی ٹیسٹ یعنی ''بصارت کا معائنہ'' لازم قرار دے دیں۔ جس فریق کی نظر کمزور ہو' وہ تجویز کردہ نمبر کا چشمہ یا لینز لگوالے اور تب ہی تین بار ''قبول ہے'' کا مرحلہ طے کرے ورنہ سودے میں خسارے کا امکان رد نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے بھی یہ تجویز بری نہیں ہے کیونکہ اب تو معاشرے میں روشن خیالی پیدا ہو چکی ہے اور دولہا دلہن کا شادی سے قبل ایک دوسرے کو دیکھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اب تو ''پروپوز'' کرنے سے پہلے ہی فریقین ایک دوسرے کا مزاج خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیتے ہیں۔

کوئی سا بھی موسم ہو' مغربی میڈیا میں طلاقوں کی بہار آئی رہتی ہے بلکہ وہاں پر تو ہر طلاق کا باقاعدہ جشن منایا جاتا ہے۔ جیسا کہ کالم کی ابتدائی سطور میں بیان ہوا ہے۔ مغربی خواتین طلاق یافتہ ہو کر پھولے نہیں سماتیں۔ طلاق ان کے لئے لاٹری سے کم نہیں ہوتی۔ نہ صرف انتہائی معقول رقم شوہر کی طرف سے انہیں مل جاتی ہے بلکہ ایک معاشرتی بندھن کی مضبوطی آزمانے کا ایک تجربہ بھی انہیں حاصل ہو جاتا ہے۔ پہلا تجربہ اگر ناکام بھی ہو جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ سیانے لوگ دوسرے تیسرے تجربے میں پہلے والی ناکامی کی کسر پوری کر لیتے ہیں' علاوہ ازیں طلاق کے نتیجے میں ملنے والی رقم سے نئی شادی بھی رچائی جاسکتی ہے۔ ادھر طلاق دینے والا مرد بھی کچھ کم شاداں نہیں ہوتا۔ ''عمر قید'' سے رہائی جس قیمت پر بھی ملے' کم ہے۔

یوں تو سارے غیر ملکی اداکار اور اداکارائیں طلاقوں کے رسیا ہیں لیکن ہالی وڈ کی ہیروئن الزبتھ ٹیلر ٹاپ پر نظر آتی ہیں اور سچ پوچھئے تو فلم سے زیادہ شہرت انہیں پے در پے طلاقوں سے ملی ہے۔ یعنی طلاق' پھر شادی' پھر طلاق' پھر شادی پھر طلاق' پھر شادی--- کیسا دلچسپ سائیکل (چکر) زندگی بھر چلائے رکھا--- ہمارے کئی سیاستدان اور فلمی اداکار بھی اسی کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک سیاستدان نے کچھ عرصہ قبل آٹھویں شادی کی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ آٹھویں بار ہی اپنی سیاسی جماعت بھی چھوڑی ہے۔ یعنی اپنی سیاسی اور ازدواجی طلاقوں کی تعداد میں کامل مساوات برقرار رکھی ہے۔ ویسے ان کی یہ آٹھویں ''ٹرائی'' کچھ زیادہ پائیدار لگتی ہے جبھی تو تاحال برقرار ہے--- چھوٹی سکرین یعنی ٹی وی کی ایک اداکارہ نے بھی گزشتہ دنوں اپنے چوتھے خاوند سے طلاق لی ہے' اس اداکارہ نے ان طلاقوں میں خوب مال بنایا ہے۔

ازدواجی طلاق کی طرح ایک جمہوری طلاق بھی ہمارے ہاں رائج ہے جسے آٹھویں ترمیم نے جنم دیا اور جسے 58-2B کہا جاتا ہے۔ جمہوریت' جب اپنے پاؤں چادر سے باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہے تو اسی 58-2B کا نعرۂ مستانہ بلند کرکے اسے طلاق دے دی جاتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس بار آنے والی جمہوریت اس زہر قاتل سے آلودہ ہونے نہ پائے' آمین!

☆☆

چاند نگر

مختلف موضوعات پر ہنستی مسکراتی، کھلکھلاتی ننھی تحریریں

''چاند نگر'' ایسی شوخ تحریروں سے آباد ہوتا ہے جو طوالت کے لحاظ سے ''نابالغ'' لیکن شوخی اور شرارت میں بالغ ہوتی ہیں۔ آپ بھی اس میں جگہ حاصل کر سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ آپ کی تحریر میں مزاح کوٹ کوٹ کر بلکہ ٹھونس ٹھونس کر بھرا گیا ہو۔ یہ خیال بھی رکھئے کہ یہ مسکراہٹیں آپ کی اپنی تخلیق ہوں، کہیں سے اڑائی نہ جائیں۔ اپنے مختصر مضامین اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج ''چاند نگر'' تیس روزہ ''چاند''، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ لاہور 54600

مظلوم لڑکی

امجد علی آرزو، نواب شاہ

مجھے آج تک وہ دن یاد ہے جب ''صاحب'' نے مجھے ڈانٹا تھا اور بڑا زور سے ڈانٹا تھا۔ وہ میری نوکری کا تیسرا ہی دن تھا--- غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ یقیناً ہر کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے۔ بس مجھ سے بھی غلطی ہوگئی اور ''صاحب'' نے اس پر ایسی ڈانٹ پلائی کہ میں نے تین دن تک نہ میک اپ کیا، نہ نیل پالش لگائی اور نہ اونچی ہیل والے سینڈل پہنے۔ یہاں تک کہ میں نے تو میچنگ کلر کے کپڑے بھی نہ پہنے۔ افسوس بس اس بات کا تھا کہ غلطی کس سے نہیں ہوتی---؟ لوگوں سے تو بڑی بڑی غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ میں نے تو صرف ڈکٹیشن میں معمولی سی غلطی کر دی تو صاحب نے غصہ سے کہہ دیا۔

''مس تمنا! آئندہ احتیاط کیجئے گا۔''

اب بتائیے اتنا رعب بھرا جملہ کون برداشت کر سکتا ہے لیکن مسئلہ تو نوکری کا ہے، اگر میں ایک دفعہ چھوڑ دیتی تو پھر ساری عمر افسوس کرتی رہتی لیکن نوکری نہ ملتی۔ آخر نوکری ہے کوئی محبوبہ نہیں کہ تو نہ سہی اور سہی اور نہ سہی تو اور سہی--- بہرحال میں نے اسی دن ''انجمن'' کی طرح چیخ چیخ کر قسم کھائی تھی کہ صاحب سے اپنی انسلٹ کا بدلہ ضرور لوں گی۔ صاحب کے نخرے بھی تو ایسے تھے۔ چائے آتی تو میں بناتی، پانی پیتے تو میرے ہاتھوں سے اور کبھی کبھی تو کھانا پکانے تک کو کہہ دیتے۔ اب آپ ہی بتائیے، یہ کہاں کا انصاف ہے---؟''

میرا نام بھی ''تمنا'' ہے۔ میرے اباجی کا کہنا تھا کہ میں بڑی لکی ہوں۔ جس دن میں پیدا ہوئی بقول ابو کے اس دن تیسری جنگ عظیم جس کے لئے امی جان نے فل تیاری کر لی تھی، ٹل گئی اور وہ بھی میرے کو دنے کی وجہ سے۔ دراصل امی جان ان پکچر کی ضد کر رہی تھیں جبکہ ابا جان مان نہیں رہے تھے۔ امی جان کا کہنا تھا کہ وہ ''لڑاکی ٹمیار'' ضرور دیکھیں گی۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ اباجان شام تک ہیروشیما بن چکے ہوتے مگر میں درمیان میں اقوام متحدہ کی مثل اس طرح کودی کہ سارا مسئلہ حل ہوگیا۔

اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ میں خوش قسمت ہوں لیکن اب ''صاحب'' سے بدلہ لینے کے لئے بھی مجھے اپنی خوش قسمتی کو آزمانا تھا۔ ویسے بھی اللہ کے فضل سے میں کافی ذہین اور سلیقہ شعار واقع ہوئی ہوں، بس ذرا انڈہ ابالنا نہیں آتا۔ ویسے یہ کوئی اتنی بڑی خامی بھی نہیں، خامی تو یہ ہوتی ہے کہ لڑکی کو میک اپ کرنا نہ آتا ہو یا پھر وہ میچنگ میں نل ہو جبکہ میں تو ان میں ایسے طاق تھی جیسے کوئی طالب علم مشق کے ''نصاب'' میں۔ عشق کے نصاب سے یاد آیا کہ مجھے ''عشق'' پر بھی دسترس حاصل ہے۔ تیسرے درجے کے رومانوی ناول میں چوتھی سے ہی پڑھنا شروع کر بیٹھی تھی۔ میں نے تو خط لکھنا بھی انہی ناولوں کی بدولت سیکھا ہے۔ مجھے اپنا پہلا خط آج تک یاد ہے جس پر میری پٹائی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ ویسے قصور میرا نہیں تھا۔ امی نے ہی مجھے کہا تھا کہ ذرا اپنے ماموں جان کو خط لکھ دو، بس میں نے لکھ دیا۔

جان سے پیارے ماموں جان!

سلام محبت!

ڈیئر! مت پوچھو کہ تمہاری جدائی میں میرا کیا حال ہے؟ تمہارا تصور پل پل میری ہستی کے ساتھ ہے۔ میں جب کوئی کام کرنے لگتی ہوں تو تمہارا خیال ہوتا ہے۔ جب کوئی کتاب پڑھنے لگتی ہوں تو کتاب کا ہر لفظ تمہارا نام بن جاتا ہے، ہر صفحے پر تمہارا خیال ہوتا ہے۔ میں راتوں کو سو نہیں سکتی، سوتے میں اچانک آنکھ کھل جائے تو لبوں پر بے اختیار تمہارا نام مچل جاتا ہے۔

جان من! میں زمانے سے ڈرتی ہوں کہ کہیں زمانہ ہمیں رُسوا نہ کر دے۔ میرے خوابوں کے شہزادے، میرے تاج محل، میری محبت، میرے آقا، میرے دیوتا، صرف ایک بار چلے آؤ۔ تمہیں میری قسم صرف ایک بار چلے آؤ کیونکہ امی جان بہت اداس رہتی ہیں۔ باقی یہاں پر سب خیریت ہے اور کوئی خاص بات نہیں جو تحریر کروں۔

تمہیں بہت بہت پیار

فقط آپ کی بھانجی، مس تمنا

اور پھر واقعی ماموں جان آ گئے لیکن آتے ہوئے میرا خط بھی لیتے آئے۔ بس پھر کیا تھا' امی سے ڈانٹ سننی پڑی۔ باجی نے مذاق اُڑایا۔ بھیا الگ ناراض ہوئے۔ غرض سب گھر والوں نے ہی کھری کھری سنائیں۔ گویا میں نے خط نہ لکھا ہو بلکہ کسی مشاعرے میں چرائی ہوئی غزل پڑھ دی ہو۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے کبھی کسی رشتہ دار یا عزیز کو خط لکھنے کی غلطی نہیں کی۔ ہاں البتہ ''آسے پاسے'' کی اور بات ہے۔

اس ''آسے پاسے'' میں میرے صاحب بھی شامل ہیں۔ (جن کے آفس میں میں بطور سیکرٹری ملازمت کرتی ہوں) جنہیں میں کبھی کبھار چھٹی کے لئے خط لکھ لیتی ہوں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ چھٹی کے لئے تو درخواست لکھی جاتی ہے لیکن شاید آپ نہیں جانتے کہ ہمارے ''صاحب'' ''درخواست'' پر چھٹی نہیں دیتے کیونکہ انہیں درخواست پسند نہیں' انہیں تو بس خط ہی پسند آتے ہیں۔ ان کے بک شیلف میں ''غالب کے خطوط'' کی چھ جلدیں موجود ہیں جنہیں ''صاحب'' گاہے بگاہے پڑھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ صاحب نے ''جمن کے خطوط'' کے نام سے ایک نئی کتاب بھی شائع کروائی ہے۔ جس سے صاحب کے اعلیٰ اَدبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

''جمن'' صاحب کا قلمی نام ہے اور اس کتاب میں شامل تمام خطوط صاحب جی کے اپنے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند خطوط مجھے بہت پسند ہیں۔ بظاہر تو ان کا مخاطب بے نام ہے لیکن خط پڑھنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صاحب نے ان خطوط میں مجھے مخاطب کیا ہے لہٰذا خط پڑھنے کے بعد میرا اخلاقی فرض مجھے اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ میں بھی صاحب جی کو جواب لکھوں۔ بس اسی فرض سے مجبور ہو کر ایک دن میں نے صاحب کو ایک شاندار رومینٹک خط لکھ مارا لیکن اس طرح کہ خط لکھنے کے بعد ان کی میز پر رکھا اور بغیر اطلاع کے دو دن گھر بیٹھی رہی صرف اس کے لئے صاحب کو میری یہ ''حرکت'' ناگوار گزرے لیکن ہمارے صاحب اتنے بدذوق بھی نہیں ہیں۔ اس کا پتہ مجھے اس وقت چلا جب میں تیسرے دن ڈرتے ڈرتے دفتر پہنچی۔ مطلع ابر آلود ضرور تھا مگر بارش کا دور دور تک کوئی امکان نہ تھا۔ صاحب کے ماتھے پر بل تو ضرور تھے مگر ان کی بھیگی آنکھیں محبت کے جام لٹا رہی تھیں میں تاڑ گئی کہ صاحب جی یوں ہی بن رہے ہیں لہٰذا میں نے بھی نخرہ دکھایا۔ بس پھر کیا تھا۔ صاحب جی کی ساری پرسنالٹی' اَنا اور غرور ایک گفٹ میں سمٹ کر ساڑھی کی صورت میں مجھے کو مل گیا۔

اس دن کے بعد صاحب' صاحب نہ رہے اور 'میں' میں نہ رہی۔ اب میں صاحب بن گئی تھی اور صاحب سیکرٹری۔ دفتر پر میرا حکم چلنے لگا اور گھر پر تو ویسے بھی میرا ہی حکم چلتا تھا کیونکہ صاحب یہ بات شادی سے پہلے بھی جانتے تھے اور شادی کے بعد اس کا عملی مظاہرہ بھی کر چکے تھے کہ اچھا شوہر وہی ہوتا ہے جو بیوی کا فرمانبردار ہو لہٰذا شادی کے بعد انہوں نے کبھی نظریں ملا کر مجھ سے بات نہیں کی۔ میں نے بھی گن گن کر بدلے لئے۔ ایک ایک ڈانٹ کا حساب لیا۔ اگلے پچھلے تمام بدلے چکائے لیکن ابھی تک میرا جی نہیں بھرا---

ویسے کبھی کبھی صاحب کو کچن میں برتن دھوتے دیکھ کر میرا جی بھر آتا ہے۔ مجھے ترس آنے لگتا ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن میں اپنی آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو پی کر صبر کر لیتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتی ہوں' کیونکہ میں مشرق کی مجبور' بے بس اور مظلوم لڑکی ہوں۔

☆☆

[illegible]

سلمیٰ وقاص' لاہور

کردار: فوزیہ...... بیوی
طفیل...... میاں
مونا...... طفیل کی بہن

فوزیہ: (اپنے آپ سے) اللہ کی مار اس اخبار پر۔ اخبار نہ ہوا وبالِ جان ہو گیا! صبح سے یہ وقت ہو گیا نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا! کوئی ان سے پوچھے کہ کہیں لڑائی ہو رہی ہے تو تمہیں اس سے کیا؟ امریکہ اگر نیو ورلڈ آرڈر لا رہا ہے تو کیا تم اسے روک لو گے۔ رشین فیڈریشن روس میں اگر مہنگائی بانسوں بلند ہو گئی ہے تو کیا تم اسے گھٹا سکو گے؟

طفیل: تمہیں تو بس بڑبڑانے کی عادت ہے۔

فوزیہ: جی ہاں! پاگل جو ٹھہری' بلاوجہ ہی تم سے اُلجھ رہی ہوں۔

طفیل: (طنز سے) نہیں تم کیوں پاگل ہونے لگیں پاگل تو میں ہوں جس نے تم جیسی اخبار شکن سے بیاہ کیا۔

فوزیہ: (تیزی سے) گویا مجھ سے بیاہ کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ (منہ بسورتے ہوئے) وہ دن بھول گئے جب تمہاری ماں رو رو کر میرے باپ سے رشتہ مانگا کرتی تھیں۔

طفیل: اچھا زیادہ بڑبڑ مت کرو ناشتہ لے کر آؤ جلدی سے!

فوزیہ: چائے تو صبح سے رکھی ہے۔ مجھے ایک یہی کام تو نہیں رہ گیا کہ تمہاری چائے کی چوکسی کرتی رہوں۔ ہائیں' یہاں تو صرف ایک ٹوسٹ

رہ گیا! شاید بلی کھا گئی اور چائے بھی ساری میز پر گری پڑی ہے۔
طفیل: (غصے سے) میں نے تمہاری جیسی پھوہڑ عورت کہیں نہیں دیکھی۔
فوزیہ: لو اور سنو! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے---اپنا قصور میرے سر تھوپ رہے ہیں۔ چائے تمہارے سامنے ہی تو میز پر پڑی ہوئی تھی تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ بلی کو ہش کر دیتے پر تم تو اخبار کا آئینہ سامنے رکھے بیٹھے ہو! یہ موا اخبار تو گھر ویران کر کے رہے گا۔ ادھر دہ گڈو---!
طفیل: (بات کاٹ کر) کیا ہو گڈو کو
فوزیہ: (پھنکار کر) تمہاری بلا سے تم تو اخبار پڑھا کرو۔ غضب خدا کا' ایسا سنگدل باپ بھی بھلا کسی نے دیکھا ہو گا آٹھ ماہ کی ننھی سی جان۔ تکلیف سے پریشان اور ابا میاں ابھی بھی پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا گڈو کو؟ صبح ہوئی اخبار لے کر بیٹھ گئے شام کو دفتر سے آئے تو اخبار۔
طفیل: (جلدی سے) اَب باتیں نہ بناؤ کچھ پتہ بھی تو چلے کیا ہوا گڈو کو؟
فوزیہ: سوچا تھا آج جمعہ ہے چھٹی کا دن ہے تمہیں کہوں گی کہ کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ گڈو کو لیکن تمہیں تو اخبار کے ڈھیر چاہیں! ایک ختم ہوا تو دوسرا شروع' کوئی مرے یا جیے تمہاری بلا سے۔
طفیل: اچھا بھئی' دماغ کیوں کھاتی ہو یہی کہنا چاہتی ہونا' کہ بچے کی طبیعت خراب ہے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔
فوزیہ: تو گویا مجھ پر احسان کر رہے ہیں۔ بچہ تمہارا ہے۔ میں میکے سے تو لائی نہیں!
طفیل: اَب بند بھی کرو یہ بکواس! لاؤ بچے کو جاتا ہوں ڈاکٹر کے پاس
(میاں بچے کو لے کر چلا جاتا ہے۔ بیوی بڑبڑاتی ہے۔)
(دوسرا سین)
فوزیہ (اپنے آپ سے) اب دوپہر کو لے کر جائیں گے۔ کالا منہ اس اخبار کا' بیوی بچوں کے دکھ درد سے کوئی واسطہ نہیں' کوئی ان سے پوچھے کہ جب اخبار کا ایسا ہی چسکا تھا تو بیاہ کاہے کو رچایا۔ اتنا نہیں ہوتا کبھی ان سے کہ بچے کو گود میں لے لیں' بازار لے جائیں۔ بچہ بہل جائے گا' ہونہہ باپ بننا آسان سمجھ رکھا ہے۔ سب ان کی طرح اخبار کے دیوانے ہو جائیں تو دنیا بھر کے بچے پل چکے---دور کیوں جاؤں پھوپھی ناہید کے میاں کو دیکھ لو۔ ابھی چند ہی دنوں کی بات ہے چھوٹے لڑکے کی طبیعت خراب ہو گئی اور صورت بھی لڑکے کی یونہی سی تھی کالا کلوٹا سا آنکھ چھوٹی ایک بڑی مگر آفرین ہے باپ پر دن رات ایک کر دیا۔ سو سو پھیرے ڈاکٹر کے ہاں کئے کھانا پینا اپنے اوپر حرام کر لیا۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) ہاں بھئی' قسمت والیاں ہیں۔ ایک ہم ہیں۔ پھوٹی قسمت لے کر آئے میاں ملا تو وہ بھی اخبار کا رسیا اور---

مونا: (آتے ہوئے) السلام علیکم بھابی۔
فوزیہ: (چونک کر) وعلیکم السلام! آؤ مونا! کہو آج کیسے راستہ بھول گئیں۔
مونا: کیا بتاؤں بھابی! وقت ہی نہیں ملتا۔ کالج سے آتے آتے اتنی دیر ہو جاتی ہے اور پھر بھابی' ہم تو بھول کر بھی یاد بھی کر لیتے ہیں۔ آپ تو ایسی بھولیں کہ کبھی یاد ہی نہ کیا۔
فوزیہ: کیا کہوں مونا! گھر کے دھندے کہاں دم مارنے دیتے ہیں۔
مونا: ہاں یہ تو ہے (ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) بھائی جان نظر نہیں آ رہے۔
فوزیہ: (گہرا سانس لے کر) تمہارے بھائی بچے کو لے کر گئے ہیں۔
مونا۔ کہاں؟
فوزیہ: دو تین دن سے بچے کی طبیعت خراب تھی لیکن وہ تو اخبار پر مٹ چکے ہیں۔ آج میرے واویلا مچانے پر ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہیں۔ کیا کہوں مونا' ماں کی مامتا بری شے ہے لیکن وہ---انہیں تو صبح شام اخبار چاہئے---نہ گھر سے واسطہ نہ گھر والوں سے دلچسپی۔
مونا: کمال کر رہی ہیں بھابی! اخبار پڑھنا کوئی بری بات تو نہیں۔
فوزیہ: کیوں نہ ہو ماشاء اللہ! ہو تو اپنے بھائی کی بہن ہی' ان کی حمایت نہ کرو گی تو اور کس کی کرو گی؟
مونا: یہ تو بتایئے بھابی! اخبار سے آپ کو اتنا بیر کیوں ہے؟ اخبار تو ہمیں دنیا بھر کے حالات سے باخبر کرتا ہے۔
فوزیہ: (تیزی سے) تو ہم کیا دنیا کے ٹھیکیدار ہیں جو دنیا بھر کے حالات سے باخبر رہیں۔
مونا: (رکتے ہوئے) ٹھیکے---ٹھیکے دار تو نہیں لیکن ہمارے لئے یہ جاننا بھی تو ضروری ہے کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور ہمارا ملک کیا کر رہا ہے؟
فوزیہ: ارے' ہٹاؤ بھی اس فضول قصے کو! دنیا میں ایٹم بم پھٹیں ہمیں کیا' اور پھر یہ موئے اخبار والے جھوٹ بھی تو ٹکا کر بولتے ہیں۔ انہیں تو لوگوں کی جیب سے پیسے نکلوانے ہوتے ہیں۔
مونا: (اُکتا کر) اچھا بھابی! میں چلتی ہوں بھائی جان تو ابھی آئے نہیں۔
فوزیہ: تو تمہیں کہیں جانا ہے؟
مونا: جی وہ---سری لنکا اور پاکستان کا میچ ہے نا! آج وہی دیکھنے جانا ہے۔
فوزیہ: (حیرت سے) ہائیں! یہ موئے میچ کی چاٹ کب سے لگی تمہیں؟
مونا: زندہ قومیں اپنی اپنی سرگرمیوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ بھابی! قوم

کے ہر فرد کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت پورے جوش و خروش سے ان باتوں میں حصہ لینا چاہئے۔ یہ ہمارے قومی وقار کا سوال ہے بھابی!

فوزیہ: اے ہٹاؤ اس قصے کو پاکستان جیتے یا ہارے ہماری بلا سے۔

مونا: یہی تو آپ کی بھول ہے بھابی!

فوزیہ: اچھا تو اب تم ہمیں سبق بھی دینے لگیں۔ یہ سب آج کل کی تعلیم کا اثر ہے۔ ابھی کل تک تو تم کیاریوں کے پاس بیٹھی ریں ریں کیا کرتی تھیں اور اب---!

مونا: (گھبرا کر) اور اب کیا بھابی! بخدا میرے دل میں آپ کے لئے وہی احترام ہے۔

فوزیہ: اے رہنے بھی دو میں سب جانتی ہوں، آج کل کی لڑکیاں پڑھ لکھ کر اپنے آپ کو افلاطون سمجھنے لگتی ہیں۔

مونا: (زور سے) بھابی!

فوزیہ: ارے بھاڑ میں گئی بھابی! کیسی بھابی، کس کی بھابی! تم تو جاؤ میچ دیکھنے! اور تمہارے بھائی انہیں تو اخباروں کے ڈھیر چاہئیں۔ ایک ختم ہو دوسرا شروع۔ دوسرا ختم --- تیسرا --- ہائے میرے نصیب!

☆☆

ہڈبیتی

❂ ایس ایف گل، جیک آباد

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس دن سورج مغرب سے طلوع ہوا تھا۔ شمال سے یا جنوب سے بہر حال یہ طے ہے کہ مشرق سے طلوع نہیں ہوا تھا۔ جب میں پڑوس سے اخبار مانگ کر لایا تو ایک سرخی پڑھ کر حیران رہ گیا لکھا تھا۔ ''حکومت نے ملک میں بڑھنے والی بیروزگاری پر قابو پا لیا ہے۔ اب ملک میں کوئی نوجوان بیروزگار نہیں رہے گا۔'' دوسری سرخی تھی۔ اشیاء کی قیمتوں میں خاطر خواہ کمی۔ اب کوئی غریب بھوکا نہیں سوئے گا اور ایک سرخی تھی۔ ''ملاوٹ کے خلاف شروع کی گئی مہم سو فیصد یاب رہی اب ہر چیز خالص ملے گی۔'' نظر ایک اور سرخی پر جا ٹھہری لکھا تھا۔ ''ملک کے تمام بڑے شہروں کے علاوہ گاؤں میں بھی سڑکوں کا جال بچھایا جائے گا اور ہر گٹر کو ڈھکنا نصیب ہوگا۔ اب کوئی راہ گیر گٹر کی گہرائی نہ ناپ سکے گا۔'' ایک اور سرخی تھی کہ ''پچھلے ہفتے سے ملک میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا کیونکہ سڑکوں پر ٹریفک پولیس موجود تھی اور بسوں، ٹرکوں، ویگنوں، کاروں نے ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کی'' ان گنا ہگار آنکھوں نے ایک اور سرخی پڑھی ''فون کے بلوں میں کمی، اندرون شہر ہر کال پر سوا روپیہ فی کال جبکہ بیرون شہر فی کال تین روپے ہوں گے۔'' ایک سرخی موٹے موٹے الفاظ میں لکھی گئی تھی کہ ''فیشنی خواتین کے بال کٹوانے اور مردوں کے بال بڑھانے پر سخت پابندی، اب کسی عورت پر مرد کا اور کسی مرد پر عورت کا گمان نہ ہوگا۔'' یہ تمام سرخیاں اور پوری تفصیل پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ ہر سرخی کے نیچے پوری خبر درج تھی۔ کسی سرخی کے نیچے دو لائنوں کے بعد بقیہ صفحہ چار پر دیکھئے لکھا ہوا نہیں تھا۔ اخبار کا صفحہ پلٹا ایک جگہ نوکری کے لئے اشتہار پڑھا جس میں تجربے والی کوئی شرط نہ تھی۔ میں نے اخبار میز پر رکھا اور انٹرویو کے لئے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ انٹرویو کے لئے نو تا گیارہ وقت دیا گیا تھا اور ڈیٹ بھی آج ہی کی تھی۔ گھر سے بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے کئی جگہوں پر سڑکوں کی تعمیر کا کام ہوتے دیکھا اور بسوں میں بھی کوئی رش نہیں تھا۔ ہر سواری نہ صرف بیٹھ سکتی تھی بلکہ با آسانی ٹانگیں بھی پھیلا سکتی تھی۔ مطلوبہ کمپنی کے دفتر پہنچ کر انٹرویو دیا اور بغیر رشوت و سفارش کے قابلیت پر نوکری کا اہل قرار دے دیا گیا ابھی میں نے نوکری ملنے کی خوشی میں یا ہو کا نعرہ لگایا ہی تھا کہ ''اجی، پاگل ہو گئے ہو کیا نیند میں چلا رہے ہو'' کے ساتھ بیگم نے مجھے جھنجھوڑ کر میرا رابطہ حقیقت کی دنیا سے جوڑ دیا۔

''بیگم! مجھے نوکری مل گئی۔'' میں ابھی تک خواب میں تھا۔

''ہائیں کب ملی آج ہی تو آپ نے انٹرویو کے لئے جانا ہے۔'' بیگم نے یاد دلایا تو میں برے برے پوز بناتا ہوا ٹوٹی ہوئی چارپائی سے اٹھا۔

''بیگم! چائے لاؤ۔'' میں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے کہا۔''

''لو جی، گھر میں چولھا جلانے کے لئے ماچس تک تو ہے نہیں اور چائے بنانے کے لئے تو دودھ شکر اور پتی کی ضرورت ہوتی ہے۔'' بیگم نے سٹارٹ لیا تو میں صبر کے گھونٹ پیتا ہوا انٹرویو کے لئے جانے کی تیاری کرنے لگا۔

انٹرویو کے لئے جاتے ہوئے دیکھا کہ تمام ٹوٹی پھوٹی سڑکیں جوں کی توں موجود میرا منہ چڑا رہی تھیں۔ بس اسٹاپ سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ کسی بھی بس میں بیٹھنا تو کجا میرے لٹکنے کی جگہ بھی نہ تھی اور نہ ہی جیب میں کرایہ، مطلوبہ کمپنی کے دفتر پہنچا اندر جا کر انٹرویو کے ئے کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ''پرچی لاؤ'' کہا گیا۔

''جی، کیسی پرچی؟'' میں سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔

''تمہارا نام عامر ہے؟'' پوچھا گیا۔

مرد کی طاقت بازوؤں میں اور عورت کی طاقت زبان میں پوشیدہ ہوتی ہے ☺ پرنس کشمیری

''جی، نہیں میرا نام قادر بخش ہے۔''

میرے کہنے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ عامر نام کے کسی لڑکے کو نوکری دے دی گئی ہے جس نے ابھی انٹرویو تک نہ دیا تھا۔ میرے احتجاج کرنے پر دھکے دے کر دفتر کی عمارت سے نکلوایا گیا۔ میں مایوس گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ ایک پارک میں کوئی سیاستدان عوام کو سبز باغ دکھا رہا تھا۔ میں غصے میں تو تھا ہی فوراً پارک میں گیا اور سیاستدان کے مدمقابل کھڑے ہو کر پوچھا۔ ''پچھلے چار سالوں میں اس نے غریبوں کے لئے کیا کیا' کتنے بیروزگار نوجوانوں کو نوکری دلائی' کتنی گلیوں میں سٹریٹ لائٹ لگوائی' پانی کا مسئلہ کہاں تک حل کیا۔ غرضیکہ دل کی تمام بھڑاس نکالی جس پر امیدوار تو چیں بہ چیں ہو گیا جبکہ عوام نے تالیاں بجا کر مجھ سے اتفاق کیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کا نمائندہ بن جاؤں جو کہ میں نے بغیر پس و پیش کے قبول کر لی اور دھوتی کس کو میدان سیاست میں کود پڑا۔ میرے الیکشن لڑنے کا بوجھ قرضوں تلے دبے ہوئے غریبوں عوام نے اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھایا اور مجھے زبان زد عام بھی انہی لوگوں نے کیا۔ میرا پلہ بھاری دیکھ کر مخالفوں نے مجھے شیطان کی طرح بھٹکایا اور میں کسی انسان کی طرح بھٹک گیا اور پانچ لاکھ روپے اور نوکری دلانے کا وعدہ لے کر ان کے حق میں دست بردار ہونے کا اعلان کر دیا جو کہ عوام کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ پانچ لاکھ روپے لا کر گھر کے اکلوتے ٹرنک میں چھپا دیئے۔ وہ تمام دن میں نے بیگم کے ساتھ مل کر مستقبل کے کئی منصوبے بنا ڈالے اور تمام رات روشن مستقبل کے خواب دیکھتے ہوئے گزری۔ اگلی صبح معمول کے مطابق تھی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی کا وہیں تھا۔ اگر کچھ نہیں تھا تو وہ ٹرنک نہیں تھا جس میں ہمارے خواب نقدی کی صورت موجود تھے۔ رقم سے ہاتھ دھونے کے بعد مک مکا کرنے والے امیدوار کے گھر گیا اور امید کا آخری سہارا یعنی نوکری کا وعدہ یاد دلایا تو اسنے کرائے کے غنڈوں سے پٹوا کر مجھے باہر نکال دیا اور میں---

اور ہم جہاں تھے وہیں آ کر سو گئے

کی تصویر بنے گھر کی طرف چل دیئے۔ ☆☆

یہ کالج

دی الٹیمیٹ واریئر' کراچی

کالج ایک ایسا نام ہے جسے ہر طالب علم شیدائی ہوتا ہے اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد میٹرک پاس کر کے کالج لائف میں آئیں جہاں ہر قسم کی آزادی ہوتی ہے لیکن ادھر کالج میں داخلہ لیا ادھر انہوں نے کلاشنکوف کا دیدار کیا۔ اب تو یہ عالم ہے کہ کالج میں داخل ہوں تو آپ کو بہت سے پوسٹر نظر آئیں گے جو اس قسم کی چیزوں کی تصویری نمائش کر رہے ہوں گے۔ ہمارے کالجز میں جو کچھ ہے۔ اس کے متعلق تو دوسرے علاقوں کا طالب علم سوچ بھی نہیں سکتا۔

صبح کالج پہنچتے ہی باہر لائن میں لگنا پڑتا ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ لائن اور کالج میں' کیا اسمبلی ہوگی! جی نہیں' کیا کارڈ چیک یا یونیفارم چیک ہوگا! جی نہیں' تو پھر لائن کا کیا مطلب؟ یقیناً یہ سوال آپ کے ذہن میں ہوگا۔ دراصل یہ لائن نہ کارڈ کی ہے نہ ہم نے ترانہ پڑھنا ہے بلکہ یہ کالج میں داخل ہونے سے پہلے رینجر کے جوان ہر مستقبل کے معمار کی مکمل تلاشی لیتے ہیں کہ آیا کوئی مستقبل کا محافظ ابھی سے تو اسلحہ سے نہیں کھیل رہا--- خیر تلاشی کا معاملہ ختم ہوا' کالج کے اندر داخل ہوا تو لگتا ہی نہیں کہ یہ کالج ہے۔ آپ پھر سوچ رہے ہوں گے۔ اگر کالج نہیں تو کیا ہم بجائے کالج کے کسی مزار پر آ گئے ہیں کیونکہ کالج کے اندر ہر طرف ہر پول پر ہر جگہ بڑے چھوٹے جھنڈوں کی بھرمار ہے جو کہ مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں۔ ہر طرف جھنڈوں کے علاوہ ہر دیوار' ہر دروازے اور حتیٰ کہ درختوں پر بھی نعرے لکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ اگر آپ ان کو پڑھنا شروع کر دیں' سارا دن لگے رہیں گے وہ ختم نہیں ہوں گے اور بعض جگہ تو کئی کئی نعرے مکس ہو کر ایک الگ رنگ ہی دیتے نظر آئیں گے۔ اس کے بعد آپ کلاس روم میں جانے کی بجائے کینٹین چلے جائیں۔ وہاں جا کر احساس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر تو باہر کسی فٹ پاتھ ہوٹل پر بیٹھ کر چائے پی لیں۔ کیونکہ شاید ہی کوئی کرسی یا میز سالم ہو۔ میز بھی بغیر پائے کے ملیں گے۔ کرسیاں اکثر تین ٹانگوں والی نظر آئیں گی۔ خیر اگر آپ دل پر جبر کر کے بیٹھ جائیں اور چائے منگوائیں۔ اب چائے آپ کے سامنے اس کپ میں آئے گی کہ اگر میں یا آپ اس طرح کا کپ گھر میں دیکھ لیں تو اٹھا کے باہر پھینک دیں لیکن یہاں مجبوری ہے۔ آپ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو وصول کرنا پڑے گا۔ اب جب آپ چائے پئیں گے تو آپ ایک مرتبہ تو لازمی یہ سوچیں گے کہ شاید غلطی سے گرم پانی جس میں چائے کے برتن دھلتے ہیں دے گیا لیکن جب دیکھیں کہ دوسرے طالب علم بھی چائے کے نام پر اسی چیز کو پی رہے ہیں تو پھر ہمیں بھی عادت بنانی ہی پڑتی ہے۔ اس کے بعد جمنازیم میں آ جائیں۔ اندر داخل ہوں تو سائڈ پر ٹیبل ٹینس کی میزیں ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی میز ٹھیک نہیں۔ اس پر کھیلنے کے لئے اس کو سیدھا رکھنے کے لئے اکثر میزیں بلاکوں پر کھڑی ہیں اور طالب علم اس پر نیٹ

لگانے کے بجائے (کیونکہ نیٹ کسی صاحب کے گھر پہنچ چکا ہوگا) اپنی کتابیں کھڑی کر دیتے ہیں۔

بیڈمنٹن کے کورٹ میں بھی نیٹ کا مسئلہ ہوتا ہے کیونکہ اس کا نیٹ شام کو گلی میں بیڈمنٹن کھیلنے کے کام آتا ہے۔اس لئے وہاں اکثر پول کے ساتھ رسی باندھی جاتی ہے۔جس سے کہ کھیل کم اور چراند زیادہ ہوتی ہے۔اس لئے اب طالب علم وہاں بجائے بیڈمنٹن وغیرہ کے کرکٹ کھیلتے ہیں اور اب آپ کلاس روم میں آجائیں تاکہ کچھ پڑھ لیں لیکن یہ کلاس روم تو تقریباً خالی ہے۔سوائے چند لڑکوں اور ایک عدد پروفیسر کے اور کوئی نہیں ہے اور وہ لڑکے جو بیٹھے ہیں۔وہ بیچارے اس چکر میں ہیں کہ ہم پڑھ کر اچھے نمبر لے آئیں گے لیکن وہاں سینٹر جہاں یہ پیپر دیں گے۔وہاں دوسرے لڑکے تو نقل کر کے بڑے زیادہ نمبر لے لیں گے اور یہ بیچارے ایسے ہی رہ جائیں گے۔

اب کلاس میں بیٹھ جائیں یا باہر آجائیں کوئی آپ کو نہیں پوچھے گا کیونکہ یہاں روک ٹوک صرف فسٹ ائیر تک ہی محدود ہے۔اب تو وہ بھی کم ہے۔ورنہ تو ٹیچر اکثر پوچھتا ہے۔"اب میں چلا جاؤں" کلاس روم میں بھی جگہ جگہ نعرے لکھے ہوئے ملیں گے۔کرسیاں بغیر ہتھے کی کیونکہ وہ اکثر ہنگامے کے دوران کام آتی ہیں۔کوئی علم نہیں کہ ادھر آپ کلاس میں ہیں اور باہر دو پارٹیوں میں جھگڑا ہوگیا اور اس وقت تو کالج میدان جنگ بنا ہوتا ہے۔مختلف قسم کے نعرے لگ رہے ہوں گے۔فائرنگ کی آوازیں اس طرح آرہی ہوتی ہیں جیسے میدان جنگ میں آگئے ہوں۔ مسلسل فائرنگ مارا ماری توڑ پھوڑ اب باہر نکلنے کا الگ مسئلہ۔ اکثر نئے طالب علم تو رونے لگتے ہیں اور جو پرانے ہوتے ہیں وہ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

☆☆

تجربہ

شفارشی فرام کراچی

یوں تو میرے کئی دوست ہیں مگر بخاری میرا دکھ سکھ کا ساتھی ہے۔ اسے میڈیکل کالج میں بخاری عرف عجوبہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ بخاری اس عرفیت سے بڑا خوش تھا کیونکہ بقول اس کے اس سے لوگوں کا ظرف پہنچانا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسے کالج میں داخلہ کس طرح مل گیا البتہ چھ ماہ بعد اسے نااہل قرار دے کر فارغ کر دیا گیا۔اساتذہ کا خیال تھا کہ اس کا نہ صرف پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا بلکہ وہ چند ایک کے علاوہ تمام مضامین بدل دینے کا قائل تھا اور احتیاطاً اس نے تمام مضامین رکھنے کی خواہش بھی ظاہر کر دی تھی۔ بخاری نے کالج سے فراغت کے بعد اپنے چھوٹے سے گھر میں نت نئے تجربے شروع کر دیئے۔ پہلے پہل تو وہ تمام بیماریوں سے نجات کی ایک گولی بنانے لگا۔جب یہ نہ ہوسکا تو اس نے یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ چند ایک بیماریاں اور آجائیں تو سب کی ایک ساتھ ہی دوائی بنالوں گا۔ پھر اس نے الیکٹرونکس پر توجہ دینا شروع کر دی۔اول اول تو اس نے پانی سے چلنے والا بلب بنایا پھر بغیر ٹیپ ریکارڈر سے چلنے والی کیسٹ بنانے کی کوششیں کی۔ناکام ہونے کے بعد وہ اوچھی قسم کی چیزیں بنانے لگا۔جس کا ذکر فی الحال یہاں نہیں ہوسکتا۔میرے ٹوکنے پر اس نے ایک پلٹا کھایا اور ایٹم بم بنانے کا ارادہ کیا لیکن میری اس بات پر کہ انسانیت کی خدمت کی کوئی شے بنائی جائے نہ کہ ان کی بربادی کی۔ بخاری میری ان باتوں سے بڑا متاثر ہوا اور اس نے پھر سے نئے تجربات شروع کر دیئے۔سب سے پہلے تو اس نے ایسی دوائی بنائی کہ محلے کی کتیا کو پلانے کے بعد کچھ روز گزرتے ہی وہ انڈے دینے لگی اور یوں یہ کتیا دنیا کی پہلی انڈے دینے والی کتیا قرار پائی۔اس طرح بخاری نے مرغی کے لئے بھی ایک دوا ایجاد کی اسے باجرے کے ذریعے وہ دوا کھلائی گئی تو دیکھتے ہی دیکھتے مرغی بڑی ہونے لگی حتیٰ کہ وہ گھوڑے کے برابر ہوگئی۔پھر میرے ہی مشورے پر بخاری نے اس مرغی کو زہر کا انجکشن دیا اور ہم نے اس مرغی کا گوشت مہینے بھر کھایا۔ایک دفعہ یوں ہوا کہ اس نے ایک ایسی گولی بنائی جسے کھانے سے انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔پہلے پہل تو مجھے یقین نہ آیا لیکن اس کے سابقہ تجربوں کی وجہ سے مجھے یقین کرنا پڑا۔ بخاری نے پہلے وہ گولی کھائی۔جب میں نے اس کے اثرات کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ میں تیس چالیس سال انتظار کروں۔اگر اس کی عمر نہیں بڑھے تو میں بھی کھالوں لیکن اس وقت تک میں بوڑھا ہو چکا ہوں گا اس لئے میں نے اس کی باتوں پر اعتماد کرلیا اور گولی کھالی بعد میں اس نے بتایا کہ میں نے تو وٹامن کی گولی کھائی تھی تاکہ مجھے یقین آجائے۔جب میں نے اصل وجہ معلوم کی تو اس نے بتایا کہ گولی کے کھانے سے آدمی نہ صرف انسان رہتا ہے بلکہ جانور بھی بن سکتا ہے۔اس کا یہ کہنا تھا کہ میرے ذہن میں جانوروں میں سب سے پہلے بن مانس کا خیال پیدا ہوا اور دوسرے ہی لمحے میرے جسم پر بال نکلنا شروع ہوگئے۔ مجھے سینہ پیٹنے اور کیلے کھانے کو جی چاہنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں بن مانس بن گیا۔میرا شعور جاتا رہا۔میں نے جب دوبارہ انسان بننے کی کوشش کی جو ناکام ثابت ہوئی اور اب میں مستقل طور پر بن مانس بن چکا ہوں۔ بخاری نے مجھے فی الحال

رے میں بند کر رکھا ہے اور دن رات میرے علاج کے لئے کوشاں ہے اس کا خیال ہے کہ ایک دن ضرور آئے گا جب میں انسان بن جاؤں گا لیکن میرے خیال میں انسان بننے کی مجھ سے زیادہ اسے ضرورت ہے۔

☆☆

خبر

نسیم احمد صدیقی، کراچی

بنا سچی محبت کے مارے "جاوید" نے بغیر ظالم سماج کے ٹھیکیداروں کی اجازت کے اپنی محبوبہ شاہانہ کو لکھا۔

"جان جاوید" شاہانہ!

سلام محبت، ظالم سماج کے ٹھیکیدار ہمارے سنہرے مستقبل کی سیڑھیوں پر موبل آئل ڈال رہے ہیں تاکہ ہم زندگی بھر پھسلتے رہیں اور کبھی ہمارا املاپ نہ ہو۔ ادھر میری ماں میرے اوپر سانپ بن کر بیٹھی ہیں کہ اپنی کالی کلوٹی بھانجی کو جسے وہ پیار سے "ملکہ" کہتی ہیں جو اپنے موٹاپے کی وجہ سے پوری دو من کی ہے میری جورو بنانے کے درپے ہیں لہٰذا تم کل شام چار بجے نہر والے پل پر اپنا بکس جس میں یقیناً زیورات بھی شامل ہوں گے لے کر آ جانا۔ ہم دونوں تمام موبل آئل زدہ سیڑھیوں کو ایک ہی چھلانگ میں عبور کر کے ایک دوجے کے ہو جائیں گے۔ پھر پلٹ کر میں اپنی اماں کو اور تمام اپنے ہوتے سوتوں کو مت دیکھنا۔

فقط تمہارا جاوید!"

مگر جو خط جاوید کا "جان جاوید" شاہانہ کو ملا وہ کچھ یوں تھا---!

جان سے پیاری امی

ہمیشہ خوش رہیں، آپ کے کہنے کے مطابق میں نے اس ذلیل کتیا شاہانہ کو ہمیشہ کے لئے دھتکار دیا ہے۔ وہ مجھے اس قدر چڑیل لگنے لگی ہے کہ جس دن اس منحوس کو دیکھ لیتا ہوں دن بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ امی جان! میں اس اندھیرے میں تھا مگر اب اس مکار ذلیل شاہانہ کی حرکتوں نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں شاہانہ کے منہ پر تھوک کر واپس آپ کے چرنوں میں آ رہا ہوں۔ آپ اپنی بھانجی "ملکہ" سے میری شادی کی تاریخ طے کر لیں۔

فقط آپ کا تابعدار بیٹا جاوید!

اس کے بعد ہوا یہ کہ "جان جاوید" شاہانہ اپنے ابو کی پستول چرا کر جاوید کی ماں کے گھر چھپ کر جاوید کا انتظار کرنے لگی اور ادھر جان دو من وزنی "ملکہ" کو مع نکاح خواں اور دو گواہوں کے شام چار بجے نہر والے پل پر جاوید کے استقبال کے لئے موجود تھیں اور پھر اگلے دن اخبارات خوب بکے کیونکہ اس میں ایک خبر تھی کہ ایک دو من وزنی دلہن ایک الہڑ دوشیزہ اور ایک دولہا موبل آئل زدہ سیڑھیوں سے پھسل کر قبرستان کی آبادی بڑھانے کا سبب بن گئے۔

☆☆

ٹک

مس بھٹی، لاہور

"آج لکھ نہیں رہے؟" گھر والی نے کہا۔

"کیا خاک لکھوں، شیخ صاحب کے بچوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہر روز مہمان، ہر شب مہمان یہ زیادتی اور ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟"

"اللہ کی رحمت" مسکرا کر کہنے لگی۔

"طنز کرتی ہو؟" میں نے غصے سے کہا۔

"طنز نہیں سچی بات ہے، مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔"

"اور جب مہمان زیادہ اور تنخواہ کم ہو تو رحمت کی "ر" کے اوپر نقطہ خود بخود لگ جاتا ہے اور یہ رحمت زحمت بن جاتی ہے۔

کہنے لگی۔ "شیر بنو شیر"

"اری بھلی مانس، شیر بننا میرے لئے مشکل ہے۔ میں تو بھیڑ ہوں، بھیڑ۔ جس کا جی چاہے میرے باڑے میں گھس آیا، جب جی کیا میرے بال مونڈھ دیئے، جب چاہا کان سے پکڑ کر پیچھے لگا لیا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"

"اخلاق بھی کوئی چیز ہے، آہستہ بولو شیخ صاحب سن لیں گے۔"

"سنئے---" شیخ صاحب بھی کھنکارتے ہوئے کہنے لگے۔

"بھائی! شاہی قلعہ دیکھنے نہیں جانا۔"

"ضرور جانا ہے۔" بیگم بولی۔ "جایئے نا، شیخ صاحب کے ساتھ۔"

"جاتا ہوں۔"

مرتا کیا نہ کرتا، شیخ جی کی پوری فیملی کے ساتھ خوب سیر کی اور خوب خاک کھائی۔

جوں جوں بجٹ کم ہوتا گیا میری چال میں لڑکھڑاہٹ نمودار ہوتی رہی اور سوچ رہا تھا کہ تانگے والا سچ کہتا تھا۔ جب میں اور میرا دوست

تانگے پر سوار ہوئے تو بوڑھے کوچوان نے اپنے مریل گھوڑے کو چابک مار کر کہا۔

"ارے بدمعاش، چلتا تو ایسے ہے جیسے پچیس تاریخ کو کلرک چلتے ہیں۔"

یہ تو بہت پہلے بات ہے۔ آج کل تو پانچ تاریخ کو جیب خالی اور ذہن سوچوں کا اکھاڑہ۔ جس طرح غیر جماعتی اسمبلی ہو جبکہ مہمان کہتا ہے۔

بڑے بامروت ہیں یہ شہر والے
روپے ساتھ لانے کی کوشش نہ کرنا

اللہ اللہ کر کے شیخ صاحب گھر کو سدھارے تو کچھ سکون ملا لیکن گھر تو اب کباڑیئے کی دوکان لگتا تھا۔ یہ چیز ٹوٹی ہوئی، وہ چیز غائب اور دیوار پان کی پیک سے کسی آرٹسٹ کی فن کاری کا مکمل نمونہ۔ واہ شیخ صاحب! واہ۔ ہماری بدقسمتی کہ آپا جی بھی آ گئیں اور آتے ہی ہم پر برس پڑیں۔

"نہ کوئی سلیقہ صفائی کا ہے نہ سادگی تیری سادگی ہے۔"

ہم نے رو رو کر پورا ماجرا سنایا لیکن گھر والی مسلسل ہنسے جا رہی تھی۔

"ہنس لو کبھی تمہارا بھی نمبر آ جائے گا میرے مولا نے چاہا تو۔"

"اچھا اچھا زیادہ بننے کی کوشش نہ کرو اور کچھ لکھ لو ابھی فرصت ہے۔" وہ بولی۔

کاغذ دیکھا تو غائب اور قلم بھی اپنی جگہ نہ تھا۔ شیخ جی کے بچوں نے کاغذ کے جہاز بنا ڈالے تھے۔ جی ہاں کل کو انہوں نے پائلٹ بننا ہے یہ بھی ضروری ہے اور قلم تو پتہ چلا کہ شیخ صاحب نے ازار بند کے طور پر استعمال کیا--- بیڑا غرق ہوا ایسے مہمانوں کا۔ کاغذ قلم منگوایا اور لکھنا شروع کیا۔ کیا لکھوں، میری عقل بے چاری کہیں گھاس چرنے گئی ہوئی تھی اور یہ سوچ کہاں گئی۔ بس یہی سوچ رہا تھا کہ کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ جل تو جلال تو کا ورد کرتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ خواجہ صاحب پورے ساز و سامان کے ساتھ چڑھائی کو تیار کھڑے تھے۔ وہ چار عدد بچوں اور "بے غم" سمیت دروازے پر کھڑے مسکرا رہے تھے اور میری کمبختی میری حالت زار پر قہقہے لگا رہی تھی۔

میں بھی مسکرانے کی تین بار کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر اس ائیر ہوسٹس کو یاد کیا جو مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ "میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔" تب جا کر مسکراہٹ سے ملتی جلتی کوئی چیز چہرے پر گھسیٹ لانے میں کامیاب ہوا۔ گھر والی پھر بھی خوش۔ نہ چہرے پر ملال، نہ ماتھے پر شکن۔ ادھر ہماری حالت کا اندازہ تو آپ کو ہو گیا ہو گا۔ ماتھا جو پہلے ہی پچ کی طرح صاف تھا، بال نہ ہونے کی وجہ سے پورے چار کنال ڈیڑھ مرلے پر محیط تھا اور نیت جلیبی کی طرح پورا پورا منافقانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھی۔

"اب کیا ہو گا محترمہ حاتم طائین صاحبہ!" میں نے جال میں پھنسے ہوئے بھیڑیئے کی طرح بے بسی سے پوچھا۔

"اللہ کرم کرے گا گھبرایئے نہیں۔"

دفتر سے مزید قرض لیا۔ چپراسی مسکرا کر بولا۔ "کیوں میاں! اتنا قرض لے کر پلازہ بنانے کا ارادہ ہے؟"

خون کے گھونٹ پیتا ہوا گھر واپس لوٹا تو ایک نہ شد دو شد کہ شیلا دیوی صاحبہ تشریف فرما تھیں۔

"آیئے آیئے شیلا دیوی صاحبہ! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" زبان نے کہا مگر دل نے ساتھ نہ دیا۔

"میں زوالوجسٹ ہوں جانوروں پر تحقیق کرنے آئی ہوں۔ سوچا آپ سے بھی مل لوں۔"

"بہت اچھا کیا آج کل ویسے میں قابل تحقیق ہوں، بسم اللہ کیجئے۔"

وہ مسکرا دی اور بولی۔ "آؤ سیر کرنے چلیں۔"

میں نے کہا۔ "موٹر سائیکل پر چلیں۔"

وہ بولی۔ "مجھے کیا اعتراض ہے۔"

شیلا کو پیچھے بٹھایا۔ کک لگائی تو دیکھا گھر والی کا چہرہ سرخ ہو گیا جیسے یہ کک اس کے دل پر لگی ہو۔ ☆☆

کتابوں پر تبصرہ

عارف کامران تنولی، جیکب آباد

نام کتاب: کرکٹ گائیڈ
مصنف: صنم آذری
جائے اشاعت: ساقی کتاب گھر، میخانہ روڈ، رند پورہ

زیر تبصرہ کتاب کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے مصنف پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"کرکٹ سے میری دلچسپی کا باعث دراصل ایک واقعہ ہے۔ ہوا یوں کہ ایک بار ایک کرکٹ میچ میں مجھے بطور مہمان خصوصی بلایا گیا۔ جس وقت میں مطلوبہ جگہ پہنچا اس وقت تک میچ آخری مراحل میں تھا۔ میں نے اپنی مخصوص نشست سنبھالی اور منتظمین سے میچ کے متعلق پوچھا کہ کون سی ٹیم جیت رہی ہے اور کس نے کتنے گول کئے ہیں۔ واضح رہے کہ اس

وقت تک میں کرکٹ کی کاف سے بھی واقف نہ تھا۔ میرے پوچھنے پر ایک صاحب نے بتایا کہ جناب کرکٹ میں گول نہیں ہوتے، رنز ہوتے ہیں اور بیٹنگ کرنے والی ٹیم کو اس وقت جیتنے کے لئے صرف ایک رن کی ضرورت ہے۔ ''رن'' کا لفظ سن کر میں تو ہتھے سے اکھڑ گیا اور منتظمین کو کھری کھری سنانے لگا کہ یہ کیا بیہودہ کھیل ہے جس میں جیتنے کے لئے رن کی ضرورت پڑتی ہے---غرض میں نے چادر اور چار دیواری کے موضوع پر اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ منتظمین نے مجھے بڑی مشکل سے چپ کرایا اور مجھے سمجھایا کہ مذکورہ رن سندھی یا پنجابی زبان والا لفظ رن نہیں بلکہ انگریزی والا ہے۔ پھر تو میں بے حد شرمندہ ہوا اور میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ نہ صرف خود کرکٹ سیکھوں گا بلکہ اس سلسلے میں دوسروں کی رہنمائی بھی کروں گا' لہٰذا یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔''

معزز قارئین! تو یہ ہے وہ سبب جس کی وجہ سے آذری صاحب سے یہ کتاب سرزد ہوئی۔

مصنف نے مذکورہ واقع کے بعد واقعی کرکٹ میں بڑی مہارت حاصل کر لی البتہ کہیں کہیں تھوڑی سی کسر رہ گئی۔ مثلاً کتاب کے آخری باب ''کرکٹ کے کچھ ریکارڈز'' میں لکھتے ہیں۔

''سمیع اللہ وہ واحد کرکٹ ہیں جنہوں نے پہلے ہی ٹیسٹ میں ڈبل سنچری بنائی۔''

ہاکی سے شغف رکھنے والے لوگ اب یقیناً ہاکی کے فلائنگ ہارس یعنی سمیع اللہ سے شکوے شکایات کریں گے کہ وہ اپنے زمانے میں بیک وقت دو کھیلوں میں ید طولی رکھتے تھے اور عوام کو انہوں نے کبھی بتایا ہی نہیں۔

نام کتاب: وارداتی شاعر   شاعر: مرزا ڈھانچہ
قیمت: پونے ڈھائی سو روپے   صفحات: پانچ کلوگرام
جائے اشاعت: دھواں دھار لائبریری' آتش آباد

زیر تبصرہ مجموعہ کلام مرزا ڈھانچہ کی ایک سو پچیس ویں تصنیف ہے۔ موصوف پچھلی نصف صدی سے شعر اگل رہے ہیں' بقول ان کے' اس مجموعہ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں تمام کی تمام شاعری وارداتی شاعری ہے یعنی بے اختیار کہی گئی ہے۔ ہم نے بہت ہی غور وفکر کیا تب کہیں جا کر کتاب کے نام کی وجہ تسمیہ سمجھ میں آئی۔ شاعر نے کچھ پرانے اور نئے شاعروں کی غزلوں کا دھڑن تختہ کر کے جس طرح وارداتی شاعری تخلیق کی ہے اس کو سمجھنے کے لئے زیادہ تفصیل میں جانے کی بجائے صرف ایک شعر پڑھ کر آپ دیکھ لیں گے کہ واقعی ادبی ڈکیتی کی واردات کے نتیجے میں رونما ہونے والی شاعری وارداتی ہی کہلائے گی۔ شعر ملاحظہ ہو---

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

نام کتاب: کولمبس کے تعاقب میں   مصنف: آکاش فرشی
قیمت: تین سو روپے علاوہ منگل' بدھ
مقام اشاعت: مکتبہ منہ زور' خواہ مخواہ روڈ

زیر تبصرہ کتاب جناب آکاش فرشی کا سفرنامہ ہے اور یہ کوئی عام سا سفرنامہ نہیں ہے' یہ اپنی نوعیت کا منفرد سفرنامہ ہے کیونکہ مصنف نے بغیر سفری صعوبتیں برداشت کئے اور بغیر کوئی پیسہ خرچ کئے اسے اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر لکھا ہے لیکن اسے پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے مصنف کے آباؤ اجداد نیویارک کی چوپال میں امریکی کسانوں کے ساتھ بیٹھ کے حقے اور لسی سے شغل فرماتے تھے کیونکہ مصنف نے امریکہ کی ایک ایک چیز کے متعلق تفصیل سے لکھنے کے ساتھ ساتھ جغرافیہ اور تاریخ کا جس طرح تیاپانچہ کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ موصوف نے جو نئے انکشافات کئے ہیں' ان میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں۔

☆ کولمبس نے امریکہ دریافت کرنے کا آغاز منڈی بہاؤالدین سے کیا' اور شنکیاری سے ہوتا ہوا ٹنڈو آدم پہنچا جہاں اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ایک سپر پاور ملک دریافت کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔

☆ شکاگو اور شکار پور کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ مثلاً شکاگو میں بھی رات ہوتی ہے اور شکار پور میں بھی' اسی طرح آسمان اور سورج بھی دونوں شہروں میں ایک جیسے ہی ہیں۔

☆ امریکہ میں یوں تو بہت سے پھل کھائے جاتے ہیں مگر عوام میں کریلا بے حد مقبول ہے۔ بڑے بڑے الیکٹرانکس اسٹورز پر عوام کریلے خریدنے کے لئے قطاروں میں کھڑے ہوتے ہیں۔

قارئین! ہمیں مصنف سے چونکہ دلی ہمدردی ہے لہٰذا ہم اسے یہ نیک مشورہ دیں گے کہ وہ آج ہی اپنی حفاظت کے لئے حکومت سے رجوع کریں ورنہ امریکہ کے بارے میں انہوں نے جو جو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ سی آئی اے اسے آسانی سے معاف نہیں کرے گی۔

نام کتاب: جیو اور مرنے دو   مصنف: سبز باغ پوری
جائے اشاعت: ریشہ دوانیاں بک ہاؤس' سازش روڈ

جناب سبز باغ پوری وطن عزیز کے بزرگ سیاست دان ہیں' اور ان کی کتاب کا موضوع بھی سیاست کے گرد و پیش ہی ہے۔ انہوں نے کتاب میں متعدد واقعات کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا لمحہ لمحہ عوام کی خدمت کرتے گزرا ہے اور ان کا ہر عمل عوام کے

وسیع تر مفاد میں ہی ہوتا ہے۔ کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "ایک بڑا الزام جو میرے مخالفین اکثر مجھ پر لگاتے رہتے ہیں کہ میں حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنی وفاداریاں بھی تبدیل کرتا رہتا ہوں اور ہر نئی حکومت کو انقلاب کی نوید اور پچھلی حکومتوں کو غاصب اور ان کی دور حکومت کو سیاہ ترین دور قرار دیتا ہوں۔ ان نادانوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر میں وقتاً فوقتاً حکومت میں کوئی وزارت لیتا رہتا ہوں تو اپنے ذاتی فائدے کے لئے نہیں لیتا بلکہ اس میں بھی عوام ہی کا فائدہ ہوتا ہے۔"

بلاشبہ جناب سبز باغ پوری کا حرف حرف درست اور حقائق پر مبنی ہے اور سیاست تو ہے ہی خلوص دل سے خودغرضی کا مظاہرہ کرنے کا نام' اگر ہم نے مزید کچھ لکھا تو وہ بھی لکھیں گے کہ لکھتا ہے۔

نام کتاب: گزشتہ سال کی فلموں کا جائزہ
مصنف: کیمرہ لائٹ آبادی قیمت: دس روپے کلو

محترم لائٹ آبادی ایک طویل عرصے سے فلمی صنعت سے چپکے ہوئے --- معاف کیجئے گا وابستہ ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے گزشتہ سال ریلیز ہونے والی فلموں کے متعلق تفصیلات مہیا کی ہیں اور ان کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ مصنف خود بھی ایک کہنہ مشق فلمساز ہیں۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ خود ہی فلم بناتے ہیں' ہیرو بھی خود ہی ہوتے ہیں' ہدایت کاری گلوکاری اور دیگر اہم فرائض بھی خود ہی سرانجام دیتے ہیں۔ ہماری ناقص رائے میں تو پھر موصوف اپنی فلموں کو دیکھتے بھی خود ہی ہوں گے کیونکہ فلم بین یہ خطرہ نہیں مول لے سکتے۔ زیر تبصرہ کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ایک اور رجحان جو آج کل ہماری فلموں میں پرورش پا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے ہدایت کار علم میں کچھ غیر ضروری مناظر بھی شامل کر دیتے ہیں جن کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک فلم "کمینوں کی بارات" میں اداکار پریشان ماہی جس گھوڑے پر ایک کار کا پیچھا کر رہا ہوتا ہے تو اس موقع پر گھوڑے کو فطری تقاضے کی تکمیل کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے' جس سے یقیناً سیٹ بھی نم آلود ہو گیا ہو گا۔"

اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"فلم "نہیں کبھی نہیں" میں ہیروئن کی ماں اور باپ دونوں وفات پا چکے ہیں لیکن ہیروئن کے میک اپ اور بناؤ سنگھار میں کمی کی بجائے اضافہ ہی نظر آتا ہے۔ آخر ہمارے ہدایت کار کب ہوش کے ناخن لیں گے۔"

غرض کتاب میں مصنف نے فلم سازوں کی غلطیوں پر سختی سے گرفت کی ہے اور آخر میں اپنی ایک نئی فلم "بھاگو ہوا سویرا" شروع کرنے کی دھمکی بھی دی ہے۔

☆☆

ماڑے میاں

✿ نویدہ ناز' نواں شہر ایبٹ آباد

ہمارے ایک عدد کزن ہیں۔ نام تو ان کا کچھ اور ہی ہے مگر "ماڑا" کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ تعارف ان کا کچھ یوں ہے کہ بڑی بڑی نیلی آنکھیں ڈیلوں سمیت ہر وقت زمانہ کی رفتار کے ساتھ گردش کرتی رہتی ہیں۔ سوجے ہوئے موٹے مسوڑھوں سے جھانکتے دانت ہر وقت نیچرل ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بنے رہتے ہیں۔ زیادہ روشنی کو وہ ہمیشہ صرف ایک آنکھ سے ملاحظہ فرماتے ہیں کیونکہ تیز روشنی میں ان کی آنکھیں بند اور منہ کھل جاتا ہے۔ مرغیوں سے وہ پیدائشی شفقت سے پیش آتے ہیں اور تقریباً ڈیڑھ درجن مرغیاں ان کے زیر سایہ دانہ دنکا چنتی رہتی ہیں۔ مرغیوں سے ان کے احساس کا ناطہ بڑا گہرا ہے۔ اس لئے اکثر و بیشتر مرغیوں کے اردگرد ہی پائے جاتے ہیں۔ عمر عزیز کی تقریباً تیرہ منزلیں ٹاپ چکے ہیں۔ ان کا صبح سویرے اٹھنے کے بعد پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ گھوڑے کی آواز سے مشابہ آواز نہار منہ اپنے حلق سے خارج کریں اس لئے وہ اٹھتے وقت عجیب وغریب آواز ضرور بلند کرتے ہیں۔ اس کے بعد مرغیوں کے ڈربے کی طرف آ جاتے ہیں۔ اس وقت وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں والی چنگیر سر پر لئے ہوتے ہیں تاکہ مرغیوں کے پیٹ پوجا کا انتظام کر سکیں۔ ساتھ ساتھ ان کے لبوں پر گڑگڑاہٹ بھری آواز میں نغمہ ہوتا ہے۔ "سانوں نہر والے پل تے بل کے"--- اور درمیان میں ہی اس کی تان ٹوٹ بھی جاتی ہے کیونکہ دانے دنکے کی خاطر مرغیوں میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس دوران وہ اپنی ایجاد کردہ گالیوں کا نسخہ پر آزماتے ہیں اور گالیاں اس وقت تک دیتے رہتے ہیں جب تک تازہ ترین جھاڑ انہیں نہ پڑ جائے۔

انہیں مرغیوں کا ریسرچ ڈاکٹر بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ انہیں یہ پتہ ہوتا ہے کہ اس وقت کون سی مرغی کیا جاہ رہی ہے۔ کون سی انڈہ دینے کی تیاری میں ہے۔ کالو اس وقت دانہ کیوں نہیں چگ رہی۔ پیلو کے مزاج کیوں برہم ہیں۔ لینگو کل انڈہ پڑوسیوں کے گھر کیوں دے آئی تھی۔ مصری یوں آنکھیں بند کئے وجد کے عالم میں ایک ٹانگ پر کھڑی ہے۔ نانگی آج کیوں رنجیدہ ہے۔

مرغیوں کو دانہ دنکا کھلانے کے بعد ماڑے میاں انہیں گھر کے

ساتھ انہیں ایک کھیت میں چھوڑ آتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ مرغیاں بھی ان کی جدائی زیادہ برداشت نہیں کرسکتیں۔ اس لئے ٹہلتی ہوئی واپس آ جاتی ہیں۔ ان کی مرغیاں ایک عادت بد میں بھی مبتلا تھیں کہ کھیت میں پیٹ پوجا کرکے فراغت صحن میں ہی آ کر کرتی تھیں اور ماڑے میاں ان کی اس حرکت پر سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کرسکتے۔

ماڑے میاں ذاتی طور پر بھوک برداشت نہیں کرسکتے اِس لئے ٹھیک بارہ بجے وہ سگنل دینا شروع کردیتے ہیں اور اگر انہیں بروقت کھانا نہ ملے تو پھٹے ہوئے ڈھول جیسی آواز میں چیخنا چلانا شروع کردیتے ہیں اور پیشتر اس کے کہ گھر والے کسی خاموش مقام کی طرف کوچ کرنے کا سوچیں والدہ انہیں کھانا دے کر بریک لگا دیتی ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ماڑے میاں کے کوچ کئے ہوئے فرشتے واپس آجاتے ہیں اور مار گندم کے باعث پلکیں بوجھل ہو جاتی ہیں اور پھر وہ دہم سے کھری چارپائی پر خراٹے لینے لگتے ہیں۔

سو کے اٹھنے کے بعد وہ پہلا کام مرغیوں کی خیر خبر لینے کا کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے مطمئن ہوکر کرکٹ کی کنٹری شروع کردیتے ہیں اور خود کو مستقبل کا وقار یونس ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔ درمیان میں ان کا چینل تبدیل بھی ہوجاتا ہے اور وہ عطااللہ خیلوی کی آواز میں "اے تھیوا مندری دا تھیوا" بھی گا لیتے ہیں۔

ماڑے میاں اچھے شگون کے طور پر بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ چاند کی پہلی کو گھر کا ہر فرد ان کے منہ کو دیکھ کر چاند دیکھتا ہے اور یوں مہینہ بہت "مبارک" گزر جاتا ہے۔

پچھلے دنوں کا ذکر ہے۔ ماڑے میاں ٹنڈ کرواکر آئے اور آتے ہی گانے لگے۔

"نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے۔"

ابھی انہوں نے یہاں تک غزل کا بیڑا غرق کیا تھا کہ ان کے بڑے بھائی کو غزل پر رحم آگیا اور وہ ماڑے میاں کو گھور کر کہنے لگے۔

"اوئے بیٹھ جا' آج ہی سر کو ائیرپورٹ بنا کر آئے ہو اور آج ہی بال بناؤں کس کے لئے گا رہے ہو۔"

ماڑے میاں کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگے۔

آتے جاڑوں کی ایک شام ماڑے میاں بخار میں مبتلا ہوگئے۔

سارے گھر والے اس کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے کہ کس طرح ماڑے میاں آنکھیں کھولیں اور دوا لے لیں مگر ماڑے میاں ہیں کہ آنکھ ہی نہیں کھول رہے۔ آخرکار ان کی والدہ نے تیر بہدف نسخہ آزمایا اور بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔

"ماڑے بیٹے! اُٹھ جاؤ دیکھو تو تمہارے لئے اباجان دو نئی مرغیاں لائے ہیں۔" ماڑے میاں چھلانگ لگا کر مرغیوں کا دیدار کرنے یہ جا اور وہ جا۔

لوڈشیڈنگ کے دنوں میں بجلی جانے کے وقت ماڑے میاں چپکے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب بجلی واپس آتی ہے تو اپنی مخصوص جناتی زبان میں ہنہناتے ہیں۔ پانی پیتے وقت اس بات کا ضرور خیال رکھتے ہیں کہ دن میں آٹھ گلاس ضرور پانی پینا چاہئے مگر پیتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ دن میں آٹھ بار پینا ہے یا ایک وقت میں۔

رات کو ٹھیک گیارہ بجے جاگتے ہیں اور حوائج ضروریہ سے فراغت پا کر تین کٹورے پانی پی لیتے ہیں۔ اکثر دیر سے سونے والے ستم ظریف ان کے ٹھیک گیارہ بجے الارم دینے سے اپنی گھڑیاں ٹھیک کرلیتے ہیں۔ نہانا ماڑے میاں کے لئے دنیا کا مشکل ترین کام ہے اس لئے یہ فرض ابھی تک ان کی والدہ بجالاتی ہیں۔ جس وقت ماڑے میاں غسل فرما رہے ہوتے ہیں یوں لگتا ہے کہ دو جنگلی بلیاں آپس میں غراغرا کر رہی ہیں۔

ماڑے میاں کو ان زمانوں کے قصے سننے کا کریز ہے جب آٹا ایک روپیہ سیر ملا کرتا تھا۔ وہ اپنے بڑے بوڑھوں سے انٹرویو بھی لیتے رہتے ہیں کہ وہ کب پیدا ہوئے' آیا انہیں انگریزی گنتی آتی ہے یا نہیں۔

ایک دفعہ ان کے ابا حضور نے انہیں کسی غلطی کی بنا پر مارنا شروع کر دیا۔ آگے آگے ماڑے میاں اور پیچھے پیچھے والد محترم۔ بھاگتے بھاگتے وہ اپنے تایا کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ ان کی چیخ پکار پر تایا باہر آئے اور ماڑے کے والد کو ڈانٹنے لگے۔ ماڑے میاں کو بھی موقع مل گیا۔ کہنے لگے۔

"اباجی اب ماریں نا' تو بات بنے۔"

اس کے بعد وہ کوئی بھی سامنے گلا پھاڑ پھاڑ کر رد یا کرے۔

ماڑے میاں اپنی ذات میں ایک انجمن کی مثال ہیں۔ ☆☆

پنجگانہ نماز

✿ سید شعبان گیلانی

یوں تو ہم میں سے اکثر لوگ نماز ایسے نہیں پڑھتے جس طرح پڑھنی چاہئے یا جیسے کہ نماز پڑھنے کا حق ہے۔ بچگانہ نماز یعنی بچپن کی نماز یا اِسے بچوں کی نماز بھی کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک میرا ذاتی معاملہ ہے تو یکبارگی ماں نے نمازِ فجر پڑھوائی تھی کہ یوں پڑھو' پھر میں خود ہی پڑھنے

لگا۔ مجھے آج بھی یاد ہے میری والدہ دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھی تھیں اور بتا رہی تھیں کہ ثناء پڑھو تعوذ تسمیہ --- بچپن میں میں اکثر پنجگانہ نماز ہی پڑھا کرتا تھا۔ جائے نماز پر کھڑا ہوتا' گھڑی پہ وقت دیکھتا' دو رکعت نیت کر رہا ہوں تو ایک منٹ میں سلام پھیرلوں گا' چار رکعات کی نیت کر رہا ہوں تو دو منٹ میں سلام پھیرلوں گا۔ مسجد میں نماز ادا کرتا تو ساتھ موجود دوسرے شخص پہ بھی ایک نظر رکھتا کہ وہ کون سی رکعت میں ہے۔ میں اگر اِس سے پیچھے ہوتا تو دھیرے دھیرے ریس پکڑنا شروع کرتا اور پھر اِس سے پہلے سلام پھیر کر اِس پر ایک فاتحانہ نظر ڈالتا۔

میرا ایک کزن ہے جس دِن اُس نے نماز کی سنگِ بنیاد رکھنا چاہی میری مدد مانگ لی۔ میں وقتِ ظہر بشمول اپنی خدمات کے اُن حضرت کے ہاں جا پہنچا۔ کزن نے اعلان کیا کہ اِس نے وضو کرلیا ہے۔ میں نے ایک نظر اُس کے بوتھے شریف پہ ڈالی اور بولا۔

''تمہارا چہرہ دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ تم نے پچھلے چھ دِن سے منہ نہیں دھویا' کیا سات دِن پہلے وضو کیا تھا؟''

وہ بولا۔ ''ابے یار! آج کل ہمارے پانی میں کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔ چاہے جتنی بار بھی اِس سے منہ ہاتھ دھولو محسوس ہی نہیں ہوتا۔''

میں نے اُس کی فضول بکواس سنی اور گویا ہوا۔ ''اچھا یہ تو بڑا گمبھیر مسئلہ ہے' اِس کا کچھ حل نکالتے ہیں --- ابھی آؤ جلدی سے' یہ جائے نماز تمہاری منتظر ہے۔''

وہ صاحب جائے نماز پہ آوارد ہوئے۔ نیت کروائی گئی۔

''اَب ثناء پڑھو۔'' میں نے کہا۔

کچھ لمحے بعد موصوف نماز توڑ کر میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''چلو جی' پڑھ لی مگر تم لوگ تو سجدے بھی کرتے ہو اور کچھ دیگر حرکات بھی۔ میں نے کھڑے کھڑے ہی پڑھ لی --- اچھا اچھا میں نے آج ہی شروع کی ہے اِس لیے تھوڑی رعایت ہوگی۔ ہے نا؟''

کچھ دِن پہلے نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لیے مسجد میں حسبِ معمول لیٹ پہنچا مگر لگتا تھا کہ آج مسجد کی دیوار پر آویزاں گھڑی میں نئے سیل ڈالے گئے تھے اِسی لیے اُس کے ٹائم اور میری گھر کی گھڑی کے ٹائم میں زمین آسمان کا فرق تو نہ تھا مگر سورج آسمان کا فرق ضرور تھا اِس لیے بُرے نصیب کہ آخری صف میں جگہ ملی جو کہ خالصتاً بچگانہ صف تھی کیونکہ اگلی صفیں نمازیوں سے کھچا کھچ بھری تھیں اور مجھ جیسے ''صحت مند'' شخص کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت سے محروم تھیں۔ جماعت کھڑی ہوئی تو میرے پاس موجود بچہ بیٹھ گیا (جس نے مولوی صاحب کی تقریر کھڑے ہو کر سنی تھی) اِس کے ساتھ ہی دیگر بچوں کی طفلانہ حرکات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میری بغل میں کھڑا بچہ اِن سب کا اُستاد معلوم ہوتا تھا۔ کبھی میرے منہ کو دیکھتا' کبھی کسی اور کا دیدار کرتا۔ اِسی لمحے ایک اور بچہ جو اِسی کا ہم عمر تھا' مسجد میں داخل ہوا اور میری دوسری سائیڈ کھڑا ہوا اور باقاعدہ با آوازِ بلند ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے ہاتھ فضا میں ایسے بلند کرلیے جیسے سر سے دو فٹ اُونچی دیوار پر چڑھنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ پھر ہاتھ باندھتے ہی نجانے اُسے کیا سوجھی کہ اپنی اِس جگہ کو خیر آباد کہتے ہوئے میرے آگے سے گزرا اور دوسری جانب موجود بچے کو دھکیلتا ہوا اُس کی جگہ پر غاصبانہ قبضہ کرلیا اور وہاں پہلے سے موجود بچہ بے چارہ اپنی جگہ سے محروم ہوگیا۔ اَب منظر کچھ یوں تھا کہ ایک بچہ صف میں کھڑا ہے تو دوسرا ایک قدم آگے اِسی کی طرف منہ کیے اُسے گھورے جا رہا ہے۔ جب رکوع میں جھکے تو ایک نے میری اور دوسرے بچے کی کمر پر یوں ہاتھ ٹکا لیے جیسے ہماری کمر پر پانی کا گلاس رکھا ہوا ہو اور اُس نے گلاس کو گرنے سے بچالیا ہو۔ یکدم ہی اُس کے ننھے ہاتھوں میں جنبش ہوئی اور وہ یوں میری کمر پیٹنے لگا جیسے ڈھول پیٹ رہا ہو۔ شیطان نے مجھے گدگدی کی اور ہنسی کا فوارہ منہ سے چھوٹنے ہی والا تھا کہ زبردستی منہ بھینچ لیا۔ ''قبر کا عذاب'' کے ڈراؤنے سین یاد کر کے روہانسی شکل بنانے لگا مگر جب ایک بچے نے دوسرے کو دورانِ نماز ہی باہر چلنے کا حکم صادر فرمایا تو میں سب کچھ بھول گیا اور پھر سے ہنسی روکنے کی ناکام سعی میں مصروف ہوگیا۔

جب وقت سب نمازی گھٹنے موڑ کر اور دوزانوں ہو کر بیٹھے اور لگے التحیات پڑھنے تو ایک ننھے میاں بار بار اپنا پیٹ شریف منہ کی طرف لے جاتے (نہ میرے منہ کی طرف اور نہ ہی اپنے منہ کی طرف بلکہ دوسرے ننھے میاں کی طرف) اِن حضرت نے بھی کچھ لمحے صبر کیا مگر جب کنفرم ہو گیا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں بلکہ خاموشی اور صبرِ جمیل سے بھی نہیں مانتے تو بھرپور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جان سینا کے سٹائل میں ایک زوردار مکا اُس کے پیٹ شریف پہ دے مارا مگر اِس لمحے وہ بچہ بھی گریٹ کالی کی سی طاقت سمائے کھڑا تھا' ہلا تک نہیں --- اِن ہی نازیبا حرکات کے دوران سلام پھیر لیا گیا۔ میں نے دونوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی' پھر دُعا میں مشغول ہوگیا کہ دُعا عبادت کا مغز ہے اور یہ بچے تو ابھی عقل کے کچے ہیں۔ ایک صاحب جن کے پاس شاید دُعا کے لیے وقت نہیں تھا' عجلت میں اُٹھے تو بیچ صف کے کھڑے بچے سے ٹکرا گئے جس کے نتیجے میں وہ بچہ دھڑام سے مجھ پہ آ گرا اور میں نے اُسے کان سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

☆☆

بوائے کٹ کرانے والی عورتیں، عورت کہلانے کی حقدار ہیں کیا؟ ☺ پرنس کشمیری

ٹکریں

پیراڈی ایک دقیق فن ہے اور اِس فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی شعر میں الفاظ کا کچھ ایسا ہیر پھیر کیا جائے کہ اس کا مفہوم یکسر بدل جائے اور شعر کی "صحت" پر بھی مضر اثرات نہ پڑیں۔ اسی رہنما اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپ فلمی نغموں اور فلمی و غیر فلمی نظموں، غزلوں کی دُرگت بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ اِس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو اصل کلام کے ساتھ اپنی کوشش ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم یہاں اِسے شائع کریں گے تاکہ دوسرے بھی اِس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اپنی "ٹکریں" اِس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج ٹکریں تیس روزہ "چاند" F-31، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور 54600

فلم "شرافت" کا شاعر

شریفوں کا زمانے میں اجی بس حال وہ دیکھا
شرافت چھوڑ دی مَیں نے، شرافت چھوڑ دی مَیں نے
محبت کرنے والوں کا یہاں انجام وہ دیکھا
محبت چھوڑ دی مَیں نے، محبت چھوڑ دی مَیں نے
چھڑا کر ہاتھ اپنوں سے چلی آئی مَیں غیروں میں
پہن کر گھنگھروؤں کی پھر وہی زنجیر پیروں میں
مَیں گاؤں گی، مَیں ناچوں گی اشاروں پہ ستمگاروں کے
بغاوت چھوڑ دی مَیں نے، بغاوت چھوڑ دی مَیں نے
نہ ہیرا ہے، نہ موتی ہے، نہ چاندی ہے، نہ سونا ہے
نہیں قیمت کوئی دِل کی، یہ مٹی کا کھلونا ہے
مری دیوانگی دیکھو کہ کہنا مان کر دِل کا
یہ دولت چھوڑ دی مَیں نے، یہ دولت چھوڑ دی مَیں نے

آوارہ بلی ٹنگوی

وکیلوں کا جلوسوں میں اجی بس حال وہ دیکھا
وکالت چھوڑ دی مَیں نے، وکالت چھوڑ دی مَیں نے
الیکشن لڑنے والوں کا یہاں انجام وہ دیکھا
سیاست چھوڑ دی مَیں نے، سیاست چھوڑ دی مَیں نے
چھپا کر مَیں نے رکھ دی ہے ہیروئن بس کے ٹائروں میں
اِسے لے جا کے بیچوں گا دیہاتوں اور شہروں میں
جسے پی کر تباہ ہوں گے بچے سرمایہ داروں کے
شرافت چھوڑ دی مَیں نے، شرافت چھوڑ دی مَیں نے
نہ آڑو ہے، نہ لیموں ہے، نہ کنو ہے، نہ کیلا ہے
نہیں عزت کوئی ناظم کی، یہ کڑوا کریلا ہے
مری مردانگی دیکھو کہ کہنا مان کر دِل کا
نظامت چھوڑ دی مَیں نے، نظامت چھوڑ دی مَیں نے

یادش منصور

عجب سی بے یقینی میں گھرا تھا
یقیناً راہ سے بھٹکا ہوا تھا
اگر چاہت نہ تھی، مجھ سے بچھڑ کے
تو کیوں مڑ مڑ کے پیچھے دیکھتا تھا
ہنسی آتی ہے اپنی بے بسی پہ
کہ اُس نے جو کیا، اچھا کیا تھا
حوالے کر کے خود کو کھیتیوں کے
وہ اِک دریا جو پیاسا مر گیا تھا
میرے ہاتھوں سے خوں اب تک رواں ہے
یہ کس کا فیصلہ مَیں نے لکھا تھا

جئے چند چوہان

بس اتنی بات پر مجھ سے خفا تھا
میرا فٹ بال اُس کے گھر گرا تھا
اگر مقروض وہ میرا نہیں تھا
تو کیوں مڑ مڑ کے پیچھے دیکھتا تھا
میرے جلسے میں اُس نے سانپ چھوڑے
بتائیں، یہ کوئی اچھا کیا تھا
حوالے کر کے خود کو سالیوں کے
وہ اِک جیجا جو گنگلا ہو گیا تھا
مَیں اُس سے کیسے کرتا بیوفائی
بڑا مسکین اُس کا تھوبڑا تھا

فلم "شمع اور پروانہ" کا شاعر

دِل تری یاد میں جب بھی گھبرائے گا
کون یادوں کو زنجیر پہنائے گا
سنگدل ہے جہاں، پیار مجبور ہے
دیکھ تو زندگی کتنی بے نور ہے
کس طرح بن ترے مجھ کو چین آئے گا
ساتھ گزری ہوئی ہر خوشی کی قسم
اے مرے ہمسفر، تیرے جانے کا غم
نقش بن کر مرے دِل میں رہ جائے گا

نوید ظفر کیانی

تیرے کوچے میں فدوی جو منڈلائے گا
کون گنجے کو زنجیر پہنائے گا
سنگدل تیری ماں، باپ مغرور ہے
دیکھ، عاشق ترا کتنا مجبور ہے
کس طرح ووٹ تیرا اُسے آئے گا
آتی جاتی ہوئی ہر کڑی کی قسم
اے مرے ہمسفر تیرے جانے کا غم
"بھونڈیاں" بن کے دیدوں میں رہ جائے گا

نامعلوم

مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سرِ بزم رات یہ کیا ہوا
میری آنکھ کیسے چھلک گئی، مجھے رنج ہے یہ بُرا ہوا
مجھے جو بھی دُشمنِ جاں ملا، وہی پختہ کارِ جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی، نہ کسی کا تیر خطا ہوا
مجھے ہمسفر ملا بھی کوئی، تو ستم نصیب میری طرح
کہیں منزلوں کا تھکا ہوا، کہیں راستوں کا لٹا ہوا
مجھے کل گلی میں پڑا ہوا کسی بدنصیب کا خط ملا
کہیں خونِ جگر سے لکھا ہوا، کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا
وہ لوگ جو گزر گئے میرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ میرے ہی شہر کے لوگ تھے، میرے گھر سے گھر تھا ملا ہوا

توصیف احمد توصی

مجھے اپنی نبض پہ ناز تھا، سرِ شب برات یہ کیا ہوا
میری آنکھ کیسے پھٹ گئی، مجھے رنج ہے، یہ بُرا ہوا
مجھے جو بھی یہاں مکاں ملا، وہی خستہ حال اور گرا ہوا
نہ کسی کی چھت صحیح پڑی، نہ کسی کا در سجا ملا
مجھے ہمسفر ملا بھی گر، تو بہت غریب میری طرح
کہیں سر قرض سے دبا ہوا، کہیں کوٹ اِس کا پھٹا ہوا
مجھے آج بیرنگ ڈاک سے میری ساس کا جو خط ملا
کہیں دھمکیوں سے بھرا ہوا، کہیں گالیوں سے سجا ہوا
وہ شخص جو گزر گیا میرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ میرے ہی گھر کا فرد تھا، میرے بیڈ سے بیڈ تھا ملا ہوا

[illegible]

مٹا کب نشیمن کا نام و نشاں ہے
زمیں سے فلک تک دھواں ہی دھواں ہے
سمندر سے پوچھوں کہ لہروں سے پوچھوں
جسے مَیں نے چھوڑا، وہ کشتی کہاں ہے
کسی کو میسر نہیں ہے سکوں بھی
سکوں بس وہیں ہے، محبت جہاں ہے
تری ہمسفر ہے میری شاعری بھی
اگر توں جواں ہے، غزل بھی جواں ہے
اکیلا لڑا ہوں سدا دُشمنوں سے
کہاں کارواں ہے، کہاں پاسباں ہے

سید شعبان گیلانی

مٹا کب سگریٹ کا نام و نشاں ہے
زمیں سے فلک تک دھواں ہی دھواں ہے
سمندر سے پوچھوں کہ لہروں سے پوچھوں
جسے مَیں نے چھوڑا، کڑی وہ کہاں ہے
کسی کو میسر نہیں ہے سکوں بھی
سکوں بس وہیں ہے "بڑیا" جہاں ہے
تری ہمسفر ہے میری شاعری بھی
اگر تو جواں ہے، اپن بھی جواں ہے
اکیلا لڑا ہوں تیرے عاشقوں سے
کہاں کارواں ہے، کہاں پاسباں ہے

انڈین چینلز نے نئی نسل کو وقت سے پہلے بالغ کر دیا ہے ☺ پرنس کشمیری

سندیسے

''چانذ'' کے شوخ وشریر ساتھیوں کی آپس میں ہنستی مسکراتی سرگوشیوں کے علاوہ چھیڑ خانی والی ''تو تو' میں میں'' کے لئے یہ کالم مخصوص ہے۔ آپ بھی کسی کے نام اپنے دِل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں تو ہم بلا معاوضہ آپ کا یہ پیغام پہنچا دیں گے لیکن ذرا حدِ اَدب کا خیال رہے اور طوالت کا بھی --- سندیسے اِس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج سندیسے تمیر روزہ ''چانذ'' ، شمع پلازہ ، فیروز پور روڈ ، لاہور 54600

شاہ جی! السلام علیکم ۔ احقر تا حال صاحب فراش ہے۔ علاج جاری ہے۔ انشاء اللہ، ایک ماہ کے بعد غسلِ صحت کروں گا۔ ان گنت دوستوں ، کرم فرماؤں، بچے اور بچیوں نے فون یا موبائل کے ذریعے میری عیادت کی، میں آپ کی وساطت سے اُن سب کا انتہائی ممنون ہوں تاہم وہ جو کہتے ہیں کہ شوک دا کوئی مُل نئیں ، اس کے مصداق بستر پر لیٹے لیٹے ہی (عالم ہوش میں) چند قطعات کہہ ڈالے۔ میں ایک بار پھر تمام چکوروں سے اپنی صحت یابی کی دُعا کے لئے عرض گزار ہوں۔

۞ پروفیسر محمد ظریف خان، کراچی
موبائل نمبر: 0321-2125603

☆

سب چکوروں اور چکورنیوں کو لاکھ لکھ سلام قبول ہو۔ میں یہاں بقلم خود موجود ہوں۔ جس جس نے دیدار کرنا ہے، لائن میں کھڑے ہو کر لیٹ جائیں اور پھر مشرق سے مغرب کی طرف دیکھتے ہوئے کہیں ''او، شہزادے!'' --- آپ بھی سوچ رہے ہونگے یہ چھوکرا تو ایک دم فری ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ بادشاہ لوگو! میں مست ملنگوں کی طرح چلا آ رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ یہ اپنی ہی محفل ہے۔ پھر بھی اگر کسی کے سر میں کھجلی ہو تو وہ اپنے سر کے لئے جوؤں والا شیمپو استعمال کرے۔ پھر بھی میں سب کو کھلی اجازت دیتا ہوں کہ وہ مجھ سے ہاتھ اور پاؤں جوڑ کے معافی مانگ لیں کہ میں تو ہوں ہی شہزادہ!

۞ ساغر شہزادہ
موبائل نمبر: 0334-5851830

☆

جناب خالد بن حامد اینڈ عصمت ضیاء صاحبہ! کیا حال ہیں؟ --- او میرے ''چن'' دے چکورو تے چکورنیو! کی ''حال چال'' اے؟ --- ڈیئر اکبر بخاری! ''میچنگ'' کا شکریہ! --- بابو جان جانی! آپ کتھے گم او؟ --- شوکت علی مظفر! ''بھائی لوگ'' میرے کو آپ کی T.V کاوشوں کا انتظار ہے --- سیّد بدر سعید! رب پاک اور ترقی کامرانی عطا کرے، آمین --- اکبر ملک! جناب، وہاں کیا ہو رہا ہے آج کل؟ --- کامران شہزاد، انور اللہ مغل! سلام قبول ہو --- ڈیئر مبشر حسین شاہ! کوشش تو کرتا ہوں آپ سے ملوں مگر --- شوکت سیال! دعائیں --- شبانہ گیلانی، علیزہ ساحل! آپ لوگوں کے S M S نہیں مل رہے، کیوں؟ نمبر وی change؟ --- سعیدہ زینب! زندہ ہو؟ --- مہک خانہ خرابہ! کیسی ہیں آپ؟ سلام قبول ہو۔ آپ مجھ سے رابطہ کریں ''ام'' کو بات کرنا سی ضروری --- پیارے چکورو تے چکورنیو! سدا خوش رہو --- وقت ملا تو پھر لکھوں گا، باقی چکوروں اور چکورنیوں کو موسٹ ویلکم!

۞ ایس ایچ ساگر، بھکر
موبائل نمبر: 0345-3209630

☆

قابل صد احترام خالد بن حامد صاحب! آداب و تسلمات ۔ چاند پوری ضو فشانی سے جلوہ گر ہے۔ اس بار کارٹون بہت غضب کے ہیں۔ خاص طور پر مہنگائی کے بارے میں سیاسی اکابرین کے عزائم کو جس خوبی اور پیارے انداز سے پیش کیا گیا ہے، قابل صد تعریف و تحسین ہے --- واپڈا کا نام اگر ''کانکا'' رکھ دیا جائے تو کیا اچھا ہو۔ کانکا یعنی کاٹنے والا۔ کانکے نے عوام کو کاٹ کر کے رکھ دیا ہے اور ہر عضو سے ''ہائے ، بجلی'' کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں --- پیارے فضل کریم شگفتہ! ہم تو آپ کی شگفتگی کے قربان ہو گئے ہیں۔ آپ نے جس خوبصورت انداز میں بندہ ناچیز اکبر بخاری کی نئی کتاب ''تمہیں اکبر بخاری چاہتا ہے'' کے لئے اظہار خیال کیا ہے، میرے لئے بے حد اعزاز کی بات ہے۔ اصل میں دوستوں کی محبت ہی تو ہے جو زندگی کا سبب ہے ورنہ جینے کا بھی کیا فائدہ --- اُس ماہ سندیسے کا عنوان ہی سرے سے غائب ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ صرف میری وجہ سے ہے کیونکہ پچھلے ماہ میں آپ کو خط نہ لکھ سکا تھا۔ آپ نے میرا خط نہ ہونے کے بعد باعث سندیسے ہی کو غائب کر دیا۔ بہت شکریہ، بہت نوازش، سات فرشی سلام۔ جناب! میں بھی حاضر ہوں اور خط بھی حاضر ہے لہٰذا سندیسے کا عنوان مستقل قائم جاری رہنا چاہئے --- تنویر پھول اس ماہ چھائے ہوئے ہیں --- کیا بات ہے، پیارے محمد سعید خان! آپ کے ہاتھ چوم لینے کو دل کرتا ہے اور آنکھیں بھی کہ کس خاص زاویہ نگاہ سے ''نگاہِ انتخاب'' عمل میں آتا ہے --- شاہد اطہر! ''کچھ ادھر کی، کچھ اُدھر کی'' میں چاند کے لکھاریوں کی بہت ساری خوبیوں سے آگاہ ہوا ہوں اور دل بہت شاد ہے۔ ندیم اس خاص حملہ سے آخر بچ ہی گئے ہیں۔ جیو ، شاہد اطہر! --- کیا حسین نظریے، صابر مغل عبدو پوری! ''آپ کا خادم'' کیا مخصوص سٹائل کی چیز ہے، کافی خاصے کی چیز ہے --- چاند جس خوبصورت انداز میں اپنی قہقہہ مار روشنی سے سب کے دل کو منور کر رہا ہے، میرے لئے خاص طور پر بہت اہم ہے۔ اللہ پاک چاند کو تا قیام قیامت اسی طرح تابان و جاری و ساری رکھے، آمین --- چاند کے چکورو اور چکورنیو! آپ وہ لوگ ہو جنہوں نے بالآخر پوری دنیا کی سیر کی سعادت حاصل کرنی ہے لہٰذا اپنے کردار ، افعال اور ادراک کو اس قابل بناؤ کہ جب ہر ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر آئے تو آپ تیار ہو۔

۞ اکبر بخاری
موبائل نمبر: 0301-7560073

☆

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ اور اوجِ کمال عطا فرمائے، آمین --- چکورو اور چکورنیو کی خدمت میں خلوص بھرا اسلام --- چاند گرہن کے باعث کچھ عرصہ ملاقات کا سلسلہ منقطع رہا۔ اللہ تعالیٰ ''چانذ'' کو گرہن سے محفوظ رکھے، آمین! --- عارف مسیح! ہم جیسے لوگوں کو قسطوں میں مرنے کی استثنیٰ حاصل ہے --- افضل! گزشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی میری قسمت لوڈ شیڈنگ کے دوران لکھی گئی سو وہی حال ہے جو پچھلے سال تھا اور ستم بلائے ستم یہ ہے ---

میری قسمت بھی فرشتوں سے لکھائی جاتی ہے
میری ذات پہ اتنا بھی اعتبار نہیں

مسٹر ڈبکلاں! شادی شدہ لوگ کیا خاک جیا کرتے

ہیں؟--- ابرار بخاری! آپ کی ہر تحریر خوب سے خوب تر ہوتی ہے۔ آپ اردو ادب کے محسن ہیں--- فاروق، کے، ایم خالد، ڈاکٹر مشتاق احمد سحر، سمیع اللہ نیازی، منظور احمد اعوان، شاہد اطہر، عرفان اللہ قریشی، مہک! دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ--- مہک! ضلع بھر میں دوئم آنے پر مبارک باد قبول کیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے--- فضل کریم شگفتہ، رفیع یوسفی محرم، مرزا عاصی اختر، کامران شہزاد، اکبر بخاری، اکبر ملک، پھول۔ ریاض احمد قادری، سید عرفان شاہ، پروفیسر ظریف خان کی شاعری دل کو بھاتی ہے--- حنیف گجر، وسیم شہزاد، محمود گیلانی، ابرار گیلانی، توصیف، کامران شہزاد، اکبر بخاری، جنید، بشارت علی، عامر خان کی خدمت میں محبت بھرا سلام!

✿ امان اللہ ناصر، سرگودھا

☆

چندا فیملی کے تمام دوستوں کو السلام علیکم!--- مسٹر خالد انکل اور عصمت ضیاء آنٹی کو میرا عقیدت بھرا آداب--- خان نیازی! آپ کو میری طرف سے سالگرہ کی ڈھیروں مبارکباد، وصول کریں۔ خوشیوں سے بھرا سالگرہ کا یہ دن آپ کی زندگی میں بہار بن کر بار بار آئے--- فرہاد مزل! آپ کو شادی کی ڈھیر ساری مبارکاں۔ عصمت آنٹی! آپ سے میل ملاقات کر کے مجھے دلی تسکین ہوئی تھی--- ثاقب ساحل صدیقی اور مسٹر اکبر بخاری! کیسے مزاج شریف ہیں؟ آپ کے مجھے محبت یاد کرنے کا شکریہ--- حنیف گجر بھائی! آپ کو سالگرہ کی کروڑوں مبارکباد۔ آپ نے یہ سالگرہ اپنے دوسرے دوستوں کی طرح منائی اور ہم دوستوں کی خوشیاں اپنے دل کی ڈائری میں لکھ کر ہم دوستوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے دل کے میخانے میں قید کر لیا--- زاہد حسین زاہد! آپ کے گھر ڈاکا پڑنے پر جو بھی مالی نقصان ہوا تھا، وہ جلد پورا ہو جائے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں--- وسیم شہزاد! کہاں غائب ہیں، کہیں غائب فلم تو نہیں دیکھ لی تھی جو آپ بھی غائب ہو گئے؟ میں آپ کو SMS کرتا ہوں مگر آپ کا Reply ہی نہیں آتا۔ کیوں، خیر تو ہے نا؟--- ماڈرن مولوی! آپ کی طبیعت کیسی ہے، اور آپ ٹی وی مانگ کر مہنگائی کی چڑیل بھگا نہیں سکتے؟--- ٹارزن 421! آپ کے کیا حال احوال ہیں؟--- ایف کے شگفتہ! آپ کا جون کا سندیسہ جتنا چھوٹا تھا، اُتنا ہی دلچسپ تھا--- پروفیسر ایم ظریف خان جی! تسلیم و آداب کے بعد آپ کی خیریت مطلوب ہے؟--- سید بدر سعید بھائی! آپ کو عطاء الحق قاسمی صاحب کی ادبی تنظیم اعتراف کے سیکرٹری نشر و اطلاعات مقرر ہونے پر اور دوسرے آپ کو بطور ڈائریکٹر پروڈیوسر اپنے پہلے نیشنل سیونگ پر سلام پاکستان یوتھ ایوارڈ دیئے جانے پر میری طرف سے ڈھیروں مبارکباد وصول کریں--- 20 تاریخ تک میں نے چاند (کھڑکی والا نہیں) کا انتظار کیا۔ جب وہ نہیں آیا تو میں نے لاہور کے ہر بک سٹال سے اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے معلوم کروایا۔ اسی طرح 21 واں دن بھی گزر گیا۔ بہر حال، جب چاند نہ ملا تو مجھے اتنا ہی رنج ہوا جتنا رنج TV کے سپر اسٹار سے بچھڑنے کا ہوا۔ یعنی زندگی بھر جس کے تصور سے مسکراہٹیں اور ہنسی وابستہ رہی، وہ اب ہم میں موجود نہیں رہا مگر جب بھی اس ذکر اس کے چاہنے والوں کے لبوں پر آئے گا تو ان کو افسردہ کر جائے گا۔ اللہ معین اختر کی مغفرت فرمائے--- ایس ایچ ساگر! آپ نے مجھ سے عرصہ پہلے فون پر 27 منٹ تک بہت سی باتیں کہیں اور اسی دوران آپ نے اپنی شاعری کی کتاب لکھنے کا ذکر بھی کیا تھا۔ میری دعا ہے کہ وہ جلد ہی منظر عام پر آ جائے--- میری بڑی بھابی کا انتقال کچھ عرصہ پہلے ہو گیا تھا۔ اب دوستوں سے دُعائے مغفرت کی اپیل ہے--- مسٹر ڈبکلاں بھائی! آپ کو بھی میرے قلبی سلام کے ساتھ راولپنڈی باغ اور آزاد کشمیر کے سب ہی ساتھیوں کو خلوص محبت--- فیضان! آپ کے ساتھ مسٹر ڈبکلاں کا بھی شکریہ ادا کروں گا کیونکہ آپ نے اس بندے ناچیز کا ذکر سیّد نجم صاحب سے اور وہ بھی شیریں لفظوں کے ساتھ کیا--- سید ابرار بخاری جی! آپ کا موبائل چھن جانا کوئی چھوٹی بات نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کا کوئی اور نقصان نہیں ہوا۔ آپ کی قسط وار تحریر "نیکی کر مری کو جا" اچھی لگی تھی--- عطاء الحق قاسمی کی "رب کا شکریہ ادا کر بھائی" تحریر ہلکی پھلکی تھی--- عادل گلزار! کی حال نے تاڈے؟ کدی سانو وی اپنے سندیسے وچ یاد کر لیا کرو، جی--- تنویر پھول! آپ کی شاعری نے تو مچھر مار دیئے، ڈینگی کے علاوہ--- صابر مغل بھائی! آپ اپنی بزی زندگی میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر دوستوں کو MSG کے ذریعے یاد ہی کر لیا کریں--- قاسم تنویر اعوان! آپ کے سندیسے میں جگہ جگہ میں آپ کا آوارہ مزاج نظر آیا--- نازیہ ناز نازی! آپ ہو گئی ہو بوڑھی گھوڑی لال لگام اور پھر بھی لے آئی ہو انگلینڈ سے Casmetics کا سامان--- جبران انصاری بھائی! السلام علیکم۔ آپ کی جو بھی ٹینشن ہے، اللہ اسے دور فرمائے--- گنڈا ابرار خان! آپ چاند سے دور ضرور ہو سکتے ہیں مگر چاند کی چاندنی سے بچ نہیں سکتے--- صفدر زخمی! شادی کا زخم کھانے کے بعد ہر شوہر یہ ہی کہتا نظر آتا ہے کہ مجھے میری بیوی سے بچاؤ--- عدنان رفیق جاذب! آپ کو سالگرہ کی ڈھیروں مبارکباد--- مسٹر فراڈیا! اپنے سندیسے میں میرا ذکر خاص کرنے کا شکریہ قبول کریں--- عمران ہاشمی بھائی! السلام علیکم۔ چاند کی کاکیوں سے ڈر کر کیا آپ نے بھی ایاز کی طرح سندیسے لکھنے چھوڑ دیئے؟--- دیا علی اور دعا علی! آپ کا کالم "نام میں کیا رکھا ہے" تحریر اچھی تھی--- عبدالقیوم! سر، آپ جس دن لاہور آئے تھے، اس دن میں کزن کے گھر گیا تھا اس لئے آپ سے شرف ملاقات نہ حاصل کر سکا--- محمد سعید خان! اللہ آپ کو صحت و تندرستی سے نوازتا رہے--- محمد کامران شہزاد! آپ نے مجھے میری بڑی بھابی کی وفات پر MSG کیا، اس کا شکریہ--- میں سندیسوں کی محفل سے بظاہر دور تو ضرور تھا مگر چاند پڑھ کر تحریر پر میری نظر رہی اور ان تحریروں میں سے مجھے "نظام سقہ، پہلا مدرسہ، مرزا غالب ان ٹربل)، شگوفے، مسٹر گونگلو" نے بہت متاثر کیا--- عصمت آنٹی اینڈ خالد انکل! آپ کو خلوص دل سے آداب و تسلیمات۔ خیریت کا طالب ہوں۔ اللہ آپ کو اور اس ملک کو اپنے ایمان میں رکھے، آمین!--- عدنان رفیق جاذب! آپ کی بہن کی فوتگی کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے--- مہک خان! آپ نے میٹرک میں 2nd پوزیشن لے کر اپنا اور اپنے ضلع کا نام روشن کیا۔ اس پر آپ کو میری طرف سے ڈھیروں ٹوکرے مبارکباد کے قبول کیجئے--- یہ تو ہوئی کچھ باتیں گزرے وقت کی۔ اب آتے ہیں فروری اور مارچ کے چاند کی کہانیوں کی طرف۔ جن کہانیوں نے آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے رکھی، وہ یہ تھیں۔ "لوڈشیڈنگ کے فوائد)، جوانی کے روگ، ماڈرن ہیر رانجھا، سرکاری رشتے، ساتویں ملک، بٹ صاحب فلم اور ہم، کنواریوں کی دُنیا، ہوم سویٹ ہوم" محمد ایوب! آپ کو سندیسے کی خوشیوں بھری اور پُر رونق دُنیا میں خوش آمدید--- سید ابرار الحسن! کہاں غائب تھے آپ چاند کی کاکیوں سے ڈر کر؟--- تنویر پھول! آپ کو میرا قلبی سلام--- سید ممتاز علی بخاری! السلام علیکم۔ آپ کا کیا حال ہے؟--- 8 مارچ کی صبح میری چاچی کی وفات پر جن دوستوں نے دعائے مغفرت کی، ان سب دوستوں کا شکر گزار ہوں--- ایس ایس گیلانی بھائی! آپ کے میسج تو شاید میرے سیل کا نمبر ہی بھول گئے ہیں--- اب آخر میں ان تمام دوستوں کا شکریہ جن کا نام نا لکھ سکا۔ چاند کے تمام دوست اپنی نیک دعاؤں میں مجھے یاد رکھیئے۔

✿ سید مبشر حسین شاہ، لاہور

سیل نمبر: 0333-4565897

"چپ ہو جاؤ' جانو! ورنہ میں بھی رو پڑوں گا---" وہ اُس کی حسین زلفوں میں ٹہلتی جوؤں اور لیکھوں کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "میں کوشش کروں گا۔"

"کوشش کے بچے! میں جانتی ہوں تمہاری کوششوں کو---" دُردانہ نے کسی خونخوار شیرنی کی طرح بپھر کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "جھوٹے' فریبی' مکار' دغاباز! مہینوں پر مہینے بیت گئے ہیں تمہاری جھوٹی تسلیاں سنتے سنتے۔ کان کھول کر سن لو' اگر تم نے اب بھی کچھ نہ کیا تو میں وہ سارے خطوط اپنی ماں کے حوالے کر دوں گی جو تم نے مجھ معصوم اور بھولی بھالی دوشیزہ کو بہلانے' پھسلانے اور ورغلانے کے لئے لکھے تھے۔"

فہد کا دل اُچھل کر اس کے ٹخنوں میں جا پڑا۔ اسے چکر آ گئے' اسے پوری کائنات گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"خدا کے لئے یہ غضب مت ڈھانا---" اُس نے دُردانہ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے منت کی۔ "تمہاری ماں تو محلے بھر میں جارج بش کے نام سے مشہور ہے' اس کے کانوں میں ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو وہ میرے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گی۔"

فہد کے لئے عجیب سچوایشن پیدا ہو گئی تھی۔ ایک طرف اسے بابا خیر دین بلیک میل کر رہا تھا اور اب دُردانہ نے بھی اُلٹی میٹم دے دیا تھا۔ اگر وہ دُردانہ کو پا لیتا تو بابا خیر دین کی بلیک میلنگ' دُردانہ کی دھمکیوں بلکہ ہر طرح کے مصائب و آلام سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔ لیکن اسے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ ماں سے حمایت کی توقع تھی مگر ماں سے بھی بات بے سود ثابت ہوئی تھی۔

اب تو دُردانہ نے بھی اس سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ وہ اس کے گھر اور کالج کے چکر لگاتا رہ جاتا۔ کبھی کبھار سامنا ہو بھی جاتا تھا۔ وہ اُسے ٹھینگا دکھاتی' منہ چڑاتی اور رُخ پھیر لیتی تھی۔ فہد غصے میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا تھا۔ اسے اس بیل کا منڈھے چڑھنا بہت مشکل لگنے لگا تھا--- بہت سوچ و بچار کے بعد اسے اپنے محلے کی مسجد کے پیش امام مولوی حاجی عبدالستار کا خیال آ گیا۔ وہ نہایت مخلص اور دین دار انسان تھے۔ عرصہ بیس سال سے وہاں امامت کے فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ فہد نے بچپن میں قرآن پاک بھی ان سے پڑھا تھا۔ اب بھی دینی معاملے میں اسے کوئی اُلجھن پیش آتی تھی تو وہ ان سے ہی رجوع کیا کرتا تھا۔

فہد نے عشاء کی نماز مسجد میں ادا کی۔ تمام نمازی ایک ایک کر کے چلے گئے۔ مولوی صاحب جائے نماز پر بیٹھے اوراد و وظائف میں

ٹنڈ

چمکدار' لشکارے دار اور صاف شفاف چمکیلی سرزمینِ سر کو عام زبان میں ٹنڈ کہا جاتا ہے جبکہ زبانِ خاص میں اِس کو کونی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب گرمی کی آمد آمد ہو اور ہر طرف ہو کا عالم ہو یا سر میں جوؤں کا بسیرا ہو تو مرد حضرات ٹنڈ کروا لیتے ہیں۔ ٹنڈ منڈ کا لفظ بھی اِسی ٹنڈ کی پیداوار ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی سبز رنگ کی گول گول لشکارے دار سبزی جب اِس دُنیا میں آئی تو اِس کا نام رکھنے میں بڑی مشکل درپیش ہوئی لیکن اِس ٹنڈ نے مشکل دُور کر دی اور آج کل اِسی سبزی کو ٹینڈوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِسی ٹنڈ کی وجہ سے اکثر لوگ دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک دفعہ ایک آدمی کا گدھا مر گیا۔ اُس گدھے کا نام سوہنل تھا۔ اِس وقت کے لوگوں میں رواج تھا کہ جس شخص کا کوئی عزیز مر جاتا' وہ اُس کے سوگ میں ٹنڈ کروا لیتا۔ جب سوہنل مرا تو اِس کی برادری اور عزیز و اقربا نے ٹنڈیں کروا لیں۔ ایک دِن اِس شخص کا دوست ملنے آیا اور ٹنڈ دیکھ کر سوچا کہ ضرور اِس کا کوئی عزیز مر گیا ہے۔ پھر اِس نے بھی ٹنڈ کروا دی اور اپنے دوست کے غم میں برابر کا شریک ہو گیا۔ ایک دِن اِس شخص کے دوست کا دوست اپنے دوست سے ملنے آیا اور ٹنڈ دیکھ کر سوچا کہ ضرور اِس کا کوئی عزیز مر گیا ہے' پھر اِس نے بھی ٹنڈ کروا دی اور اپنے دوست کے غم میں برابر کا شریک ہو گیا۔ بادشاہ کا وزیر اِس شخص کے دوست کے دوست کا دوست تھا' اِس نے جب اپنے دوست کی ٹنڈ دیکھی تو اپنی بھی کروا دی اور یوں وہ اپنے دوست کے غم میں شریک ہو گیا۔ بادشاہ نے جب اپنے وزیر کی ٹنڈ دیکھی تو سوچا ضرور اِس کا کوئی عزیز مر گیا ہے۔ پھر کیا تھا' بادشاہ نے ٹنڈ کروائی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری رعایا بھی ٹنڈیں کروا کر سوگ میں شریک ہو گئی۔ جب بادشاہ نے پورے ملک میں ٹنڈیں ہی ٹنڈیں دیکھیں تو سوچا وہ کون سی ایسی ہستی ہے جس کے مرنے پر پورا ملک سوگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ بادشاہ نے وزیر سے' وزیر نے اپنے دوست سے' اِس دوست نے اپنے دوست سے اور اُس دوست نے اِس شخص سے پوچھا کہ کون مرا ہے؟ وہ شخص زور زور سے رونے لگا اور کہنے لگا کہ میرا گدھا سوہنل مر گیا ہے۔

ٹنڈ کروانے کے فائدے:

☆ ٹنڈ کروانے سے جوؤں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔
☆ ٹنڈ کروانے سے سر پر کنگھی نہیں کرنی پڑتی۔
☆ ٹنڈ کروانے سے اُردو لغت میں اضافہ ہوتا ہے اور بڑے نئے نئے نام سننے کو ملتے ہیں۔

ٹنڈ کروانے کے لئے ضروری شرائط:

☆ اگر کسی کاکے نے ٹنڈ کروانی ہو تو مندرجہ ذیل باتوں کو مدِنظر رکھنا ہوگا۔
☆ اکیلے ہی حجام کے پاس جائیں۔ اگر ہو سکے تو لوگوں سے چھپ چھپا کر جائیں تاکہ لوگوں کے کسی بھی قسم کے ردِعمل سے بچا جا سکے۔
☆ اگر حجام کے پاس جانے سے شرم آتی ہے تو اپنا سر چولہے میں جھونک دیں' ٹنڈ بھی مفت اور پیسوں کی بھی بچت۔
☆ حجام کے سامنے بالکل الرٹ ہو کر بیٹھیں' کہیں آپ کی عقل پر اُسترا نہ پھر جائے۔
☆ ٹنڈ کروانے کے بعد شیشہ دیکھنا نہ بھولئے۔
☆ اگر ہو سکے تو ٹنڈ کروانے کے بعد سر پر راکھ مل لیں' اِس سے آپ کی خوبصورتی میں اضافہ ہوگا۔

اِس سے پہلے کہ چاند کے سارے کاکے ٹنڈیں کروا کر میدان میں آ جائیں' مَیں چلتی ہوں۔

صبحِ نور ریاضی' لاہور